

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

NOVEMBER 2010

خواتین کا جیسٹ

عید تیرا





263 خالہ جیلانی آپ کی بیاض سے

288 نفسیاتی ادویاتی تجویزیں عدنان

290 بیوی بکس کے مشورے امت الصبور

259 شگفتہ جاہ ساجدہ رونی

283 غزل ٹوکاں سائو علامہ نبی

276 ادارہ

278 سارہ رحمان

280 خالہ جیلانی

زنگانہ سلسلہ
روشن حشر
خبریں و برس
باتیں تھانوی کی
مہندی کے ڈیزائن

آپ کا باورچی خانہ
موسم کے پکوان

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آدریا ضی نے لیسن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹاؤن، آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com, info@khawateendigest.com

218 بشری سعید
68 نرہیت شبانہ

سہ سال گرہ
خوابوں کے چہرے

163 رخسانہ نگار
156 عنیقہ مجید
251 عفت سحر
86 نظارت نھر
61 ردا فاطمہ

ایلی کا پیڑ
قرآنی
شہزادہ
موم کی گڑیا
عید کا بکرا

257 احمد عتیق تاجی
257 غلام محمد صر
258 علی اکبر عباس

غزل
غزل
حکیت

زنگانہ سلسلہ

پاکستان (ساٹھ) 500 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 5000 روپے

نومبر 2010

جلد 38 شمارہ 7
قیمت 40 روپے

14 مدیر
267 نادرہ خاتون
15 ادارہ

کہنی سنٹی
ہماری نام
کرن کرن روشنی

20 اینٹارپی

265 حبیب

22 شاہین رشید

28 ادارہ

36 رفعت ناہید

198 رخسانہ نگار

168 نعیمہ ناز

92 نایاب جیلانی

دعاؤں کے حصار
زرد پتوں کا شجر

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں، مضمون، شعاع اور مضمون کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقس بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی دیگر اشاعت کے لیے اجازت لینی ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اپنے مذہب اور اپنی تاریخ کے یادگار دن ہر قوم کے اجتماعی تہوار ہوتے ہیں جن میں قوم کے سب افراد مل جل کر خوشیاں مناتے ہیں۔ اسلام نے جس خاص دن کی یاد منانے کا حکم دیا۔ اس میں ایک بندے کا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنی قیمتی ترین شے قربان کر دینے کا جذبہ نظر آتا ہے۔

عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تہوار قربانی کے اس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا اشارہ پا کر اپنے جوان بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے اور بیٹے نے فرما دیا کہ میں خود کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی کلماعت کا یہ جذبہ اتنا پسند آیا کہ رقی دنیا تک کی نسلوں کے لیے ایک مستقل سنت بنا دیا۔ اخلاص پر زندگی کی شرط اولین ہے۔ ایسا روقربانی کے جذبے سے زندگی سورتی ہے اور اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر مخلص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیے گئے عمل ہی بارگاہ الہی میں مقبول مہرتے ہیں۔ قربانی کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے دوسرے اعمال کی طرح اخلاص و نیت سے مشروط کر دیا ہے۔

قاری محمد امجدی کی دلی مبارک بلوا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص و نیت کے ساتھ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سفال گرام

شرعی معیار کا ناول "رقص جنوں" ہمارے قارئین اب تک بھلا نہیں بلکہ ایک طویل وقیع کے بعد "سفال گرام" لے کر آئی ہیں۔ جدید ترقی یافتہ دور نے جہاں بے پناہ آسائیاں پیش کی ہیں، وہاں ذہنوں کو ایک ناقابل بیان اذیت اور تشکیش میں بھی مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک ہی مٹی سے تخلیق شدہ انسان ماحول، معاشرے، وقت، حالات اور نصیب کے چاک پر کیا کیا مشکلیں اختیار کرتا ہے اور کن باحقوں میں استعمال ہو کر دوبارہ مٹی کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی ایسے ہی جیسے جاگتے انسانوں کی کہانی ہے جو اپنے خوابوں اور سرالوں کا پیچھا کرتے وقت کی نذر ہوئے۔ غیر روایتی کرداروں کی یہ کہانی خاص نوعیت کی متقاضی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین ایک طویل عرصے تک اسے قلمروں زگر پائیں گے۔

اسٹل شمارے میں،

- نغمہ ناز کا مکمل ناول - دماغوں کے حصار میں،
- نایاب جیسلائی کا مکمل ناول - زرد پتوں کا بھر،
- نرہیت شبنم جید اور بشری سعید کے ناولٹ،
- عفت سحر پاشا، رضوان نگار عدنان، مدد فاطمہ، عتیقہ محمدیگ اور نظارت نعر کے اضافے،
- رفعت ناہید سجاد اور رضوان نگار عدنان کے ناول،
- مشہور اسکین اپیشنلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر سے ملاقات،
- بائیں کتابوں کی - سنی کتابوں پر تبصرہ،
- کرن کرن روشنی، نضیاتی اذدواجی الجینس اور دیگر دلچسپاں شامل ہیں۔
- آپ کی رائے ہم - آپ کے خطوط اور ای میلز سے ہی جان سکتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو کیا لگے؟ اپنی رائے ضرور لکھیں گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لامحدود عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔ پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چند مشہور کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سن آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن کوشی

آداب

قرض اچھے طریقے سے ادا کرنا
جس سے۔ اچھے طریقے سے ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادائیگی کی جائے۔
جیسی چیز ہو اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے، لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت برا گناہ ہے۔

دعا

قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعائیں دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائیگی میں شامل ہے۔
قرض خواہ کو (خت بات کہنے کا حق ہے)
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض واپس مانگنے آیا، یا کسی اور مالی حق کا مطالبہ کرنے آیا۔ اس نے کچھ (نامناسب) الفاظ کہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی تادیب کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تیرے گھریار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ اوجار کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔"
فوائد و مسائل : ضرورت کے وقت قرض لینا

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”رک جاؤ قرض والے کو اسے ساتھی (مقروض) پر اختیار ہوتا ہے جب تک وہ ادا ہو نہ کرے۔“

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک بدو (اعرابی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے کسی قرض کا تقاضا کرنے آیا جو آپ کے ذمے تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت لہجے میں بات کی، حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا۔ اگر آپ ادا نہیں کریں گے تو میں آپ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کروں گا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ تجھ پر افسوس! کیا تجھے معلوم نہیں تو کس سے مخاطب ہے؟ اس نے کہا میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم نے حق والے کا ساتھ کیوں نہ دیا؟“ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا۔

”اگر تمہارے پاس کچھ عورتیں ہیں تو ہمیں قرض دے دو، ہماری کھجوریں آئیں گی تو ہم تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”میرے ہاں پاپ آپ پر قربان، اے اللہ کے رسول! میں حکم کی تعمیل کروں گی۔“ انہوں نے آپ کو (کھجوریں) قرض دے دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کا قرض ادا کیا اور اسے کھانا کھلایا۔

اس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے پورا حق دے دیا اللہ آپ کو پورا دے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ایسے لوگ بہتر ہیں۔ وہ قوم پاک نہیں ہوتی جس میں کمزور کو پریشان کیے بغیر اس کا حق نہ دیا جائے۔“

فوائد و مسائل : قرض خواہ کو سختی کا حق حاصل ہے، لیکن افضل یہی ہے کہ تقاضا کرنے میں بھی نرمی

کی جائے اور مقروض کو مناسب مہلت دے دی جائے۔

جاہلوں کے غلط رویے کا جواب سختی سے نہ دیا جائے بلکہ برداشت کیا جائے۔

حق دار کو اس کا حق اور قرض خواہ کو اس کا قرض بن مانگے ادا کرنا چاہیے۔ یہ انتظار نہ کیا جائے کہ وہ جب مانگے گا تب دے دیں گے۔

قرض (کی عدم ادائیگی) کی وجہ سے قید کرنا اور ساتھ رہنا

حضرت عمرو بن شریہ رحمۃ اللہ اپنے والد (حضرت شریہ ثقفی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ادائیگی کی طاقت رکھنے والا ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی کرنا اور اسے سزا دینا جائز ہو جاتا ہے۔“ (امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ کے استاد) علی بن محمد طنا فی رحمۃ اللہ نے فرمایا۔

بے عزتی کرنے سے مراد اس کی شکایت کرنا اور سزا سے مراد قید کرنا ہے۔

فوائد و مسائل : قرض بروقت ادا کرنا ضروری ہے۔ معقول عذر کے بغیر تاخیر جائز نہیں۔

اگر مقروض وقت پر قرض ادا نہ کرے تو اس کے خلاف حکمران یا قاضی سے شکایت کی جاسکتی ہے۔ حاکم اور قاضی کا فرض ہے کہ حق دار کو اس کا حق دلاو۔

اگر مقروض واقعی قرض ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے مزید مہلت دی جائے یا قرض معاف کر دیا جائے یا بیت المال سے اس کی مدد کی جائے۔ بیت المال کا نظام موجود نہ ہونے کی صورت میں دوسرے لوگوں کا فرض ہے کہ زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے سے اس کی مدد کریں۔

جن جرائم میں حد نہیں ان میں مجرم کو تعزیر کے طور پر قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

مقروض

حضرت ہر اس بن حبیب رحمۃ اللہ اپنے والد (حضرت حبیب بن ثعلبہ) سے اور وہ ہر اس کے دادا (حضرت ثعلبہ تمیمی غزیری رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا۔ میں اپنے ایک مقروض کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا۔

” (یہ جہاں جائے) اس کے ساتھ رہو۔“ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت میرے پاس سے گزرے تو فرمایا ”اے بنی تمیم کے بھائی! تمہارے قیدی کا کیا بنا؟“

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے مسجد میں حضرت عبداللہ بن ابو حدرد رضی اللہ عنہ سے ان کے ذمے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا۔ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں مہنتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر میں ان کی آوازیں سن لیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو آواز دی کہ انہوں نے کہا۔

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے قرض میں سے اتنا معاف کر دو۔“ اور ہاتھ سے نصف کا اشارہ کیا (تو ہا قرض چھوڑ دو)

انہوں نے کہا ”میں نے معاف کیا۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا ”اے انھو اس کا قرض ادا کرو۔“

فوائد و مسائل : قرض خواہ مقروض سے قرض کی واپسی کا تقاضا کر سکتا ہے۔

دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو صلہ کرا دینی چاہیے، خاص طور پر وہ شخص جس کو جھگڑنے والوں پر کسی قسم کی نفیحات حاصل ہو، اس کی بات مانی جاتی ہو تو اس کے لیے ضروری ہے۔ جھگڑا ختم کرائے۔

صلح کے لیے صاحب حق اپنا کچھ حق چھوڑ دے تو بہت ثواب کی بات ہے۔

قرض دینا

حضرت قیس بن روی رحمۃ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ حضرت سلیمان بن اوفان رحمۃ اللہ نے حضرت علقمہ رحمۃ اللہ کو ان کا وظیفہ (تنخواہ) ملنے تک کی مدت کے لیے ایک ہزار درہم قرض دیا۔ جب انہیں وظیفہ ملا تو انہوں (سلیمان) نے ان سے سختی سے (قرض کی واپسی کا) تقاضا کیا۔

علقمہ رحمۃ اللہ نے ادائیگی کر دی لیکن انہیں ناراضی محسوس ہوئی (کہ اتنی سختی سے تقاضا کیا ہے) چند ماہ بھر کر وہ (پھر) ان کے پاس آئے اور کہا۔

”مجھے تنخواہ ملنے تک ایک ہزار درہم قرض دے دیں۔“ انہوں نے کہا۔

”ہاں (میں بڑی خوشی سے آپ کا) احترام کرتے ہوئے (آپ کو قرض دیتا ہوں) پھر اپنی بیوی سے کہا (اے ام عتبہ! تمہارے پاس جو مہر منہ بھی ہے وہ لے آؤ وہ لے آئیں تو) (علقمہ سے) کہا کہ تمہارے لہجے! یہ آپ کے وہی درہم ہیں جو آپ نے مجھے ادا کیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی ادا کر دیا نہیں کیا۔“

علقمہ رحمۃ اللہ نے کہا۔ ”کیا خوب! آپ نے مجھ سے جو سلوک کیا اس کی کیا وجہ؟“

انہوں نے کہا۔ (اس کی وجہ وہ حدیث تھی) جو میں نے آپ سے سنی۔ انہوں نے کہا۔ آپ نے مجھ سے کون سی حدیث سنی؟ سلیمان نے کہا۔ میں نے آپ (علقمہ) کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو مسلمان دوسرے مسلمان کو دوبارہ قرض دیتا ہے، وہ ایک بار اتنا صدقہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے۔“ علقمہ رحمۃ اللہ نے فرمایا مجھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (واقعی) اسی طرح حدیث

پیٹ کے درد میں

انشائی

اخبار جہاں میں ایک مراسلہ دیکھا کہ وطن عزیز میں ایک سرجن نے ایک مریض کا آپریشن کیا اور وہ صاحبِ تندرست ہو کر ٹانگے لگوا کر گھر چلے گئے۔ لیکن ٹھوڑی دنوں بعد پیٹ میں درد کی شکایت شروع کر دی۔ عزیزوں نے سوڈا واٹر پلویا۔ چورن کھلویا۔ جلاب دیا لیکن شکایت رفع نہ ہوئی اسی عطار سے یعنی اسی ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے کہا۔

”بابا میرا کام آپریشن کرنا ہے۔ پیٹ کا درد دور کرنا نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے مریض کو وہم ہے اور اس کا علاج جدید و اکثری میں کیا، قدیم طب تک میں نہیں ہے۔ اس کے آگے حکیم لقمان تک جو زمانہ و مردانہ چچیدہ و غیر چچیدہ، بنیدہ و غیر بنیدہ، دیرینہ و غیر دیرینہ امراض کے مریضوں کا آخری سہارا تھے۔ لاچار تھے۔“

عزیزوں کے پرزور اصرار پر ایکسے کرایا گیا تو آنتوں کے درمیان ایک قینچی نظر آئی۔ آپریشن کرنے والے ڈاکٹر نے کہا۔

”بابا یہ بھی تمہارا واہمہ ہے۔ پیٹ کے اندر بعض ہڈیاں قینچی کی شکل کی ہوتی ہیں۔“

لیکن آج کل زمانہ ایسا آن لگا ہے کہ لوگ ڈاکٹری زبان کا کم ایسے رے کا زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اپنے فن کے ماہر ہیں۔ جس کی شہادت ان کے مریض دیں گے۔ جن میں سے آدھے اس دنیا میں ہیں، آدھے اس دنیا میں بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

آخر ایک دوسرے سرجن نے آپریشن کیا اور اسے حسن اتفاق کیسے کہ قینچی نکل بھی آئی۔

اتنی سی بات تھی جسے لوگوں نے یعنی مذکورہ مریض کے لواحقین نے جو بصورت دیگر ان کے ہمساندگان کہلاتے افسانہ کر دیا۔ آخر قینچی ہی تو تھی، کلباڑا تو نہیں تھا اور یہ پہلے ڈاکٹر کی دانت اور سیر چستی نہیں تو کیا ہے کہ انہوں نے قینچی کو دیکھ کر کہا۔

”یہ میری نہیں ہے۔ مریض چاہے تو اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔“

اگر بالفرض یہ ان ڈاکٹر صاحب کی تھی بھی تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے مریض کے پیٹ میں اپنی طرف سے کچھ ڈالا ہی کچھ نکالا تو نہیں؟ اگر مریض کے پیٹ میں پہلے سے قینچی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب اسے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لیتے تو والدہ اعتراض کی بات ہوتی۔ مریض کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اسے پیٹ سے بھائے اتنی اچھی چیز مل گئی۔ ہم نے پچھلے دنوں آپریشن کرایا۔ اس میں تو کچھ نہیں نکلا جو ہمارے کلام آسکتا۔ بہر حال یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔

قینچی کے بڑے فائدے ہیں۔ اس سے بال کاٹے جاسکتے ہیں۔ موچیں تراشی جاسکتی ہیں۔ کان کاٹے جاسکتے ہیں۔ ناخن کاٹے جاسکتے ہیں۔ لوگوں کے کپڑے کاٹے جاسکتے ہیں۔ پورے کپڑوں کے علاوہ خالی جیبیں بھی کاٹی جاسکتی ہیں اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کارخانے وغیرہ کے افتتاح کا فائدہ کاٹنے کے لیے بھی قینچی درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کارخانہ نہیں چل سکتا۔ گویا ساری مشینیں ایک طرف اور قینچی ایک طرف۔ انسان کا رشتہ نجات جلد قطع کرنے کے لیے سگرت مجرب اور آزمودہ چیز ہے۔

شاید اسی لیے ایک مشہور سگریٹ کا نام قینچی رکھا گیا۔

آوی تھوڑا سا (زیادہ نہیں) لکھا ہوا ہو تو قینچی کی بدولت نامی گرامی جرنلسٹ بھی بن سکتا ہے۔ جانے والے جانتے ہیں کہ فی زمانہ ایڈیٹریا جرنلسٹ یا کالم نگار بننے کے لیے قلم اتنا کام نہیں آتا جتنی قینچی کالم آتی ہے۔ بعض اخبار تو پورے کے پورے قینچی سے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک بزرگ نے تو اسی حقیقت کے اعتراف میں اپنے اخبار کا نام ہفت روزہ قینچی تجویز کیا تھا۔ حضرت اسلام سلمانی بی اے نے ان کو مبارکباد کا تار بھیجا جس میں اپنے تعاون کا تعین دلایا تو ان کو یہ نام بد لانا پڑا کہ کہیں لوگ اس کو باور برداری کا اخبار نہ سمجھ لیں۔ کیونکہ فی الحال ہمارے معاشرے میں بال کاٹنے والوں کے مقابلے میں بال کٹوانے والوں بلکہ بال نہ کٹوانے والوں کی اکثریت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اپنے سر کے بال کٹوانے سے کتراتے ہیں وہ ہفت روزہ قینچی کی سرپرستی کیوں کرنے لگے۔

قینچی سے اخبار مرتب کرنے میں فائدہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی اور کاتبوں کے ناز نہیں اٹھانے پڑتے۔ تراشہ نیچے رکھا اور اس کی قلم دھائی اور جو زری۔ جو الہ دینے کا ہمارے ملک میں رواج نہیں۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں نوٹہ نہ دینے والوں کو حوالہ پولیس تک کیا جاسکتا ہے۔ بہت مہربانی کی تو مثال کے طور پر خبر یا پیچر کے شروع یا آخر میں بریکٹ میں لکھ دیا۔ (اے ج) یہ انشائی یا اللہ جوایا بھی ہو سکتا ہے جس نے اخبار ذاکے لیے نامہ نگار کے طور پر محنت شاقہ سے خبر حاصل کی یا مضمون پتایا۔ اور تحقیق کریں تو اخبار جنگ بھی جہاں سے وہ تحریر کئی

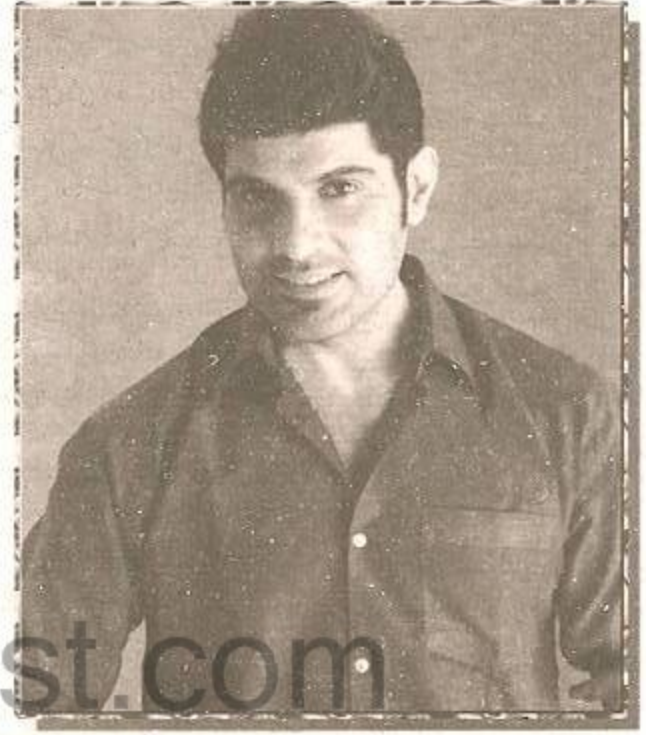
گئی۔ ایسا بھی ہوا کہ کہیں سے کوئی غزل تراشی گئی تو شاعر کا نام کٹ کر اصل اخبار یا رسالے ہی میں رہ گیا

اور ایڈیٹر کو ازراہ ایثار اس پر اپنا نام دینا پڑا۔ بقول شخصے نام میں کیا دھرا ہے۔ لوگوں کو تو شعر پڑھنے سے یعنی آم کھانے سے مطلب ہے یہ کون گنتا ہے؟

اس معاملے کا ایک قانونی پہلو بھی ہے۔ اس مریض سے دریافت کرنا چاہیے کہ اس نے اتنے دن یہ قینچی کیوں اپنے پیٹ میں چھپائے رکھی؟ یہ اسپتال کی جائیداد تھی۔ مریض کے باوا کا مال نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کسی نرس کو اپنے ناخن کاٹنے ہوں، بھوس تراشی اور چتون خیکھی کرنی ہو، کسی ڈاکٹر کو اخبار سے معہ کاٹنا ہو کہ آپریشن بھی کرتے جائیں دل بسلانے کے لیے غور و فکر بھی کرتے جائیں کہ ذیل کے فقرے میں

اکسے کے زمانے میں۔۔۔ اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ خالی جگہ میں لفظ ”شیر“ رکھنا زیادہ مناسب ہو گا یا ”بھیر“ زیادہ موزوں رہے گا۔ جو محاورے سے دور لیکن عقل کے زیادہ قریب ہے۔ بہر حال اس مریض کے خلاف رچ کر کتنا چاہیے اور اسی قینچی سے کتنا چاہیے تاکہ آئندہ کوئی مریض، چھری، چاقو، قینچی، بستر کی چادر، تکیہ، ڈاکٹر صاحب کی عینک، اسٹیک پوپ، نرس کی نیل پالش یا اپ اسٹک وارڈ بوائے کی سوار کی ڈبیہ یا فلمی گانوں کی کاپی اٹھا کر پیٹ میں نہ رکھ لے۔ آج کل کے مریضوں کا کچھ اعتبار نہیں۔ ایک مریض کے پیٹ میں سے تو آپریشن کرنے پر واڈھی گئی۔ تحقیق یہ معلوم ہوا کہ ان کی اپنی نہیں تھی۔ اس ڈاکٹر کی بھی جنہوں نے کہیں پہلے ان کا آپریشن کیا تھا۔ بے چارے بہت دنوں لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے رہے جب تک کہ نئی واڈھی نہیں آگئی۔





اسکن اسپیشلسٹ

ڈاکٹر خرم مشیر سے ملاقات

شاہین رشید

ڈاکٹر خرم مشیر ہسپتال راجی سے ہے۔ یہ 21 مئی 1979ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ وہ ہنوں کے اکلوتے بھائی ہیں ڈاکٹر خرم نے میٹرک میڈیکل اسکول سے انٹر آرم جی سائنس کالج سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر میڈیکل کالج سے D'Dem ویلز یو کے سے اور ایم ایس سی ویلز یو کے سے کیا۔ ڈاکٹر خرم کے والد مشیر حسن نقوی پاکستان ایر فورس میں ونگ کمانڈر رہ چکے ہیں۔ ان کی والدہ نجمہ مشیر کا تعلق ایجوکیشن سے ہے۔ ڈاکٹر خرم کے نانا معروف ”بس جی اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ“

Educationist حسن عادل تھے جنہوں نے جناح کالج اور میڈیکل کالج بنایا جو کہ بھٹو دور میں سرکاری تحویل میں لے لیے گئے۔ تب انہوں نے گلشن اقبال میں میڈیکل ہائی اسکول تعمیر کیا جس کو ان کی بیٹی نجمہ مشیر یعنی ڈاکٹر خرم کی والدہ چلاتی ہیں۔ ڈاکٹر خرم کی پرورش ان کے نانا نانی نے کی۔ ڈاکٹر خرم مشیر کنسلٹنٹ ڈرامالوجسٹ بالوں اور نائٹوں کی بیماریوں کے ماہر ہیں۔

”کیسے ہیں ڈاکٹر خرم مشیر اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

”بس جی اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ“

روزانہ ایک یا دو چیمپلز یہ جانا ہوتا ہے پروگرام کر کے آتا ہوں تو جم جاتا ہوں پھر کھینک جہاں سویا ڈیڑھ سو مریض میرے منتظر ہوتے ہیں کبھی کبھار کسی کمرشل کی آفر آجاتی ہے تو وہ بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”کبھی کبھار منکر مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے کہ لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو شفا دیتا ہے۔ تب ہی تو لوگ میرے پاس آتے ہیں مجھے تو لوگوں کی دعا میں لگی ہیں کہ جس کی وجہ سے اللہ نے میرے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ لوگ جب حج عمرہ پہ جاتے ہیں تو خاص طور پر مجھے آکر بتاتے ہیں کہ ہم نے آپ کی درازی عمر کی دعا میں مانگی تھیں۔“

”اتنی کمی عمری میں اتنی شہرت اور شفا... کیا ایسا سوچا تھا آپ نے؟“

”نہیں کبھی نہیں“ میں خود بہت حیران ہوتا ہوں اور میرے نیچرل اور ڈاکٹر میڈیکل کے ساتھی خود بہت حیران ہوتے ہیں میری ترقی دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑا ہے وہ نہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ آپ یقین کریں کہ مجھ سے سینئر ڈاکٹروں کے پاس اتنے مریض نہیں آتے جتنے کہ میرے پاس آتے ہیں جبکہ مجھے پاکستان میں پریکٹس کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔“

”آپ کے والد کا تعلق ایر فورس سے اور والدہ کا تعلق ایجوکیشن سے آپ بن گئے ڈاکٹر۔ آپ کا دل نہیں چاہا ایر فورس میں جانے کو؟“

”بہت دل چاہتا تھا کہ ایر فورس میں جاؤں فلائنگ کریوں سب کا خیال بھی یہی تھا کہ والد کے نقش قدم پر چلے گا اور ایر فورس میں ہی جائے گا۔ لیکن اتفاق کہہ لیں بہت مدت سے یہ میرا شوق تھا کہ جب انسان بنیادی شریعت کرتا ہے تو اس کو جو فیملی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے پھر وہ اسی میں جانے کے چکر میں لگ جاتا ہے جس کو جب داخلوں کا وقت آیا یہ چوڑا کس کی کہ کیا کرنا ہے تو میرا انتخاب سائنس تھا پھر والد نے بھی یہ کہا تھا کہ جس فیملی میں بھی جائیں اپنی دلچسپی اور رجحان کے مطابق جائیں کیونکہ زندگی آپ نے گزارنی ہے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ

فیملی ایسی ہو جس سے آپ کو بھی فائدہ ہو اور لوگوں کو بھی۔“

”میڈیکل کی فیملی بہت وسیع ہے لیکن آپ اسکن کی طرف آئے اس کی کیا وجہ ہے؟“

”میں جب ڈاکٹر میڈیکل میں تھا تو میں نے ایک ڈاکٹر شلر اور ایک ڈرامہ میں میں بھی کام کیا تھا تو یہ نہیں کیوں اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کوئی ایسی کربوٹا پ فیملی ہو جو لوگوں کے لیے نئی ہو اور فائدہ مند بھی ہو صرف نزلہ زکام کا ڈاکٹر نہیں ہونا چاہیے اس کا علاج تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔ تو مجھے skin Diseases نے زیادہ متاثر کیا کہ مرد اور خواتین اسکن کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔“

”اسکن پر ابلعز خواتین کو زیادہ ہوتے ہیں یا مرد حضرات کو؟“

”اس میں تو کوئی شک نہیں کہ خواتین کو اسکن کے پر ابلعز زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ مرد کے مقابلے میں خواتین کی جلد تھوڑی حساس ہوتی ہے۔ تھوڑی نازک ہوتی ہے پھر وہ کاسٹیکس کا استعمال بھی زیادہ کرتی ہیں اس سے جلد متاثر ہوتی ہے۔ چولے کا کام زیادہ کرتی ہیں اس کی گرمی سے بھی جلد متاثر ہوتی ہے سب سے بڑی بات یہ کہ مرد حضرات بول کر چچ کر یا کسی بھی طریقے سے اپنے دل کی بات کو باہر نکال لیتے ہیں جبکہ خواتین زیادہ تر باتیں اپنے دل کے اندر رکھتی ہیں۔ پریشانی ہو یا کوئی بھی جذبہ ہو وہ دل کے اندر رکھتی ہیں۔“

”رہنے دیں ڈاکٹر صاحب اہل والی بات خواتین رو کر دل کی بھڑاس نکال لیتی ہیں۔“

”میں آپ کو بتاؤں کہ خواتین اللہ تعالیٰ کی بہت خوب صورت تخلیق ہیں۔ بہت نازک ہوتی ہیں مرد کو اللہ تعالیٰ نے مضبوط بنایا ہے۔ مرد حضرات کا اسٹریسٹ ہو پنا ہے مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ اپنی جلد کا زیادہ خیال بھی نہیں رکھتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہے اب مرد اور عورت ایک ہی لیول پہ آتے جا رہے ہیں۔“

”خواتین اور مرد حضرات میں اسکن کے زیادہ مسائل کیا ہوتے ہیں؟“

”ایک مسئلہ جو دونوں میں کا سن ہے وہ کھل مہاسے ہیں اور خواتین میں جو سب سے زیادہ مسئلہ ہے وہ چھائیاں ہیں

اور ریگنسنسی کے بعد زیادہ ہو جاتی ہیں۔
”مگر عام تصور تو یہ ہے کہ چھائیاں اتنے کے حساب سے
ہوتی ہیں؟“

”یہ بہت اہم سوال کیا آپ نے عام طور پر یہ سمجھا جاتا
ہے کہ شادی کے بعد یا بچے کی پیدائش کے بعد ہی
”چھائیاں“ ہوتی ہیں تو ایسا نہیں ہے بلکہ بہت سی عورتیں
لڑکیوں کو بھی ہو جاتی ہیں اور جب کسی بہت سی عورتیں لڑکی کو
چھائیاں ہوتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ اسے اسے کیوں
چھائیاں ہو گئیں یہ تو شادی شدہ نہیں ہے۔ اگر باڈی میں
آئرن کی کمی پڑے یا ”ہارمونز“ ڈاؤن ہو گئے ہیں تو ایسا
ہوتا ہے اور مردوں کو بھی چھائیاں ہوتی ہیں یہ ٹھیک ہے کہ
بڑی عمر میں یہ مسئلہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ
Complication زیادہ ہو جاتی ہیں تو ”چھائیاں“ بہت
کامن ہیں اور پھر Fungal انفیکشن بہت زیادہ ہیں پھر سو
رائس ”اینگریما“ الرجی یہ امراض بہت زیادہ ہیں۔
”الرجی“ ”اینگریما“ چھائیاں اور فنگل انفیکشن یہ امراض

داغی ہوتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں؟“
”اگر ٹھیک طرح سے ان کا علاج کیا جائے اور اپنی دوا کا
اپنی صحت کا پانی کا کھانے پینے کا، چھٹی آب و ہوا کا خیال
رکھا جائے تو یہ لازمی طور پر کنٹرول میں آجاتے ہیں۔ اب
جیسے موٹاپے تو اس کے لیے آپ ورزش کرنا چھوڑ دیں
گئے۔ اپنی سیدھی چیزیں کھائیں گے۔ چکنائی کا استعمال
بھی زیادہ کریں گے تو موٹاپا تو لازمی آئے گا۔“
”مگر موٹاپے کے لیے تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موروثی
ہوتا ہے Tendency ہوتی ہے؟“

”بالکل Tendency ہوتی ہے مگر اب تو بہت علاج
نکل آئے ہیں آپ کو ڈائٹ چارٹ دیے جاتے ہیں کچھ
دوائیاں دی جاتی ہیں جن کا کوئی سائیڈ ایفیکٹ نہیں ہوتا تو
موٹاپا کنٹرول میں آئے گا۔ اس طرح مرد اور خواتین
میں ”بال جھڑنے“ کا بہت پرابلم ہو گیا ہے اور
ٹرانسپلانٹ سے لوگ بہت گھبراتے ہیں اب ایک بہت
اچھا ٹریٹمنٹ آیا ہے کہ جس سے بال جھڑتے نہیں ہیں۔
اس طرح جلد پر کا استعمال ایٹین جلد کے لیے بہت نقصان دہ
ہے اکثر ڈاکٹر اس کا استعمال کرتے ہیں اس کے بہت مضر
اثرات ہوتے ہیں۔ اس سے اسکن Damage ہو جاتی
ہے اور بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ میں لوگوں کو کہتا ہوں

کہ آپ انٹرنیٹ پر جائیں اور ان کو ویب سائڈ بھی بتاتا
ہوں کہ آپ ”لیزر ان ایٹین ٹیپ“ بڑھائیں آپ کو خود
اندازہ ہو جائے گا کہ اسکن کے لیے لیزر کتنا نقصان دہ ہے۔
لوگ پھر بڑھتے ہیں اور لیزر علاج کرانے سے بچتے ہیں۔“
”ہیر ٹرانس پلانٹ کے لیے مشہور ہے کہ یہ علاج مرد
حضرات کے لیے ہے کیا عورت ہیر ٹرانس پلانٹ نہیں
کرا سکتی؟“

”بالکل کرا سکتی ہیں۔ مگر ان کی تھوڑی سی پری بلنڈز دور
کر دی جائیں تو ان کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔
میں آپ کو بتاؤں کہ دو تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے
بارے میں لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں ان میں ایک
مرض بھلیوری جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ پھللی کھا کر
دودھ پینے سے ہوتا ہے، اس کے مریض اور بالوں سے
متعلق جتنے بھی مریض میرے پاس آئے اللہ کے کرم سے
وہ ٹھیک ہو کر گئے ہیں۔ لوگ بالوں سے ہو چکے تھے کہ یہ مرض
بھی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہو جانا
بڑا کمزور نہیں ہے جیسے بتایا جائے۔ محبت سے اور ان کے
اعتماد کو بحال کر کے بتائیں کہ آپ کا علاج ہو گا اور ان شاء
اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں تو علاج کرانے والے میں بھی
حوصلہ آجاتا ہے۔“

”کتے ہیں کہ اندازہ کھاؤ..... مچھلی کھا کر دودھ نہ پویہ
نقصان دہ ہوتا ہے تو اگر ایسا ہو تا تو بڑی تو روز بیمار ہوتے کہ
ان کی خوراک سی مچھلی ہے اور وہ دودھ بھی پیتے ہیں؟“
”واقعی بڑی تو کھاتے ہی یہ ہیں اور ان کی مٹھنی اچھی
صحت ہوتی ہے ان کے بال کتنے کیے اور کتنے ہوتے ہیں تو
ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا یہ سب غلط خیال ہے۔“

”الرجی کن چیزوں سے ہوتی ہے؟“
”اگر آپ بہت زیادہ مریج سالوں کا استعمال کریں
آپ بہت زیادہ گائے کے گوشت کا استعمال کریں۔ آپ
بہت زیادہ تیزابیت والی چیزیں کھاتے ہیں۔ بہت زیادہ
کھانسی کھائیں..... تو لازمی آپ کو الرجی ہوگی۔ بہت سے
لوگوں کو ڈرائی فروٹ سے الرجی ہو جاتی ہے تو ان سب کا
علاج ہے مگر بہتر ہے کہ ہر چیز کو ایک لمٹ میں استعمال کیا
جائے۔“
”اور یہ جو زبان پہ چھالے نکل آتے ہیں اس کی کیا وجہ
ہوتی ہے؟“

”ڈرائی فروٹ بہت زیادہ تعداد میں کھائے جائیں تو بھی
چھالے نکل آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر آپ میں آئرن
کی کمی ہے۔ یا آپ کو جنس رہتا ہے یا آپ کے
ہیو موگلو بلیں کم ہوں تب بھی چھالے نکل آتے ہیں.....
اس کے علاوہ چھالے مسالے دار پائے کھائے یا ساری ان سب کو
کھانے سے بھی زبان پہ چھالے نکل آتے ہیں زبان کے
چھالے تو بہت بہت زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔“
”وقت سے پہلے چہرے پر جھریاں بھی آجاتی ہیں۔ اس
کی کیا وجہ ہے؟“

”سوچیں، فکرات، ٹینشن الے سیدھے کھانے یہ
سب بھی وقت سے پہلے جھریوں کا باعث بنتے ہیں۔“
”اسکن پر ابلنڈز کی وجہ سے ٹرکیکلکشن پہ بھی
فرق پڑتا ہے؟“

”بہت زیادہ اینگریما ہو یا کوئی اور بیماری ہو تو فرق
پڑتا ہے پھر آپ کو بتاؤں کہ بار بار کا مقدمہ ناؤ سنگھار ہے مگر
ہمارے یہاں ”بشریت“ ایسے پارلز کی ہے جہاں چار پانچ
کریمنس ملا کر ایک کریم دے دیتے ہیں کہ ایسے آپ
لوگ اس آپ کا رنگ گورا ہو جائے گا۔ یہ بالکل غلط ہے کچھ
نہیں ایسا ہوا پھر بہت ساری دوائیاں کھانے کو دے دی
جاتی ہیں۔ لیزر کر دی ہوتی ہیں۔ مگر کچھ فرق نہیں پڑتا
نہ دیکھا ہے کہ سو ڈیڑھ سو کی کریم کو تین تین ہزار میں بیچ
دی ہوتی ہیں اور بے چاری لڑکیاں خواتین خرید رہی ہوتی
ہیں ”جب لگاتی ہیں تو تھوڑے دنوں کے لیے تو ان کا رنگ
خوب جگمگا جاتا ہے مگر اس کے بعد جو اس کی اسکن تباہ ہوتی
ہے بہت پوچھیں کہ کیا حشر ہوتا ہے۔ چہرے پہ دانے نکل
آتے ہیں۔ بال نکل آتے ہیں۔ چہرے پر چھائیاں پڑ جاتی
ہیں۔ اسکن جھلس جاتی ہے اور ان کریموں کی وجہ سے
اسکن پر ابلنڈز میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے اور مریضوں کی
تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ بار بار کا کام فیشل کرنا
چہرے کو صاف کرنا ہے ہیر کنگ وغیرہ ہونا چاہیے۔ میں
نے دیکھا ہے کہ کریم کے علاوہ گولیاں بھی دیتی ہیں جن
سے ان کے ”پیریڈ“ آتا ہے ڈاؤن ہوتا شروع ہو جاتے ہیں اور
لڑکیاں روتی پیتیں آتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کریں مسئلہ
یہ ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ”چیک اپ ڈیٹیلیس“ نہیں ہے
ہر کوئی اپنی دکاندار چلا رہا ہے کوئی اسٹین پوچھنے والا نہیں
ہے۔“

”مسئلہ یہ ہے ڈاکٹر صاحب ہمارے یہاں گورے رنگ
کو بھی تمام پریشانیوں کا حل سمجھا جاتا ہے؟“
”دیکھیں گورا رنگ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر لڑکیاں
گورا رنگ چاہتی ہیں تو کسی ڈراما ٹولو جیسٹ کو کھائیں تو
زیادہ بہتر ہے کہ وہ جڑ کو پکڑ لے گا بے شک تھوڑا نام
لگ جائے گا لیکن ان کا چہرہ صاف ہو جائے گا۔ اسکن تباہ
نہیں ہوگی اور رنگ بھی گورا ہو جائے گا گورا کرنے کا
شارٹ کٹ اسکن کو تباہ کر دیتا ہے۔“

”کتے ہیں کہ چہرے کی سرجری کرانے سے بھی رنگ
گورا ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ سنا تھا کہ مائیک جیکسن نے
بھی سرجری کروائی تھی؟“

”ہاں جی یہ مشہور ہے کہ انہوں نے سرجری کروائی
تھی۔ ایسا نہیں ہے یہ بالکل غلط ہے۔ اصل میں مائیکل
جیکسن کو ”بھلیوری“ تھی چونکہ یورپ اور امریکہ کی
آبادی گورے رنگ کے لوگوں پر مشتمل ہے تو بھلیوری
ہماری اسکن پہ تو نظر آجاتا ہے مگر گوروں کی اسکن پہ نظر
نہیں آتا اس مرض کی تشخیص تحقیق ایران میں پاکستان میں
اور انڈیا میں ہوتی ہے وہاں نہیں ہوتی تو مائیکل جیکسن
کو بھلیوری تھی اور وہ اس کا علاج بھی ٹھیک طرح سے
نہیں کروا سکا وہ بیماری اس کے پورے جسم میں پھیل گئی وہ
گورا لگنے لگا جبکہ یہ بالکل غلط ہے کہ اس نے سرجری
کروائی تھی اور بلیچ کروا کے اس انداز میں گورا کروانے
سے چار پانچ سال کے بعد کینسر ہو جاتا ہے اور وہ بھی اسکن
کا۔“

”بہت ساری معلوماتی باتیں ہو گئیں۔ یہ بتائیں کہ
ملک سے باہر کتنا عرصہ رہے آپ؟“
”بڑھائی کے لیے میں تقریباً ساڑھے تین سال انگلینڈ
میں رہا ویلز میں اور آن دی جاب ٹریننگ حاصل کی۔ اس
کے علاوہ کافی سارے ممالک جیسے ہالینڈ، جرمنی، گریس،
روس، ازبکستان، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سنگاپور، ملائیشیا، قطر،
بحرین، سعودی عرب اور بوسے ای میں ہر سال دو تین
کا نفرنس ہوتی ہیں اور اسکن سے آپ ڈیٹ رہنے کے
کو سز ہوتے ہیں میں ہر سال دو تین مرتبہ ضرور جاتا ہوں
اور شارٹ کورسز کرتا ہوں کیونکہ اتنی جلدی جلدی
تحقیقات سامنے آ رہی ہیں کہ اگر آپ بڑھائی چھوڑ دیں
گے تو دنیا سے پیچھے رہ جائیں گے۔“

”ملک سے باہر مستقل قیام کا کیوں نہیں سوچا آپ نے؟
بیسہ بھی بہت ہے اور تعلیم بھی جاری رہ سکتی ہے۔“
”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، باہر جا کر میں نے ایک
بات خاص طور پر نوٹ کی کہ دنیا بھر کے لوگ اپنے ملک کے
لیے ”ایک قوم“ بن کے رہتے ہیں، ہم پاکستانی لوگ بہت
پیارے لوگ ہیں۔ بہت معصوم لوگ ہیں اور بہت جلدی
دوسروں کے برکاوے میں آجاتے ہیں، ہم ایک نیشن کی
بات نہیں کرتے، ہم آپس میں بٹ سے جاتے ہیں یہ دیکھ
کر مجھے بہت افسوس ہوتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں ویزے کے لیے جا رہا تھا تو
انہوں نے کہا کہ آپ بھائی کے بعد وہاں رہ تو نہیں جائیں
گے تو آپ یقین کریں میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہوں
گا میں نے ان سے کہا کہ میرا ملک ایک زبردست ملک ہے
اور انگلینڈ سے پانچ گنا بڑا ہے یہاں کے لوگ مجھ سے پیار
کرتے ہیں۔ یہاں سب میرے اپنے ہیں جہاں ہر نعمت
میرے ہی کیوں انگلینڈ میں رہوں گا۔

آپ یقین کریں میرے دوستوں کی تو خواہش تھی کہ
ان کا دم بھی انگلینڈ میں ہی نکلے میں نے کبھی ایسا نہیں
سوچا گھوٹے بھرنے کے لیے باہر کے ملک جانا اور بات
ہے۔ مگر میں باہر کی دنیا سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہاں
نہ ہمارا کچھ ہے نہ ہمارے لوگ ہیں نہ ہمارے والدین، بہن
بھائی ہیں، یہاں اکیلے زندگی گزاریں۔ آپ کی جڑیں آپ
کا گھر ہے تو یہاں رہیں باہر۔ اپنے ملک کے لوگوں کو کیوں نہ
فیض یاب کریں۔“

”آپ کی سوچ بہت اچھی ہے اسی لیے اللہ نے آپ کو
ترقی بھی دی ہے آپ تقریباً“ ہرٹی وی چینل پر آتے ہیں۔
فیٹی مشورے بھی دیتے ہیں، ہم نے سنا ہے کہ چیمنلرز
والے کہتے ہیں کہ ہم آپ کو معاوضہ نہیں دیں گے۔
کیونکہ ہم آپ کو پلیٹی دیتے ہیں ایسا ہے؟“

”جب میں نے اشارت کیا تو ایسا ہی تھا“ تقریباً“ چار
ساڑھے چار سال قبل میں نے اپنا کیریئر شروع کیا تو یہی کہا
جاتا تھا کہ ہم آپ کو پلیٹی دے رہے ہیں پھر ہوا یہ کہ
آہستہ آہستہ میری ڈیمانڈ ہوتی چلی گئی، اب وہ مجھے خود
بلائے ہیں اب لوگ مجھے صرف ڈائریکٹ حیثیت سے نہیں
بلائے بلکہ لوگ اب مجھ سے اپنے سوشل ایڈو بھی
ڈسکس کرتے ہیں، مانی فنانس کا پوچھتے ہیں لڑکے لڑکیاں
کپڑوں کے اسٹائل کے بارے میں پوچھتے ہیں، اپنے دل کی

بات کرتے ہیں اگر آپ اپنے آپ کو اچھا پروف کر دیں تو
پھر آپ ”آن ڈیمانڈ“ ہوتے ہیں پھرٹی وی والے اچھا
Pay کرتے ہیں۔“

”ایک پرسنل سوال آپ نے شادی نہیں کی ابھی تک
کیوں؟“
”تقریباً.....“ کیا کریں ٹائم ہی نہیں ہے مصروفیات،
ایکسر سائز لوگوں کا پیار، تقریریں، بین الاقوامی کانفرنس تو
ٹائم ہی نہیں ملا کہ شادی کروں۔“

”آپ کی امی کا دل چاہتا ہو گا کہ ایک ہو آتی چاہیے۔
آپ اکلوتے بیٹے ہیں اپنے والدین کے؟ اپنی پسند سے
کریں گے؟“

”بس پھر آپ کو دعا کرنی پڑے گی۔ میری یہ سوچ ہے کہ
شادی گھر والوں کی پسند سے ہونی چاہیے کیونکہ لو میرج میں
پھر محبت کی شدت نہیں رہتی اور زندگی صرف بیوی کے
ساتھ نہیں گزارنی ہوتی گھر والوں کے ساتھ بھی گزارنی
ہوتی ہے۔ Love وہ اچھا ہوتا ہے جو شادی کے بعد بیوی
سے ہو اور یہ محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی
ہے۔“

”مزاج! کہے ہیں؟ غصہ آتا ہے؟“
”میں تو سب کے ساتھ بہت فرینڈلی ہوں..... مجھے وہ

باتوں سے بہت شدید چڑ ہے ایک بناوٹ اور دوسری دکھاوے
میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے یہاں لوگ بناوٹ کو بہت پسند
کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی غرے دکھا رہا ہے۔ غلط انگریزی
بول رہا ہے کوئی لیے دیر رہتا ہے تو اسے بہت اہمیت دی
جاتی ہے۔ یہ کھوکھلا پن مجھے بالکل پسند نہیں ہے جہاں
تک غصہ کی بات ہے تو بہت آتا ہے مگر پھر وہ منٹ میں چلا
بھی جاتا ہے۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟ چھٹی کا دن کیسے
گزارتے ہیں؟“

”فارغ اوقات میں سوتا ہوں، تھکن اٹارتا ہوں، پھر
گھومنا پھرنا، میوزک سننا، دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا۔
باغبانی کا بہت شوق ہے، وہ بھی فارغ وقت میں کرتا ہوں۔
لوگ ڈرائیو کرتی۔ مگر ان سب باتوں سے بہت کرسونے کا
بہت شوق ہے مجھے۔“

”اور سونا بہت مڑگا ہو گیا۔“
”تقریباً.....“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر خرم مشیر سے
اجازت چاہی۔

عید سروے

ہمارے یہاں عید قربان روایتی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ وہی رنگ برنگ پیراہن، مندی سے رپے ہاتھ،
کھٹکی چوڑیاں اور اس رنگین منظر میں بھاپ اڑاتے، اشتہار انگیز یکوان، اس تہوار کو چٹ پٹا اور مزے دار کر دیتے ہیں۔
اس خاص موقع پر ہم نے حسب روایت قارئین سے سروے کا اہتمام کیا ہے۔ جس کے سوالات یہ تھے۔

(1) عید الاضحیٰ کی سب سے اچھی بات آپ کو کیا لگتی ہے؟

(2) عید الاضحیٰ سے پہلے آپ کیا تیاری کرتی ہیں؟

(3) گوشت کی کوئی ایسی روایتی ڈش جو آپ کے یہاں عید الاضحیٰ پر بنتی ہے۔ اس کی ترکیب لکھیں۔
بچے ہمارے قارئین نے ان سوالوں کے کیا مزے دار جواب دیے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

روشن ہے صبح عید

ادارہ

ذیب النساء میمن۔ حیدر آباد

میں خواتین ڈائجسٹ کی بہت پرانی قاری ہوں، جب
میں نے سڑک پاس کیا تھا مجھے لگنے کا بہت شوق تھا اور
ہے۔ لیکن مصروفیات نے روک رکھا۔ میں نے نو سال
اسکول میں چاب کی اور پرائیویٹ ایم اے کیا لیکن شادی
کے بعد اپنے آپ کو شوہر گھر اور بچوں کے لیے وقف کر
دیا۔ اب دو بیٹیوں کی شادی کرنے کے بعد بیٹا بھی باہر
پڑھنے کے لیے بھیج دیا ہے سب سے چھوٹی بیٹی بھی
میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی ہے، میں اب بھی
خواتین ڈائجسٹ، کرن اور شعاع باقاعدگی سے پڑھتی
ہوں۔ مطالعے کی بہت شوقین ہوں۔ اب دل چاہتا ہے کہ
کچھ لکھوں۔

1: عید الاضحیٰ کی سب سے اچھی بات قربانی کرنا ہے۔
اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق سے کچھ غریبوں تک
پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ بے چارے غریب لوگ
بھی عید الاضحیٰ کا انتظار کرتے ہیں۔ میں کھانے سے زیادہ
کھلا خوش ہوتی ہوں۔ الحمد للہ جب سختی لوگوں تک
قربانی کا گوشت پہنچتا ہے تو میں ہانٹ کر بے انتہا سکون اور
خوشی محسوس کرتی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں، جس

دیا ہے۔ جو پیکٹ ڈالو وہی دُش بن جاتی ہے۔ لیکن میں ایک گوشت کی دُش جو دیو پھر کو کھانے میں بنتی ہے۔ سب دیور اور ان کی فیملی مل کر ہمارے ہاں دیو پھر کا کھانا کھاتے ہیں۔ وہ ہے بھنا ہوا گوشت، اس کے کیے میں اپنے مسالے ہی استعمال کرتی ہوں۔ بہت مزے دار بنتا ہے اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔

پھر انہیں ایک پالے میں ڈال کر ان میں ایک کپ پانی شامل کریں اور کچلی بھی شامل کر کے اچھی طرح پیچھے سے مکس کر لیں۔ پھر اس کے بعد 2 پیچھے سرکہ ڈال کر مکس کریں اور ڈھک کر آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں تاکہ کچلی کی بو دور ہو جائے۔ اس کے بعد کچلی کو اس آمیزے سے نکال کر پانی سے دھولیں۔ ایک ڈونٹے پالے میں کچلی ڈالیں، اس میں لسن اور کپ پیسٹ، دہی، بقیہ سرکہ، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور آدھے گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اس کے ساتھ اب آپ شملہ مرچ یا زور نماز کے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں، تاکہ شاشلیک اسٹیکس میں پروئے جائیں۔

اس کے بعد ایک پین میں کچلی کو اس آمیزے سے ڈال کر ہلکی آنچ پر دم دے کر اتنا پکا لیں کہ کچلی اچھی طرح نکل جائے پھر اس کے بعد اس میں آئل ڈال کر اس کو بھون لیں۔

کچلی بھی چھوڑ دے تو ایک کوئلے کا ٹکڑا گرم کر کے پیاز کے ٹکڑے پر رکھ کر کچلی میں رکھیں ایک قطرہ کوئلے آئل کا ڈال دیں اور فوراً ڈھک دیں۔ دو منٹ بعد صحن ہٹائیں اور کوئلہ باہر نکال لیں۔ اس سے کچلی میں زبردست خوشبو ہو جائے گی۔ اب کچلی کے ٹکڑوں کو شاشلیک اسٹیکس میں پروئے ہے۔ ایک اسٹیک لے کر پہلے اس میں شملہ مرچ کا ٹکڑا پڑھیں، پھر کچلی کا پھر ایک پیاز کا، پھر ایک نماز کا، یہ عمل دہراتے جائیں۔ اس طرح اپنی حسب فضاء تعداد ایک اسٹیک پر پروں۔ اس کے بعد ان اسٹیکس کو یا تو پہلے سے گرم لوان میں 10-8 منٹ سینک لیں یا چونے پر ہلکی آنچ پر سینک لیں یا گرل پین کو گرم کر کے اس پر سینک لیں۔ تاکہ خشک ہو جائیں۔ اسے لیموں کی مسلاہ پٹنچی اور نمک کے ساتھ پیش کریں۔ لیجئے مسالے دار بابلی کو بھی تیار ہے امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

ایک اور آسان اور لذیذ ترکیب جو ہم نے اپنے پڑتیوں سے بھی وہ ہے۔

نمکین فرنیڈ گوشت

اجزاء :
گوشت
نمک

آدھا کلو
5-6 فیمل سپون

کوئلہ آئل
آدھی پہالی

ترکیب :
گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان کو نمک لگا کر 3-4 گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد یہ نمک والا پانی گرا دیں۔ ایک پین میں آئل گرم کر کے اس میں گوشت ڈال کر ہلکی آنچ پر کچھ منٹ دم پر رکھیں۔ اس کے بعد ہلکی آنچ پر فرنی کر لیں یہاں تک کہ گوشت نکل جائے اور اچھی طرح پک جائے۔ ایک پیسٹ میں نشو و پیر رکھ کر نکالیں، تیل جذب ہو جائے تو گرم گرم کھائیں۔ یقیناً جانیں یہ بے حد لذیذ ہو گا ہے خصوصاً بچوں کو بہت پسند آتا ہے۔

گل پری مرزا لاہور

1- عید الاضحیٰ کی سب سے اچھی بات اس سے زیادہ ہم کو کیا لگ سکتی ہے کہ یہ ہمارے بہت جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت کو تازہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ارد گرد کلی محلوں میں بے شمار ٹکڑے، بھینسیں اور اونٹ وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں جو بچوں کو تو کیا بڑوں کو بھی اچھے لگتے ہیں۔ گل پری میں آنے والے ہر نئے بکرے اور گائے کو دیکھنے کے لیے شائقین کی ایک بڑی تعداد اکٹھی ہو جاتی ہے اس کی قیمت پوچھنے کے لیے پھر اسے دیکھتے ہیں کہ ڈونڈا ہے کہ چونڈا اور غور میں الگ اپنی بالکونیوں سے جھانک رہی ہوتی ہیں یہ سب اچھا لگتا ہے۔

2- تیاری میرے خیال میں وہ لوگ زیادہ کرتے ہوں گے جو قربانی کرتے ہیں۔ ابھی تو ہم صرف قربانی کا گوشت کھانے والوں میں سے ہیں۔ اللہ توفیق دے تو انشاء اللہ اگلے سال کریں گے۔ بانی گھر وغیرہ صاف کیا جاتا ہے اور لسن، اورک، نماز اور مسالا جات خرید لیے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اتنی تیاری تو سب لوگ ضرور کرتے ہیں بڑی عید پر۔

3- جناب! اب تو دوش میں بناتی مڑوں اس کی ترکیب حاضر خدمت ہے۔ بہت مزیدار اور ہم سب گھر والوں کی من پسند ہے اس دوش کو فرانی کرنے کے بعد یہ ضرور آپ کی بھی من پسند دوش بن جائے گی۔ اس کی ترکیب بھی ان ہی رسالوں سے شاید ملی تھی۔

دھواں دیہی گوشت

اشیاء :

بکرے کا گوشت
پیاز
دہی
اورک اور لسن کا پیسٹ
چھوٹی الائچی
پودینہ
ہری مرچ
سرخ مرچ پاؤڈر
دھنیا پاؤڈر
نمک
تیل
کوئلہ

ترکیب :

ایک کلو
2 عدد
ایک کپ
ایک کھانے کا چمچہ
4 عدد
آدھی کھٹی
6 عدد
2 پیچھے
2 پیچھے
حسب ذائقہ
آدھا کپ
ایک عدد

سب سے پہلے گوشت دھولیں۔ ایک پیاز باریک پیس کر اس میں لسن، اورک، نمک، مرچ دھنیا اور گوشت ملا دیں۔ پھر دہی میں چار پہالی پانی ڈال کر تمام گوشت اور مسالا درمیانی آنچ پر پکا میں گوشت ڈالنے کے بعد اس میں تیل ڈال دیں اور اتنا بھوئیں کہ تیل مسالے سے الگ ہو جائے پھر دہی میں نمک ڈال کر پیسٹ میں۔ بقیہ ایک پیاز کے ٹکڑے کاٹ لیں اور پھر اس کے ساتھ ہی پودینہ اور ہری مرچ بھی کاٹ لیں پھر ایسا کریں کہ گوشت کا ساں ایک دوش میں نکال کر اس پر ایک تہہ دہی کی لگائیں اسی کے اوپر پیاز، پودینہ، ہری مرچ، نمک، تیل، اسی طرح کٹی ہوئی لگائی جاسکتی ہیں اور کوئلہ آگ پر سرخ کر لیں پھر دوش کے درمیان روٹی یا ڈیل روٹی کا ٹکڑا رکھ کر اس پر چند قطرے گھی کے ڈال دیں اور جلتے ہوئے کوئلے کو روٹی کے ٹکڑے پر رکھ کر جلدی سے ڈھک دیں۔ چند سیکنڈ کے بعد روٹی اور کوئلہ نکال دیں۔

لیجئے جناب مزیدار دھواں دیہی گوشت تیار ہے خود بھی کھائیے اور دوسروں کو بھی کھلا کر خوب داد وصول لیجئے۔

سونیا ربانی تقاضیاں محلہ بالا

1- عید الاضحیٰ کی سب سے اچھی بات یہ لگتی ہے کہ بڑی عید کی خوشیاں سب ایک طرح سے ہی مناتے ہیں اور غریبوں کا سب ہی خیال کرتے ہیں اور قربانی پہ سب کو یاد رکھا جاتا ہے اور مجھے تو یہ بات اچھی لگتی ہے۔ جب ہم ان کے نام سے قربانی کرتے ہیں جو ہم میں موجود نہیں رہے خیر

بڑی عید ہے ہی دوسروں کا خیال کرنے کا نام تو یہی بات بہت اچھی لگتی ہے مجھے۔

2- بڑی عید کی تیاری بالکل سادہ سی ہوتی ہے۔ کیونکہ سب کا زور قربانی کی طرف ہوتا ہے۔ مگر گھر کی صفائی تو خوب کی جاتی ہے۔ میں اور ماما ل کر پہلے تو سارے وہ برتن دھوتے ہیں جو گھر میں موجود ہیں۔ یعنی کہ گاؤں میں ایک دو کمرے ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں داخل ہو کر آپ کو سب سے پہلے برتن ہی نظر آتے ہیں۔ الماریاں بنا کر وہاں برتن سجائے جاتے ہیں مجھ کو آج تک مجھے میں نہیں آیا کہ یہ کیوں ضروری ہے اور یہ برتن ہر تین ماہ بعد دھو کر صاف کر کے رکھتے ہوتے ہیں۔ پھر جی سب پر دے اور چادریں ہوتی ہیں اور ہم اور ہماری ماما سارے گھر کو صاف کرنے بعد جب دیکھو تو خود کو بھی اچھا لگتا ہے۔

ہم پوروں میں سے ہر بے کار چیز ضرور نکال کر صفائی کرتے ہیں تو پورے بہت اچھے لگتے لگتے ہیں۔ میری تیاری میں میرے پورے ہر حال میں شامل ہوتے ہیں۔ یوں مجھ لیں کہ میں عید آنے پہ پوروں کی بھی تیاری شروع کرواتی ہوں۔

یہ کام دس دن پہلے شروع ہوتے ہیں۔ باقی بازار کے چکر لگاتے ہیں یعنی ایک بار ہی جا کر سب لے لو اور اکثر میں عید کی چیزیں ایک ایک پونے نے آتی ہوں۔ عید تو یوں خوش ہوتا ہے کہ جیسے سارا پاکستان کچر خان ہی چلا آیا ہے اور مجھے زیادہ لوگوں میں دشت ہوتی ہے اور میرے بھائیوں کی تیاری کے تو کیا کہنے ان کی تیاری تو عید تک جاری رہتی ہے۔

3- میں نے نعان سے پوچھا کہ بڑی عید کی کیا بات تمہیں بہت اچھی لگتی ہے۔ تو جواب آیا بونیاں لٹکی گوشت۔

تو آپ سوچ لیں بڑی عید یہ کچن کا کیا حال ہوتا ہے میرے بھائی خاصے خوش خور آگ ہیں تو عید پہ ہر وہ خاصہ چیز بنائی جاتی ہے۔ جس میں گوشت ڈالا جاسکے۔ میں تو ع کے دوسرے دن اجاری بریانی بناتی ہوں کیونکہ ٹاپاب کے دوسرے روز آتی ہے اور یہ اجاری بریانی سب کی خاصہ فرمائش بنائی جاتی ہے۔

اور وہ بالکل ویسے ہی بنائی جاتی ہے جیسے عام بریانی۔ صرف تیار ہونے سے 15 منٹ پہلے اجار مکس والا

پڑتا ہے اور باقی ہمارے بھائی خود ہی بچن میں پائے جاتے ہیں عید کے دنوں میں اور اپنی پسند کے مطابق کچھ نہ کچھ بناتے رہتے ہیں۔

جب عید گزر جاتی ہے۔ تو میں شام کو حیرت سے سوچتی ہوں کہ عید گزر بھی گئی اتنی تیاریاں اور عید صرف ایک دن میں گزر گئی ایسی بارمزا آئے گا توئی جو یہاں ہے۔

اللہ کرے کہ عید پر سکون انداز میں گزرے (امین)

صبا شفیق جہلم

1 -

خوشبو بادل پھول پہ کلیاں جھنم آپ کے نام عید کی ساری خوشیاں سب آپ کے نام ویسے تو دونوں عیدوں کا اپنا اپنا مزہ ہے لیکن مجھے عید الاضحیٰ زیادہ اچھی لگتی ہے عید الفطر سے پہلے جو چندر رمضان المبارک کا مہینہ ہوتا ہے اور پھر عید کے قریب عبادات کی راتیں گزرتی ہیں اس لیے عید پر کافی محسوس ہو جاتی ہے اور عید آرام کرتے ہی گزرتی ہے جبکہ عید الاضحیٰ پر ایسا نہیں ہوتا۔

بقر عید پر جو بلا لگا ہوتا ہے وہ مجھے اچھا لگتا ہے ہمارے پورے محلے میں ایک میلے کا سا ساں ہوتا ہے آج ایک گھر قربانی کا جانور آرہا ہے تو کل دوسرے کے گھر محلے کے ہر گھر میں قربانی کی چائی ہے اور میرے گھر کے پاس ہی بچوں کے کھیلنے کا کراؤنڈ بھی ہے اس وجہ سے جب قربانی کی گائے گھر میں آتی ہے تو بچوں کی ساری ٹیم میرے بھائی کے ساتھ موجود ہوتی ہے اگلوتے بھائی اس رسم کی خوشی دیکھنے والی ہوتی ہے اور قربانی والے دن بھی خوب رونق لگتی ہے۔

بچے اگر بقر عید میں سے قربانی نکال دی جائے تو عید بالکل بیکار رہ جائے خاص طور پر بچوں کی گوشت کو گھر گھر بانٹنا اچھا لگتا ہے اور گھر کے باہر جو گوشت لینے والے فقیروں کا رش لگتا ہے اس سے نمٹنا سب سے مشکل ہوتا ہے مگر پھر بھی مزہ آتا ہے اور گھر میں مہمانوں کا بھی مسلسل آنا جانا رہتا ہے جس کو ہم سب ہمیشہ خوب انجوائے کرتے ہیں۔

اس عید پر جو باریبی کو event ہوتا ہے اس کی کیا ہی بات ہے۔ اہی ابو، ماموں، بھائی اور ہم ہمیشہ سب ہوتے ہیں گھر کے صحن میں انگلیٹھی رکھ کر ای اور ماموں باریبی کو تیار کرتے ہیں میں اور امی گرم گرم نان تیار کرتی ہیں۔ ماموں کی چٹ پٹی باتیں ہم سب کا قصے لگا کر سننا اور امی ابو

کی نرم گرم باتیں بہت رونق لگاتی ہیں لیکن اس بار شاید سب اس طرح سے نہیں ہو گا ابو اور ماموں ملک سے باہر ہیں ان کی شادی ہو گئی ہے۔

یہ چار دن تیری سنگت میں گزارے ہیں بہاروں جیسے اب تو ایسے پچھڑے ہیں خوابوں کی طرح 2 - اس عید پر اپنی تیاری اور گھر کی صفائی کے ساتھ کچن کی کافی تیاری کرنی پڑتی ہے ہمارے گھر میں مختلف چشیاں بنا کر رکھی جاتی ہیں جن میں اہلی کی بیٹھی چٹنی پورے کی چٹنی اور کچھ شامل ہے اور ک لہسن کا پیسٹ بنا کر اور پیاز کو فرانی کر کے رکھتے ہیں اس عید پر قربانی ہوتی ہے اور ساتھ آنا جانا بھی لگا رہتا ہے تو اس طرح کرنے سے کافی آسانی رہتی ہے بلکہ جو خواتین رونا روتی ہیں کہ ہماری یہ عید کچن میں گزرتی ہے تو میں ان سب سے کہوں گی کہ آپ بھی سب کر سکتی ہیں مزید آپ نماز کی پیوری بھی بنا کر رکھ سکتی ہیں یہ سب کرنے سے کام جھٹ پٹ مکمل ہو گا تھوڑا کچھ انجوائے کریں اور مہمانوں کو بھی ٹائم دیں۔ ہمارے گھر میں قربانی کے سب لوازمات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔

3 - نمک والا دوست یہ وہوش ہے جو ہمارے گھر میں سب کو پسند ہے لیکن میں اس کی ترکیب آپ کو پہلے بھی لکھ چکی ہوں البتہ اس عید کے حوالے سے ایک مزے دار واقعہ آپ کو بتاؤں۔

پچھلے سال بقر عید پر ہم مغرب کے ٹائم تک قربانی سے فارغ ہوئے اور گوشت جتنی ہم نے تقسیم کر دیا تھا لیکن اگلے دن میرا چھوٹا بھائی ارسم گھر سے باہر کھڑا تھا کسی فقیر نے ارسم سے پوچھا "آپ نے قربانی کی ہے؟" تو وہ بولا کہ "ہاں کی ہے۔"

اس نے کہا۔ "اچھا پھر گوشت دو۔" اب بھائی صاحب انکار کرنے کے بجائے گوشت لینے اندر آئے مگر باہر جو رش لگا کہ اللہ کی پناہ اور اس رش سے ہم کسے نمٹے یہ آپ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے اس واقعہ کو یاد کر کے ہم آج بھی بہت ہستے ہیں۔

سمیعہ لیاقت علی اڈوڈ وائے قصور

1 - عید الاضحیٰ کی سب سے اچھی بات حضرت ابراہیمؑ کی سنت مبارک کو نازہ کر دے ہوئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں

قربانی کرنا میرے اپنے خیال کے مطابق جس قسم کا سبق ہمیں سنت ابراہیمؑ سے ملتا ہے اگر ہماری ساری قوم اس پر صدق دل سے ایمان لے آئے تا تو ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی بڑی سے بڑی آزمائش میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں ویسے مجھے قربانی والے مکوں یا گائے کو نہ لانا ہندی لگانا اور چارہ کھانا اچھا لگتا ہے۔ ہر عید الاضحیٰ پر میرے بھائی کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ جس جگہ قربانی کے بعد مکے کوڑے کے ساتھ نکلتے ہیں اور ہر مجھے لکھا جاتا ہے۔

2 - عید سے دو دن پہلے مکمل صفائی کرتی ہوں نمب کے کپڑے تیار کر کے پھر اپنے بارے میں سوچتی ہوں۔ قربانی کے دوران استعمال ہونے والی چیزیں پہلے ہی سنبھال کر رکھی ہوتی ہیں۔ کیونکہ جناب بچوں کو سلطان رانی بننے کا پراشوق ہوتا ہے تا صفائی اور دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ذہن میں مینو بھی سیٹ کر لیتی ہوں۔ یہ بھی کہ کون کون آئے گا کیا کیا کانا ہے؟ کدھر کدھر جانا ہے۔

3 - روایتی دشت تو ایسی کوئی خاص نہیں مٹوائے اس کے کہ ڈھیر سارے گوشت میں نمک اور کالی مرچیں ڈال کر پکایا جائے اور سارا دن مزے لے لے کر کھایا جائے۔ فقیر بنوں کے لیے ایک چھوٹی سی ٹپ کہ جب پہنچی اور گروے نکالیں تو پیاز کا استعمال کم سے کم کریں اور نمک آخر میں ڈالیں اور مناجات پڑھنے کی جگہ ضرورت نہیں خود ہی سامنے آجائیں گے۔ ایک نہایت ہی مزے کی ترکیب آپ کے لیے بنائیں اور مجھے دعا میں دیں۔

"ڈورائی ہیف چلیز"

ضروری اجزاء : گائے کا گوشت (انڈر کٹ) ایک کلو بڑے بڑے پیس کر کے ایک سے دو کھٹے کے لیے فریز کر لیں

ہری مرچ پندرہ عدد
سویا سوس دو کھانے کے چمچے
چینی ایک چمچ
سفید سرکہ دو چمچے
نمک حسب ذائقہ
تل کا تیل چند قطرے
کارن فلور ایک چمچ
سفید مرچ (پسی ہوئی) ایک چمچ

پکن کیوب ملا ہو امیدہ ایک چمچ
لہسن کے جوئے ہر ایک پے ہوئے 8 عدد
تیل چار چمچے
کالی مرچ ایک چمچ
ترکیب :

فرز کیے ہوئے ٹکڑوں کو نکال کر تیز چھری سے ہر ایک پارے کاٹ لیں پھر ان پاروں میں نمک، چینی کالی اور سفید مرچ، سویا سوس، سرکہ، لہسن، کارن فلور اور امیدہ ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے ایک کھٹے کے لیے رکھ دیں جب کھانا نکالنا ہو تو ایک کڑائی میں تیل گرم کریں پھر مسالا لگے پارے ڈال کر تیز آگ پر اسٹیر فرم کریں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو آگ بجلی کر دیں۔ دوسرے فرانگ بین میں تیل ڈال کر سبز مرچوں کو فرانی کر کے گوشت میں ڈال لیں پھر مل کا تیل ڈال کر کھانے کے لیے پیش کریں اور بے تحاشا دادیں۔

عظمیٰ حیدر گر اچھی

1 - عید الاضحیٰ ہمارا سب سے بڑا مذہبی تہوار ہے اور اس کی سب سے اچھی بات قربانی ہے جس ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ سارا گوشت اپنی فرخ میں اشاک کرنے کے بجائے آسلائی طریقے سے اس کے تین حصے کریں۔ خاص طور پر مسیحین تک ان کا حصہ ضرور پہنچائیں۔ اس کے علاوہ صبح ابو اور بھائی کو نماز کے لیے بھیجنے کے بعد قربانی کا انتظار کرنا اور قربانی کے بعد کھجی سے لطف اندوز ہونا بھی اچھا لگتا ہے۔ ویسے میری آٹھ سال کی بیٹھی انشراح کوئے پڑے چوڑیاں اور سج کباب اچھے لگتے ہیں۔

2 - عید سے چند دن پہلے پورے گھر کی تفصیلی صفائی ہوتی ہے جو لازمی طور پر جاکر کرنا ہے کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ البتہ پکانے کا شعبہ میرے پاس ہے تو عید سے دو تین دن پہلے تمام خشک مسالے پکوا کر رکھ لیتی ہوں اگر اس کے علاوہ ہر امیالا، اور ک لہسن اور چنے وغیرہ پیس کر فریز کر دیتے ہیں حتیٰ کہ چاند رات کو میں چینی کا مسالا بھی تیار کر کے رکھ لیتی ہوں (جبکہ گائے ابھی زندہ سلامت کھڑی ہو رہی ہے) تاکہ صبح مشکل نہ ہو۔

3 - مجھے کوکٹ کا کافی شوق ہے تو ہر دفعہ کچھ بنا بناتے کوشش ضرور کرتی ہوں۔ پچھلے سال عید پر میں۔

18

پہلے آئینہ

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے ٹل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی انظار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبید۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصائی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گستاخی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں، اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر عظیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک بڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے جسی لے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی عمر انی کریم بی کے سر ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔ عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ذہنی کے باوجود مقبول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے عمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کمایا ہے کہ گزرا وقت اچھی ہو جائے۔

عبید آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹر کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔



عبیدہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حیرا سے قریب ہے۔ اس نے طبعی پروردہ شریا بھی عبیدہ کی دوست ہے لیکن یہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیدہ اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بدو جوہر ہائش پذیر ہیں۔ بڑی نائی بے اولاد ہیں اور بیوی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے روئیں صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیدہ کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیدہ دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے جہاں ان دونوں کی والدہ آبائی اپنے خلوص اور دیرساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسانہل جاتا ہے بلکہ ڈراما آؤٹس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیدہ کو سب سے زیادہ شیش کزن شہیار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو شخص عبیدہ کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان، شہیار کے لیے عبیدہ کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیدہ کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ ابھارتی ہے۔

(اب آگے پڑیے)

۱۳ چودہویں قسط

ظفر علی روڈ پر ایک قطار سے آگے کینار اور منبل کے درختوں سے ٹوٹ کر گرتے خشک تھے اس کے پیروں تلے اگرچہ مرانے تھے۔ اس نے رکشہ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی دیر سے وہ تپتی کی چٹا ہاتھ میں لیے بھگتی پھر رہی تھی۔ جوں جوں وہ رکشہ کو دائیں سے بائیں مڑواتی رکشہ والے کی بڑبڑاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ شدید کوفت میں مبتلا اس نے عاجز آکر اس کی مطلوبہ رقم فراہم کی اور رکشہ سے اتر آئی۔

موسم خزاں آگیا تھا۔ راتیں ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ لیکن سورج میں ابھی تک حدت تھی۔ بڑا سا گولا عین اس کے سر پر ٹھمتا۔ اپنی تیز اور تند شعاعیں ناک ناک کر اس کو مار رہا تھا۔

بڑی بڑی بستیوں کا بڑا عجیب کچھ ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے لاعلم نہ بھی ہوں تو لاعلم ظاہر کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ دیوار کے اس طرف کون آیا ہے۔ ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی چھوٹی بستی میں داخل ہو کر آپ وہاں موجود کسی پہلے آدمی سے کہیں ”وہاں جانا ہے“ جہاں فونکی ہوئی ہے تو وہ شخص ناکہ کروا کے سیدھا آپ کو موت والے گھر تک لے جاتا ہے۔ لیکن اس علاقے میں سیکورٹی پہ کڑے گارڈ سڑک پر بھاگنے والے بچوں اور یونمی بے مقصد آوارہ گردی کرنے والے لڑکوں میں سے کوئی نہیں جانتا ”وہ پتا کہاں ہے جو اس کی پرچی پر لکھا ہے۔ اور پتا نہیں ایسا کوئی ایڈریس گوگل Earth پر موجود بھی تھا یا شخص کسی نے مذاق کیا ہے۔ آج کل مذاق کی تشبیہ بھی عجیب و غریب ہو گئی ہیں۔ گلیوں کی ترتیب بھی عجیب تھی۔ تیرہ کے بعد اٹھارہ آجائی۔ اور وہ چودہ نمبر کہاں جا چسپی تھی۔ جو ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی تھی۔ ہر چکر پر تیرہ نمبر گلی سے گزرتے اس کی نظر اس شخص پر پڑتی تھی جو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے دنیا و مافیہا سے بے نیاز نیم وا آنکھوں سے دھوپ اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے جیسے مدہوش تھا۔

انچیلوں کی طرح آنکھیں بند کیے اپنے آپ میں گم درخت کے تنے سے رانچے کی طرح ٹیک لگائے گویا دنیا جہان سے بے زار دکھائی دیتا تھا۔ بس اس کے ہاتھ میں پائری نہیں تھی اور ظفر علی روڈ پر گا میں، جہینیں چرانا ممنوع تھا۔ مگر اس کے چہرے پر رانچے کے برعکس غصہ اور کٹی تھی۔ مگر کس چیز کی۔ آج کل لوگ رانچے والے سکون کو ترس گئے ہیں۔ اس نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ کندھوں تک آئے لے بالوں اور بد رنگ جینز میں وہ خود ہی مسکراتا اپنے موبائل پر کچھ لکھتا اور لکھے کو پڑھ پڑھ کر پھر مسکراتا تھا۔ اگلے چکر میں وہ گزرتی تو اس کا چہرہ پھر اسی تلخی کی روشنی نظر آتا۔ سیاہ کپڑوں کی ایک بے ترتیب قطار درخت کے تنے کے گرد کھودی ہوئی باریک منی کے ڈھیر پر کسی کام میں مصروف تھی۔ مکوڑے اپنی تیز رفتاری میں اس کے پیروں پر سے گزرتے اپنا راستہ بناتے چلے جاتے۔ وہ شاید ان سے بھی بے پروا تھا۔

”پتا نہیں شاعر ہے کہ دیوانہ۔“ اس نے سوچا، ورنہ لوگ یوں سڑکوں پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز جو کڑی مار کو تو نہیں بیٹھتے۔ چوتھی دفعہ گلی بھر جوہ کی تلاش میں بھٹکنے سے پہلے یونمی اس کو خیال آیا۔ تپتی کی پرچی اس کے سامنے رکھ کر دیکھی تو جانے کیا پتا کوئی بہتر نتیجہ ہی سامنے آجائے۔ اور کون جانے جو وہ پتھر پتھر مارے اگر واقعی دیوانہ ہے تو دوسری دفعہ قریب سے دیکھنے پر اسے لگا، وہ دیوانہ بھی ہے تو بے ضرر ہے۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر درخت کی چھاؤں اور تنے دونوں پہ دور ایک لمحے کو ٹھہری۔

”۴ قیاط اچھی چیز ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔
”آپ یہ پتا سمجھاتے ہیں؟“ اس نے پوچھا تو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پرچی تھامنے کے لیے ہاتھ آگے کر دیا۔ پرچی اس تک پہنچانے کے لیے جتنا جھلنا پڑا اور جتنا ہاتھ پھیلا نا پڑا عبیدہ نے ہی پھیلا دیا۔ وہ اسی سستی اور کلام چوری سے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔
اس نے ایک چمچھلاتی۔ نظریے پر ڈالی۔ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک دفعہ اور جیسے یقین کرنے کے لیے پھر تیار رہا۔ یونمی اس نے پوچھ لیا تھا۔ جیسے ہر راہ چلتے سے پوچھا تھا۔ اس کو پتا تھا، وہ بھی اس ایڈریس کے لیے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کندھے اچکا کر لائے علمی کا اظہار کرنے لگا۔ جیسا کہ اب تک پوچھنے والے سب راہ گیر کر بیٹھے تھے۔ لیکن اس کی توقع کے بالکل برعکس اس نے ہاتھ شانے سے پیچھے لے جا کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنے عقب میں بنی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی دیوار کے ساتھ آگے ہوئے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ نروان حاصل کر رہا تھا۔

”یہ؟“ اس نے حیرت سے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ یہاں تو کسی انٹرویو کے کوئی آثار نہیں آرہے تھے۔ نہ امیدواروں کا تانتا بندھا تھا نہ چمپل پیل۔ دیر اسے ضرور ہوئی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ لوگ انٹرویو سے فارغ ہو کر جا چکے ہوتے۔

”اس میں تو اسٹریٹ چوہ لکھا ہے اور یہ تیرہ ہے۔“

”یہ چوہ ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ تیرہ یا ہر والی لین ہے جس سے آپ اندر آئی ہیں۔“

”اس؟“ اس نے سٹ پا کر سوچا۔ اگر وہ ذرا بھی بکا رہوش ہو تا تو اس کو سرک کے چکر لگاتے دیکھ چکا ہوتا۔ پتا نہیں اب کون کے دیوانہ سمجھ رہا ہو گا۔ اس نے ذرا تجالت سے نظر پتلی چابی اور احتیاطاً ”پوچھ ہی لیا۔“

”یہ EAS کا دفتر ہے۔“

حالانکہ اب تو بورڈ بھی سامنے نظر آنے لگا تھا۔ سوال ہی احمقانہ تھا، پہلے کیوں اس بورڈ پر نظر نہیں پڑی۔ تب ماموں اللہ بخش اس کو اٹھا کر کہاں لے گئے تھے۔

اس نے اسی بے زاری سے اور اسی انگوٹھے سے دو مرتبہ پیچھے کی طرف اشارہ کیا گویا یہی ہے۔ یہی ہے۔

بیٹنگ کے پیچھے مختصر سے لان کے بعد وقار سے کھڑی پھولی اینٹوں کی عمارت میں اسے داخل ہونا تھا۔ گیٹ تک پہنچ کر اسے خیال آیا، پتا نہیں اسے اتنا بھی چاہیے تھا نہیں۔ پر اب تو آگئی تھی۔ ریسپشن پر کھڑی ریگ برنگے ٹیلی فونز کے بیٹنوں سے پھیلنے والی لڑکی اس کو دروازے پر کھڑا دیکھ بھی چکی تھی۔ جائے فرار ممکن نہیں تھی۔ نوادہ کو آتے دیکھ کر اپنی ڈیوٹی پر مؤدب انداز میں پلٹ گئی۔

”السلام علیکم۔“ EAS کی طرف سے عائشہ ریاض آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

کال سینٹر کی سی مشینی بے روح آواز میں اس نے رٹا ہوا فقرہ ادا کیا تھا۔ اس نے بڑے تھل سے اس جملے کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ پرس سے کانڈ کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک لفافے میں تہ ہوا احتیاط سے جما ہوا تھا اس کے آگے کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کی انگریزی ختم ہو گئی تھی شاید۔

اس نے کانڈ لفافے سے نکال کر انا پلٹا۔

”یہ لفافہ مجھے ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ میں لیٹ ہو گئی ہوں۔ وجہ یہ کہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے یہ بلڈنگ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”آپ نے فون کر کے کنفرم کیوں نہیں کر لیا؟“

”میرے پاس نمبر نہیں تھا۔“ اس نے بے توجہی سے کہا۔ عائشہ ریاض نے لمبے بھر کے لیے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ لیٹر ہیڈ پیڈ کے کارنر پر لکھا تو ہے۔“ وہ دوبارہ غل ہو گئی۔ پہلا امپریشن ہی حماقت کا تھا۔

”ٹپٹ ہو جانے کا مطلب میرا نام ختم؟“



مرحبا جوشاندہ

نزلہ، زکام اور فلو کی چھٹی

مرحبا جوشاندہ اب سیرپ میں بھی دستیاب ہے۔



”چتا نہیں۔“ اس نے کسی یقین کے بغیر تذبذب میں کہا۔ جیسے وہ اس قسم کے فیصلوں کا اختیار نہ رکھتی ہو۔
 ”تو چتا کریں۔“ اس نے کہنیاں کاؤنٹر پر ٹیک کر چس چس کرتے پاؤں اور نچنے میں گڑے جوتے کے اسٹریپ
 سے دیکھتے ہوئے پیر کو آرام دینے کے لیے سہارا لیا تھا۔
 اس نے فون اٹھایا اور بات کرنے سے پہلے جیسے اس کو واضح ہدایت جاری کی تھی۔

”آپ ادھر بیٹھیں میں بتاتی ہوں۔“
 دفتروں کا یہ اسٹائل۔ معمولی معمولی باتیں بھی راز ہوتی ہیں۔ اس نے پلٹ کر ادھر دیکھا، جہاں اسے بیٹھنے کی
 ہدایت کی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگے صوفے، سائڈ ٹیبل اور صوفوں کے سامنے پچھی میز۔ اور بیٹھنے کا ارادہ
 منسل کر کے اس نے اس سے دور ہو کر شیشے پر جھولتی بلا سنڈز سے کسی بوجھ کے بغیر باہر کا نظارہ دیکھنا شروع کر دیا۔
 جالانکہ باہر کوئی ایسا دلچسپ منظر بھی نہیں تھا۔ لگتا ہے نوکری ہاتھ سے گئی۔ کسی کا تصور نہیں، حماقت بھی اپنی
 تھی۔ آپریٹر کی آواز اناستہ دم تھم تھی۔ وہ کیا پوچھ رہی تھی اور اسے کیا جواب دیا جا رہا تھا۔ آواز دھیمی نہ بھی ہوئی تو
 اسے کن سوئیاں لینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

”السلامو علیکم۔“ اس کے پیچھے ایک اور ٹائماؤس اور نرم آواز گونجی۔ ایسی ہی مشینی اور بے روح۔
 ”میرا نام پروین وسایا ہے۔ ایم ڈی کو افسوس ہے کہ ہمارا پتا تلاش کرنے میں آپ کو تکلیف ہوئی۔ وہ اپنے
 کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

ایسا بالکل فکاہ۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ اتنی عمر وہ منہ پھٹ، کھلے دل اور کھلے ذہنوں
 کے درمیان زندگی گزارتی آئی تھی۔ اب شاید اس کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانے اور تزلزل کر بولنے کی تربیت لینا
 ہوگی۔ زمانہ طالب علمی گزر گیا۔ وہ بڑی لمبے بھر کے لیے اس نے عادتاً ہی مخاطب کی آنکھوں میں دیکھا۔
 پتا نہیں کیا سائمران منٹ دکھ تھا ان آنکھوں میں کہ لمبے بھر کو اس کی روح تک کانپ گئی۔
 ”تمہیں انٹرویو دینے ضرور جانا چاہیے۔“ بھائیوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ ”ورنہ تمہیں ساری عمر خود پریشان
 رہے گا۔ میں انٹرویو دیتی تو سلیکٹ کر لی جاتی۔ اپنے اس یقین کو توڑنے کے لیے اس سے اچھا موقع پھر ہاتھ نہیں
 آئے گا۔“

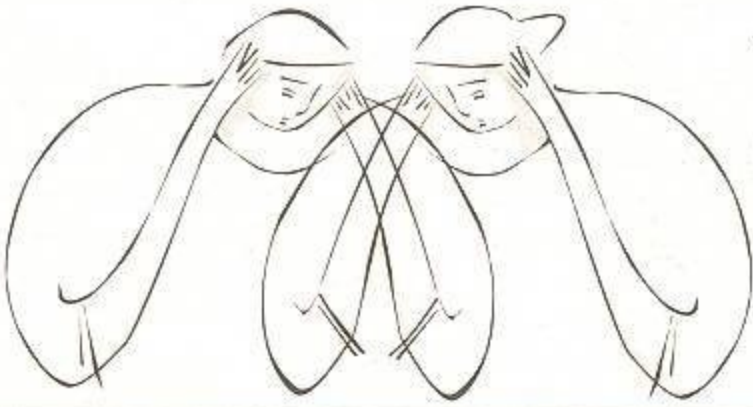
ان سب نے مل کر سوچا تھا۔ آیا جان نے بھی تائید کی تھی۔ ”کوئی زور زبردستی نہیں۔ مناسب نہ لگی تو منع
 کر کے آجانا۔“

وہ اپنے آپ کو آزمانے اس کے پیچھے چلی۔ یہاں تک ساتھ لانے والی ایم ڈی کے کمرے کے باہر اسے جھوڑ کر
 رک گئی۔ کون جانے جو اندر جاتے اس کے پر جلتے ہوں۔ زندگی میں بہت سے پروٹوکول ہیں۔ ان سے نمٹنا بھی
 سیکھنا ہوگا۔

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میز کے اس طرف بیٹھے ادھیڑ عمر کے بزرگ نے جیسے اس کو لمبے بھر میں
 مسحور کر دیا۔ سرمئی بالوں اور سفید قلموں سے مسکراتے اور کچھ سوچتے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں
 الجھائے۔ وہ اس کے بیٹھنے کے منتظر رہے۔

”میرا نام عیوب عباس ہے۔“ شاید اس کی آواز اتنی مشینی اور بے روح نہیں تھی اور اس نے یہ بھی نہیں کہا۔
 فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔ لیکن اس نے دیکھا، وہ کتنی لائق شاگرد ہے اور کتنی جلدی سیکھ رہی ہے۔
 بلا سے اس کے رزلٹ کارڈ پر سی گریڈ لکھا گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔“ انہوں نے بھاری، لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔
 ”کیسے؟“ ”ایلاقت دھری رہ گئی اور اس نے پھر ایک بے تکا سوال کر ڈالا تھا۔“



صحت کے ایسے مسائل جن پر کسی سے بات کرنے میں آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں
 اور آپ اُن کے حل کے بارے میں فکر مند ہیں؟

ان مسائل پر قابل اعتماد اور درست، حقائق پر مبنی معلومات اور ماہر ماہرین کی صحت و نگہداشت کی اعلیٰ
 اور معیاری مشاورت و خدمات کے لئے آج ہی ”بہتر زندگی سینٹر“ تشریف لائیں۔

اپنے قریبی ”بہتر زندگی سینٹر“ کا پتہ حاصل کرنے کے لئے یانید معلومات

کے لئے 24 گھنٹے مفت کال کریں 0800 22333

ابھی وزٹ کریں www.srhmmatters.org اور تربیت یافتہ، ماہر ڈاکٹر سے حاصل کریں

اپنے ہر سوال کا جواب مکمل رازداری کے ساتھ۔

بہتر زندگی سینٹر، بہتر زندگی میں پہلا قدم

0800 22333



SRHmatters.org



وہ بڑی فراخ دلی سے مسکرائے۔ ایک طویل مسکراہٹ۔
 ”وی۔ بالکل ویسا جیسا مجھے بتایا گیا تھا۔“ انہوں نے اپنی مسکراہٹ وہیں روک دی۔ ”تم عباس کی بیٹی ہو تمہاری رگوں میں ان کا خون ہے جو اس وطن کے لیے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ میں ان کا اس قدر احترام کرتا ہوں کہ تم نہ بھی چاہتیں تو تمہیں اس جگہ زبردستی بلا لیتا اور تمہاری جینز میں شامل اس خون کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تم ہمارے لیے کام کرو گی۔ ہمارے لیے اسکرپٹ لکھو گی۔“
 ان کے انداز میں سوال نہیں فیصلہ تھا۔

خواتین ڈائجسٹ 44 اکتوبر 2010

”میں نے پھر کوئی اسکرینٹ نہیں لکھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ تبدیلی اس طرح نہیں آتی۔“

”تبی سی عمر میں کام بھی کر لیا، مایوس بھی ہو گئیں۔“

”مجھے کس کام کے لیے سلکٹ کیا گیا ہے؟“

”مگر مجھے پتا چل جائے کہ تم یہاں کام پر کتنا ہو تو میں تمہیں تفصیل بتا سکتا ہوں۔ ورنہ شاید تفصیل سے آگاہ نہ کروں۔“

”یعنی پہلے مجھے ہائی بھرنی ہے۔ کام کی نوعیت بعد میں طے ہوگی۔“

”ایسا ہی ہے۔“

”میں آپ کے ساتھ کام کا وعدہ کر لوں اور آپ مجھے کہیں کہ فلاں کو قتل کر آؤ۔“

”ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کسی کو قتل کروانا ہو تو تم سے بہتر کوئی نہیں۔“

اس نے ایک نظر دفتر کے دروازے پر ڈالی۔ آفس میں گھستے ہی ارد گرد کا جائزہ لینے کے بجائے وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے نا چاہتے تھے جتنی لوگ اس کو ہر قسم کی بحث میں الجھالیتے ہیں۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا، وہ کب سوالوں کے جواب دینے میں جُت جاتی ہے نہ یہ کسی امیری ابن جی او کا دفتر تھا، نہ کوئی ورک شاپ۔ بظاہر تو دفتر ہی تھا۔ لیکن یہاں ایسا کیا ہوتا ہوگا۔ کسی چیز سے بھٹکتا بھی نہیں تھا۔ سامنے بیٹھے بزرگ کہیں سے بھی خطرناک نہیں لگتے۔ کبھی مسکراتے ہیں۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

”پھر کس نتیجے پر پہنچی ہو؟“ انہوں نے اپنے سامنے کھلی فائل ایک طرف سرکادی۔

”مجھے آپ کو جو اتن کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں اس طرح نہیں کر سکتی۔“

”میں نے جاب کے لیے نہیں پوچھا، میرے اتنے طویل مطالعے کے بعد تم کو لگا، میں نا قابل اعتماد نہیں؟ کسی کو قتل کرنے نہیں بھیجوں گا۔“

وہ چیپ رہی۔ جب آپ کسی کا چہرہ پڑھ رہے ہوں تو اس بات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں کہ آپ کو بھی عین اسی وقت اسی طرح بڑھا جا رہا ہے۔

”میں بتانا ہوں ایسا ہے پتا کہ میں اتفاق سے تمہارے بیشتر حلقہ احباب سے آگاہ ہوں۔ اعجاز سے، قیصر سے جب تک وہ واپس نہیں چلا گیا، تمہارے استاد محترم فیصل صاحب سے، رفار سنگ آرٹس والی ثریا سے، فاروق سے، جن سے تمہاری بہت پرانی دوستی نہیں، سارہ حق سے اور ان کی حقوق نسواں والی کمیٹی سے، اینڈ آف کورس حمیرا، رضا، عثمان آپ کے بہنوئی، قیوم ملک۔ ان میں سے کچھ کام میں نے صرف ذکر سنا ہے اور کچھ سے میں ملا ہوں۔“

لے کر بھر کو اسے محسوس ہوا، ان سارے ناموں میں کسی ایک نام پر اس کے تواتر سے دھڑکتے دل کی ایک دھڑکن غائب ہو گئی تھی۔

”تم سے ملنا رہتا تھا۔ حالانکہ وہی زیادہ ضروری تھا۔“

”آپ میرے بزرگ ہیں۔ پوچھنا تو نہیں، مگر یہ سوال مجھے چھ رہا ہے۔ کیا یہ دفتر محکمہ جاسوسی کا ہے؟“

”صحیح پہنچی ہو۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک طرح سے Yes جاسوسی کا لفظ بڑا بدنام ہو گیا ہے۔ علاوہ

الدین بٹلی کے زمانے میں محکمہ جاسوسی بازار کا نرغ معلوم کرتا تھا۔ فرض کیا ہم صرف یہ جاسوسی کریں، ہمارے ارد گرد بسنے والوں میں پاکستان دشمن کہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ صرف ایک ایسی لسٹ تیار کریں جو براہ راست یا بلاواسطہ طور پر پاکستان کے خلاف باتیں کرنے والوں کی ہو۔ ایسی بات جو بظاہر ہر بڑی بے ضرر ہوتی ہے اور دیکھنے میں کسی مقصد سے کی بھی نہیں گئی ہوتی۔ لیکن وہ پاکستان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

HERBAL FAMINY

ANTI-ACNE + SKIN REPAIRING FORMULA



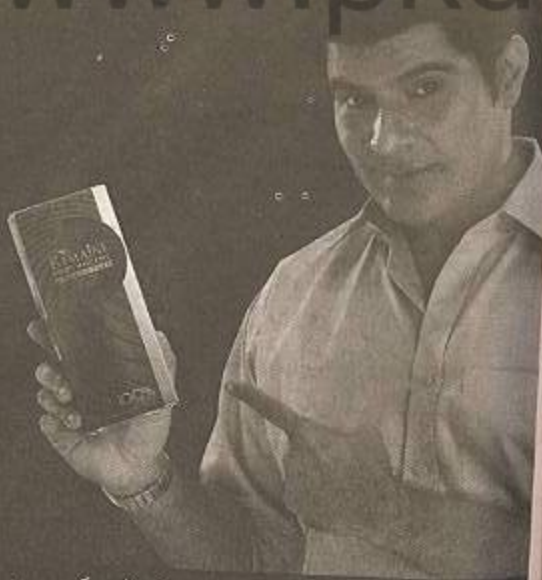
کسی بھی غیر فرس، کولڈ یا دیگر شیشک کریم میں کس کر کے روزانہ استعمال کریں اور پائیں کیل مہاسوں سے پاک کھراکھرا بے داغ چہرہ

REMAINE

صرف 15 دنوں کے اندر اندر بال گرنا بند

100%

رہین دن میں دو بار بالوں کی جڑوں میں اس طرح اسپرے کریں کہ ساری جڑیں ہلکی جائیں اور پھر ہلکا سا مساج۔۔۔ پس! رہین دن کو آئینے سے اور نہ کوئی اس کا سائڈ ایکٹ۔۔۔ ایک دم ہیڈ ریشل بال کرنے کی کوئی بھی وجہ ہو، رہین کا باقاعدہ استعمال زیادہ سے زیادہ 15 دنوں میں بال گرنا بند کر دیتا ہے۔



www.remaine.com.pk

یقین کیجئے، اب آپ کا ایک بال بھی نہیں گرے گا۔۔۔ یہ ڈاکٹر خرم مشیر کا وعدہ ہے

”اور جب ایک ایسی لسٹ تیار ہو جائے تو مجھے ان کو چن چن کر قتل کرنا ہو گا؟ بات یہ ہے سر! میں نے سیکسٹرز (نوجوانوں) میں ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں جن کا کما میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن بزرگوں سے میرے بڑے اچھے مراسم رہے ہیں۔ وہ مجھے بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ لیکن آپ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔“

”لیکن میں نے تو سنا ہے، تمہیں ایسی ابھی باقی بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”میں ایک گناہم، سستی ہوں۔ اتنا کچھ آپ نے میرے بارے میں کہاں سے سن لیا؟“

”اس کو چھوڑو۔ اب ذرا سنجیدگی سے بتاؤں، میرے پاس جاب نہیں ہے۔ جاب کے لیے تو تم نے اپلائی بھی نہیں کیا تھا۔ لہذا توقع بھی نہیں کر رہی ہو گی۔ ہم یہاں ریسرچ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ریسرچ کا موضوع اور Method (طریقہ) تم کو اچھا لگتا ہے تو شروع کر دیتا۔ لیکن اس دوران کوئی اچھی جاب کی آفر آتی ہے تو تم جاسکتی ہو۔ کمپنی تمہارے مستقبل میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ میری اس فرم میں سو سے کم لوگ ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی غیر معمولی نہیں۔ ہر ایک اپنے اندر غم لے کر یہاں آتا ہے۔ کوئی سسٹم سے دکھی ہے، کسی کو ذات سے دکھ پہنچے ہیں، بنیادی طور پر تو ہم ہلپ (Polp) تیار کرتے ہیں، لیکن غم چونکہ لکھنے پڑھنے والی لڑکی ہو، اس لیے تم رپورٹ تیار کرو گی۔ ریسرچ رپورٹ۔ لیکن اس میں ہمیں خانہ پری نہیں کرنی۔ کام کے ساتھ دیانت داری چاہیے۔ ہمیں کسی قسم کی غیر ملکی فنڈنگ حاصل نہیں۔ ہم اپنے ہی پرافٹ سے یہ کام کریں گے۔ کچھ ادارے ہمارے ابھی بھی قابل بھروسہ ہیں، ہو سکتا ہے ہمارا کام کسی کام آئے اور وہ ہم کو معاشی طور پر سپورٹ کر لیں۔ سو ہم تمہیں بہت شاندار پیشکش تو نہیں دے سکتے، لیکن تمہارا نقصان نہیں ہونے دیں گے۔“

”اس کا فیصلہ اپنے ابا سے اجازت لینے کے بعد کر سوں گی۔ جو کچھ آپ نے کہا وہ سب میں آیا لو بیٹاؤں گی۔“

”ہاں، ضرور، اگر سب کچھ اپنے والد کو بتا دیا جو میں نے بتایا ہے تو مجھے یقین ہے وہ مانگیں گے۔ سو کام کی بات کو ہم لیتے ہیں۔ جتنی دیر ہم چائے پیس، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔“

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ ”میں اپنے بارے میں بس اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آپ نے مجھے بتایا۔ میں آپ کو کیا کہہ کر ملاؤں؟ آپ کی تو اولاد نہیں تھی۔ اس لیے آپ نے مجھے بیٹی کہہ دیا۔ لیکن میں اپنے ابا کی جگہ کسی کو بھی نہیں دے سکتی۔“

”ہا، غلط سمجھا۔ میں نے کہا تھا، میری بیٹی نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا تھا اولاد نہیں ہے۔ ویسے بھی کچھ لوگوں کی جگہ کوئی لے بھی نہیں سکتا۔ میں اس وقت کے لیے دعا کروں گا جب تم مجھے ابا مان لو۔ کہو بے شک مت۔“

اتنی دیر کے ماحول میں تناؤ کے بعد وہ خوش دلی سے ہنس پڑی۔ ”آپ کی دعا ضرور پوری ہو گی۔ کیونکہ روایت ہے کہ جب آپ کسی کے لیے ایسی دعا کریں جس میں آپ کا کوئی مفاد نہ ہو تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔“

اس نے ان کی محبت مدد کے عقب سے چمکتی آنکھوں کو یکدم بجھتے دیکھا۔

”لیکن مفاد تو ہے میرا، کیا یہ دعا اب قبول نہیں ہو گی؟“

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ مفاد کی بات بھی ابا کو بتانی ہو گی۔

جب او اس آنکھوں والی لڑکی اندر آئی۔ وہ اس وقت تک چپ تھی۔ او اس لڑکی جس نے پشت سے آواز دے کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ جس کے لیے میں ایک زہریلی تنہی تھی۔ جیسے مٹھاس بھری آواز میں کسی نے تنہیوں کا زہر گھول دیا ہو۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی۔ مختصر رہی کہ چائے بنانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ چلی جائے۔ پھر خود ہی ٹی کوڑی اٹھا کر چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔

”تمہیں شاید اس چائے کی عادت نہ ہو۔ لیکن اس نے مجھے چینی سے ہٹا کر گڑ پر لگا دیا ہے۔ مجھے بھی اب گڑ کی

چائے اچھی لگنے لگی ہے۔ تمہیں اچھی تاہم بھی لگی تو دوسرا سمجھ کر ناک بند کر کے پی جانا۔“
اس نے کرسی پر بیٹھ پھل پلا۔ ایک دن لڑکی چائے پینے سے یقیناً ”موت“ واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کون سا
نظام ہے کہ آپ کو لڑکی چائے کا شہ ہے تو مہمان بھی ضرور ہی بیٹھ۔
اس نے سہلا گھونٹ بھرا تو جیسے کسی نے اس کا حلق ٹھکی سے صحت نکالا ہوا۔ چائے اس حد تک میٹھی تھی کہ
کڑوی لگنے لگی۔ اس نے خاموشی سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی چائے بھی دیکھی تھی جیسے اس کی آواز۔
دوسرے گھونٹ میں اس کو ادراک کا مزہ آیا۔ تیسرے میں دارجینی کی مسک اگر یہاں کام کے سلسلے میں مرزاؤ
کنڈیشن طے ہوئیں تو وہ یہ شق ضرور شامل کروائے گی کہ یہ شک اس کا کوئی الاؤنس ضبط کر لیا جائے، لیکن اس
ملغوبے کو پینے پر اس کو مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ شاید تعریف کی منتظر۔
”ہمت اچھی چائے ہے“ تھینک یو۔“ اس نے اس کو دو جملوں میں منٹا چاہا۔
”لیکن آپ نے گھونٹ لیا تو آپ کے چہرے سے لگتا تھا کہ آپ چرافتہ پی رہی ہیں“ آپ نے کبھی چرافتہ پیا
ہے؟“

اس کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔ جیسے اسے یقین ہو، اس کا مخاطب قطعی لاعلم اور جاہل شخص ہو۔ اس نے
خاموشی سے نفی میں سر ہلادیا۔
”کبھی دھوئیں میں پکا کھانا کھایا ہے؟ کبھی ایلے تھاپے ہیں؟ کبھی گھر کے ہوتے بھی آپ کے ماں باپ نے
آپ کو در بدر کیا ہے؟ کبھی قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں؟“
وہ ہر اسال ہو گئی۔ میرا قصور؟ بے شک یہاں کے لوگ دیکھی ہوں گے مگر ان کے دکھوں میں میرا حصہ تو نہیں۔
کیا یہاں پر انٹرویو کے لیے آنے والے کا استقبال ایسے ہی تلخ کلامی سے کیا جاتا ہے؟ چائے کی خوشبو تو پلٹ
کر جا چکی تھی۔
”یہ مت سمجھنا میں نے یہاں سب کو سرچرھا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں کو میں بطور خاص رعایت دیتا ہوں۔“
اچانک ان میں افسرانہ تنک مزاجی نے سراٹھایا۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھر کے کھڑی ہو گئی۔ یہ تنک مزاجی
جتنی ضرور تھی۔

”پتا نہیں میں بھی ان میں شامل ہوں گی یا نہیں۔ لیکن اس لہسن اور کدو والی چائے کا شکریہ۔“
وہ اس کے ساتھ اٹھ کر باہر آگئے۔ معلوم نہیں وہ ہر ملازم کو اسی طرح رخصت کرنے دروازے تک آتے ہیں
یا وہ بھی ان میں سے ہے جن کے لیے بطور خاص رعایت ہے؟ کیوں ہے مگر؟
”نن تعمیر سے بھی کچھ دلچسپی ہے تم کو؟“ ایک قطار میں بنے بے حد دلکش گھروں کو دیکھتے انہوں نے کہا۔
”ہمارے ہاں فنکار بھی بہت ہیں، چور بھی، ہمارا اور بجٹل فنکار منگے۔ لیکن چور سستا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مال کو
لاٹھیوں کے گز پٹپٹا ہے۔ کون سی تعمیر آپ کو پسند ہے؟ پورچین، اپنیش، جرمن؟ غرضات میں کسی کا بڑی محنت
سے بنا گھر ایک ہٹا دس قیمت پر اس سڑک کے کنارے تعمیر ہو سکتا ہے۔ اس غریب کو ہاں بیٹھے پتا بھی نہیں کہ وہ
ظفر علی روڈ پر شفٹ کر گیا ہے۔ قدیم زمانوں میں پھر نیکی بدی کا رواج تھا۔ ٹھک بھی اپنی بستیاں الگ بناتے تھے۔
آج کے ٹھک درمیان میں بڑے فطنت سے رہتے ہیں۔ یہ جو سامنے عظیم الشان محل دیکھ رہی ہو، یہ اس وزیر کا
ہے کہ جب افغانستان میں جہاد ہو رہا تھا یہ طور خم کے راستے بے روک ٹوک ہیروئن درآمد کرتا تھا۔ کچھ کو او جزی
کیمپ کے حادثے نے ارب پتی بنا دیا۔ کچھ اس سے بھی پہلے مسلمانوں کو پچل کر انگریز کی وفاداری میں ملیوں پر
پھیلی اراضی کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یاد رکھو، امیر آدمی میرے اور آپ کے خون کی قیمت پر امیر ہوتا ہے۔ اور اپنی
دھاک دینا بھر پر جاتا ہے۔ آج عزت پیسے کی ہے۔ نہ وہ کسی کو پوچھنے کی جرات دیتا ہے، نہ کسی میں ہمت ہے کہ

اس سے پوچھتے۔ جس جس نے ایسا پیہہ اکٹھا کیا، اپنے گرو ایک حصار بنا لیا خود کو ناقابل پریش سمجھ کر۔ ہم بھی
پیسے کی پریشانی کرنے والی قوم بن گئے۔ ہم تو بڑوں نسل تھے۔ لیکن تم بڑے لوگ ہو۔ جو ہم نہیں کر سکتے، تم کرو گی نا؟“
وہ اس طویل سڑک پر پتا نہیں کب سے چل رہی تھی۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ اور وہ بار بار منتشر ہوا تھا۔ کہیں
کوئی منزل بھی ہے یا بے سمت سفر جاری رکھنا ہے۔

”ظلم کا کہیں کوئی خاتمہ نہیں۔ ہم نے انگریز کے عہد میں ظلم سے آزادی کی آس میں۔ آزادی ملی تو چند ہی
برسوں میں ہمیں لگا ہم آزاد نہیں ہوئے، بس ہمارے آقا تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہ انگریز ہی کی طرح ہمیں لوٹ
کھسٹ کر رکھاتے رہے۔ ان ہی کی طرح ہندوؤں کے زور پر حکومت کرتے۔ آواز اٹھانے پر قلعوں میں قید کیے
جاتے۔ سختیاں سستے سستے مرجاتے۔ جو کوئی ایک آدھ سخت جان بچ کر نکل آتا۔ وہ چپ چاپ وطن چھوڑ کر پردیس
میں جا بیٹا۔ پھر کوئی دوسرا آجاتا۔ ہم بھولے بھالے تبدیلی کی آس میں اس کے پیچھے لپکتے۔ خواب دیکھتے۔ لیکن
سب ایک سے تھے۔ کوئی جاہل تھا۔ کوئی آمر تھا تو کوئی مغرور۔ درمیان میں کوئی بھلا آجھی گیا تو ہم نے بڑی سہولت
سے اس سے نجات حاصل کر لی۔“

وہ چل رہی تھی اور فقرے اس کے کانوں میں گونجتے جا رہے تھے اور جب واپسی پر اس کا گھیراؤ کیا گیا کہ اپنی
زندگی کا پہلا انٹرویو دے کر آئی تھی اور بڑی اہم ہو گئی تھی تو اسے لگا اس کے پاس کتنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ گم غم
سی ان کے پیچھے بیٹھی رہی۔ سب اس سے تباہ توڑ سوال کر رہے تھے۔
”انہوں نے کیا پوچھا تھا؟“
”تم نے کیا جواب دیا۔“
”اس کا کوئی یہ جواب ہوتا ہے۔“
”انٹرویو میں کوئی ایسے پوچھتے ہیں؟“

وہ جیسے جرم کر کے آئی تھی۔ سب اس کو گھیرنے میں لیے بیٹھے تھے۔ کبھی سوال عثمان کی طرف سے آتا تھا۔
کبھی حمیرا کی۔ درمیان درمیان میں اماں بھی مختصراً کچھ پوچھتی تھیں۔ تماشا دیکھنے کو تو بڑی تانی بھی آئی تھیں۔
بے شک سوال ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔
”تم انٹرویو دیتے نروس ہو گئی تھیں بیٹا؟“
وہ جب اماں کے لیے شام کی چائے لے کر گئی تو انہوں نے اپنے مخصوص رمان سے پوچھا تھا۔
”نہیں تو اماں! لیکن جنہوں نے میرا انٹرویو کیا وہ عجیب سے تھے۔ کچھ مختلف سے اور وہ انٹرویو بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ
میرے ارد گرد رو رہے والے سب لوگوں کو جانتے تھے۔“

”مثلاً؟“ اس کو جانتے تھے۔ کہ میری کو؟ آپ کی بڑی تانی کو؟
”نہیں۔“ اس نے بغیر مسکرائے اپنی مخصوص سیٹی پر بیٹھتے کہا۔ ”آپ کو دادا کو، میرے حلقے میں میرے
سارے دوستوں کو۔“
”عمو! کمپنی جب کسی کو رکھنا چاہتی ہے تو اس کے بارے میں مکمل معلومات کر لیتی ہے۔ اگر ان کو معلومات
تھیں تو اس کا مطلب تم رکھی گئیں اور بڑی بات ہے کہ اپنے بھائی اور دیگر لوگوں کی طرح جاب کے لیے کئی سال
دھکے نہیں کھانے پڑے۔ جہاں تک میں نے پتا کروایا ہے، وہ ایک پیرل ہے۔ تمہیں کس چیز کی آفر دی گئی۔“
”انہوں نے کہا ہے، یہ مستقل جاب نہیں۔ کوئی ریسرچ پروجیکٹ ہے۔ کچھ لکھنا ہو گا۔“
”تو کام تم کو پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں کرنا ہو گا۔“
”پتا نہیں۔ میں نے ان سے کہا میں اپنے آپ سے اجازت لینے کے بعد جواب دوں گی۔“

NEW TOUCHME®
Minto
Calcium+Fluoride Toothpaste

ٹوٹھ پیسٹ وہی اچھا جو کام دکھائے

اب نئی دلکش پیننگ
میں بھی دستیاب ہے



ٹوٹھ پیسٹ

Extra Whitening

www.mgcpakistan.com

”ایمانی اجازت سے چلو گی تو اپنے فیصلوں پر اعتماد کیسے کرو گی؟ الباب تک ساتھ چلے گا؟“
وہ اندر سے کانپ گئی۔

”مشورہ ضرور کرتے ہیں بیٹا! لیکن پھر فیصلہ خود کرتے ہیں اور انجام اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔“
”وہ مجھے جانتے ہی آپ کے حوالے سے ہیں۔ دوسرا میرا تھپڑ پلے جس کا اسکرپٹ انہوں نے ریجیکٹ کر دیا کہ اس میں بہت خامیاں تھیں۔“
”وہ تو ہوں گی ہی۔ اس کے لیے عمر کا تجربہ چاہیے۔ لیکن تحریر ناپسند کر کے پھر تحریر کے شعبے میں رکھ لیا۔ وجہ؟“

”آپ کی وجہ سے۔“
”لیکن میں تو تمہارا کام نہیں کروں گا۔ تم اپنا کام خود کرو گی اور یاد رکھنا میں نے کسی سے تمہاری کوئی سفارش نہیں کی۔ جارہی ہو پھر؟“



قیصر کے چلے جانے کے بعد ان کے چھوٹے سے دفتر میں ہونے والا معمولی سا کام بھی بند ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے ضروری سمجھا۔ کم از کم آغاز کو آگاہ کر دے کہ اسے کام مل گیا ہے۔ البتہ وہ جب بھی دفتر کو از سر نو کھولنے کا ارادہ کرے۔ آغاز نہ بتایا کہ وہ خود بھی رزلٹ کے بعد سے دھکے کھاتا پھرتا رہا ہے۔ کسی مناسب اور اچھے روزگار کی تلاش میں یا گزارہ اور قابل پروا اشت روزگار ورنہ جو ہے اور جیسا ہے رزق۔ ایک بات سے کیا کیا بات اس کے ذہن میں سرسرا رہی تھی۔ سارہ حق بھرے پیٹوں کو پلیٹ میں رکھ رکھ کر روزگار پیش کرتی پھر رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنے اس شدید مداح کے لیے جس نے سولہ سال گھر والوں کے خون پیسے کی کمائی سے پرہیز کر کے لیے تھا کہ کسی قابل ہو کر قرض میں جکڑا ان کا بال بال رہا کر سکے۔ کسی قسم کا صلہ نہیں نکال سکتیں۔
”ایک تو ہماری نئی نسل تن آسان بہت ہے۔ کوئی کیا کر لیا کام ان کو پکڑا دے۔ محنت کرو اپنے لیے روزگار خود ڈھونڈو۔“

ان دنوں ان کا گراف بہت بلند تھا۔ وہ ہر وقت ٹی وی پر بیٹھی اس حکومت پر گرجتی برستی رہتی تھیں جس کے تخت کے پائے ویسے ہی لرز رہے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو گرجتی بڑی دیوار کو دھکا دینے زور شور سے ڈٹ جاتے ہیں۔ باریوں کو ہر وقت شہیدوں کا خون درکار رہتا ہے۔ انگلی تو وہ بھی کٹوا لیتی تھیں۔ ایسے لوگ کس پارٹی میں جائیں گے فیصلہ عموماً ”یکشن“ کا نتیجہ آنے کے بعد کیا جاتا ہے یا انتظار کہ کب کوئی شب خون مارتا ہے۔
قیصر چلا گیا۔ پتا نہیں وہ پچھڑے ہوؤں کھاد بھی کرتا تھا یا نہیں۔ دو سال ہر وقت ساتھ رہتے لگتا وہ یو پی زندگی بھر ساتھ ساتھ جدوجہد کرتے رہیں گے۔ لیکن جب جب اپنی زندگیوں اور ناکامیوں کی طرف پلٹے تو پچھڑے ساتھی ہوا اسے اڑتے خشک تپتے کی طرح کہیں سے کہیں جا نکلے تھے اور کون جانے وہ بڑھاپے میں ان لوگوں کا نام یاد کرنے بیٹھے جن کے نام کے بغیر زندگی ادھوری تھی اور حافظہ ساتھ نہ دے۔

ان دنوں اس کو گھر میں بھی گھبراہٹ رہتی تھی۔ جیسے ہر طرف مایوسی کی فضا ہو۔ تو یہ جب سے آئی تھی صرف ایک دفعہ کہیں باہر گئی تھی۔ کہاں اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ کبھی پلیٹ کر اپنی نوکری کی طرف بھی نہیں گئی بڑی سہولت سے وہ اپنے Explanation لے کر وصول کرتی اور بھول جاتی۔ سارا دن اس کا گھر کے دروازوں کی کندیاں چیک کرنے میں مصروف گزرتا۔ پھر بھی اسے شک ہوتا ابھی یہاں کوئی کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا تو پیچھے سے کسی نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ خوف سے سنا ہوا پیلا چہرہ لے کر وہ پلٹتی۔

”کوئی نہیں پہلے“۔ ”چچا عبدالعزیز اپنا حقہ چھوڑا بارود اڑے کی طرف دیکھ کر آتے۔“ وہم پہلی ہی! تمام وقت شیشوں پر پردے کرے رہتے۔ وقفوں وقفوں سے وہ پردے سرکا کر شیشے سے تاک نکال کر باہر جھانکتی۔ پھر جیسے کسی کو ہاں یا کر جلدی سے پردے برابر کر دیتی۔ تیزی سے پلٹ کر اپنی بیٹی کو دھونڈتی اور اچھی جھکی ہنستی کھیلتی بیٹی کو چھپت کر گھومیں۔ بٹھالتی۔ یہ شہر تو تھ اندھیرے میں گمراہ دیتی اور کسی قیمت پر کسی ڈاکٹر کے پاس جانے پر آمادہ نہیں تھی۔

شہر پر چند دن کے لیے آیا تو اس کے لیے وہ اس اور گھر والوں کے لیے بد امتیاز تجویز کر گیا۔ یہ سب سے سخت وقت تھا اور ان کو ہر حال اس سے گمراہی تھا۔ شہر پر کا خیال تھا اس کے توہمات کو توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے بحث مت کرو۔ لیکن اس سے اتفاق بھی نہیں کرو۔ بس چپ چاپ سن لو تو جہے۔ ہمدردی سے نہیں۔ البتہ گریبانے مانوس ہونے میں بہت وقت نہیں لیا تھا۔ وہ بیٹا کی طرح چپ چپ کر گھر بھر میں کد کڑے لگاتے پھرتی تھی۔ خاموشی سے ماں کی شکل دیکھتا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے دھرم آبا کے کمرے میں گھس گھس گھس گھس کر کسی مرغوبیت کے کہ وہ کچھ لکھ پڑھ رہے ہیں یا بیوی دیکھ رہے ہیں، آجک کر اسٹول پر بیٹھ جاتی اور لائیبیری سوا لوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ وہ بھی اس سے کبھی رنج نہیں ہوتے تھے۔ ساری شام اس کی خالہ کے ساتھ برف پانی پھیلنے گزرتی۔



شہر پر اطلاع آیا اور ہمیشہ کی طرح چونچال موڑ میں نہیں تھا۔ فوجی ہونے کے ناتے اس کی بار بار پوسٹنگ آتی تھی۔ تبدیلی کا خیال اسے تنگ کرتا تھا۔ وہ کسی جگہ مانوس ہونے لگتا کہ اسے بدل دیا جاتا۔ زندگی میں اس نے اس قدر گھر بد کے تھے کہ ثابت کا تصور اس کے لیے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ پچھلی دفعہ آیا تو اطلاع لایا تھا کہ عقیقہ اس کا واندہ پانی وہاں سے اٹھا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دفتری معاملات کا بہت تفصیل سے ذکر نہیں کرتا تھا۔ اسے گھر ساندہ اترنے کے بعد وہ میانی صاحب گیا۔ اسٹاک کے مزار پر فاتحہ کے بعد وہ سیدھا 80F گیا۔ شاید یہ 80F کی تازہ ابھرتی تھیں جس نے اس کو رنجیدہ کر دیا۔ یا کون جانے وہ گھر سے کس ملال میں گرفتار چلا تھا۔ آخر یہ گھر ہے۔ یہاں خوشیاں بھی اترتی ہیں رنج بھی۔ بعض گھروں کا تصور ہمارے ذہن میں پرانے اسکول کی چھٹی بن جاتا ہے۔

”خیر کا یہاں آنا“ عیب کی معمول سے ذرا لپٹ میل سے وصول ہوا تھا۔ اس نے بہت تفصیل سے نہیں لکھا تھا۔ لیکن کسی سے چھپا نہیں تھا کہ اس کو واپسی کسی خوش وقتی کی دلیل نہیں تھی اور آخر ایک دن اس کو واپس آنا ہی تھا۔ انہوں نے کبھی ایک دوسرے سے لفظوں سے اس اندیشے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے کسی دن انہیں ایک ایسے دن کا سامنا کرنا ہو گا۔ معلوم نہیں وہ دن خوشگوار ہو گا یا ناخوشگوار۔ گھر پر ہی یہ لمبی کمائی اس کو اس کی امی نے سنا دی تھی۔ اب اس کمائی میں کتنا تنگ مرچ تھا اور کون کون سے بھگوار لگائے گئے؟ وہ اندر کی حقیقت سے بہت زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ وہ یوں بھی واقعات کی باریکیوں میں نہیں جاتا تھا۔ اگر اس کی واپسی ایک خوش کن امر ہے تو سب کے ساتھ مل کر خوش ہو جائے گا ورنہ ان کی اداسیوں میں حصہ بنالے گا بس۔

”نائلہ کی بیٹی ہے آخر۔“ سرال کے ٹینوے پر پاؤں رکھ کر حکومت کرے گی اور نہیں ملی حکومت تو چھوڑ کر آ گئی گھر۔ خود ہی تو یہاں کیا تھا۔ بیٹی کے مستقبل کا بھی سوچا۔ سرال میں تو سو سو باتیں ملتی ہیں سننے کو۔ نائلہ بی بی نے یہ تربیت تو نہ دی بیٹیوں کو۔ بی اے ایم اے کروادیا۔ سرکول پر لیتی پھرتی گی تو کیا خاک کھڑے سائیں گی۔“

اپنے جملے کے اختتام پر انہوں نے ایک اچھتی سی نظر بیٹے پر ڈالی۔ تربیت کا نقص تو انہوں نے نکال دیا تھا۔ درپردہ جو پیغام انہوں نے دیا وہ پہنچا بھی یا نہیں۔ ان کا دل جلا کر رکھ کر نے میں تو باپ بیٹے کو کمال حاصل تھا۔ وہ ان کے سامنے بیٹھا چپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا۔ ان کی ادھوری سی لمبی ٹوڑی کہ اتفاق نہیں کیا ان سے تو اختلاف بھی تو نہیں کیا۔ سر نہ کانے اپنے جتنے بوٹوں پر نظر جمائے کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔ کہاں پہنچا ہوا تھا۔ وہ ماں تھیں۔ بے خبر نہیں تھیں۔ لیکن با اختیار بھی نہیں تھیں کہ اس کی سوچوں کو لگام دیتیں۔ کہاں سے لائیں وہ لفظ جن میں تاثیر ہو۔ ان کی توقع کے عین مطابق ملک کا آخری کھونٹ بھرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا پہلا سامنا گھر بھر میں چھائے سکوت سے ہوا۔ وہ گھر جس کے دروازے پر لوٹے تھے۔ ایک چائے کو اسے لگا گھر میں کوئی ہے ہی نہیں پھر اس کی نظر تائی نائلہ پر پڑی۔ خلاف معمول ان کے ہاتھ میں تاول کے بجائے اون سلاکیاں تھیں۔ وہ غالباً ”گڑیا“ کے لیے کچھ نہ رہی تھیں۔

عثمان اندر سے آیا تو بہت بلاش نہیں تھا۔ امی نے عیب اور تنویر کے بازار جانے کی اطلاع دی۔ بڑی تائی اپنی سالانہ ٹرپ پر اپنے کسی اور رشتے دار کی طرف منتقل ہو چکی تھیں۔ وادی اماں اندر تھیں اور اماں اپنی اسٹڈی میں۔ وہ ایک ایک ٹوڈھونڈا کمرہ کمرہ پھرا۔ کتنا عجیب تصور تھا۔ اسے لگایا کہ گھر نہیں ایک جتنا انکار ہے۔ جسے کسی نے بانی کا چھینا مار کر بھجا دیا ہے۔ جس گھر میں ہمہ وقت زندگی گونجتی تھی۔ ایک حادثے اور اس کے اثرات نے اس کو سناٹے میں گم کر دیا تھا۔ ہر کیف سمجھ دار لوگ ہیں اس حادثے سے بھی نکل آئیں گے۔

وہ عثمان کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ ڈسکشن کا کوئی ریپیٹ کیلی کا سٹ دیکھنے لگا۔ الیکشن سر پر تھے۔ لیکن بہت ہی کم لوگ ووٹ دینے کے موڑ میں نظر آتے تھے۔ دھڑا دھڑ قانون سازیاں ہو رہی تھیں۔ سپریم کورٹ سے فیصلے لیے جا رہے تھے کہ کل کس نے دیکھی ہے۔ سب پاکستانیوں کی طرح جن کی رائے کی کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی، وقفوں وقفوں سے وہ بھر کی آواز کے ساتھ ان کی رائے آتی اور گم ہو جاتی۔ یونی ہم بھی کبھی چپ کا ظلم توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حتی کہ عیب اور تنویر واپس ملیں۔ بیٹی کے ہاتھ میں قد سے بڑی گریا تھی۔ وہ جوش میں چیختی چلاتی داخل ہوئی۔ ایک اجنبی کو اپنے ماموں کے پاس بیٹھا دیکھ کر غصے کی طرح چیختی آواز میں شور مچاتی دوڑنے لگی۔ سب مردہ نگوں میں جیسے جان پڑی۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

بازار میں کیا کیا دیکھا۔ کیا لکھا یا اور کیا خریدا؟ اس کے پاس ساری رپورٹ تیار تھی۔ تنویر چپ چاپ شہر پر کے پاس جا بیٹھی۔

عیب نے تھیلوں کا ڈھیر میز پر رکھتے نووارد کی طرف دیکھا۔

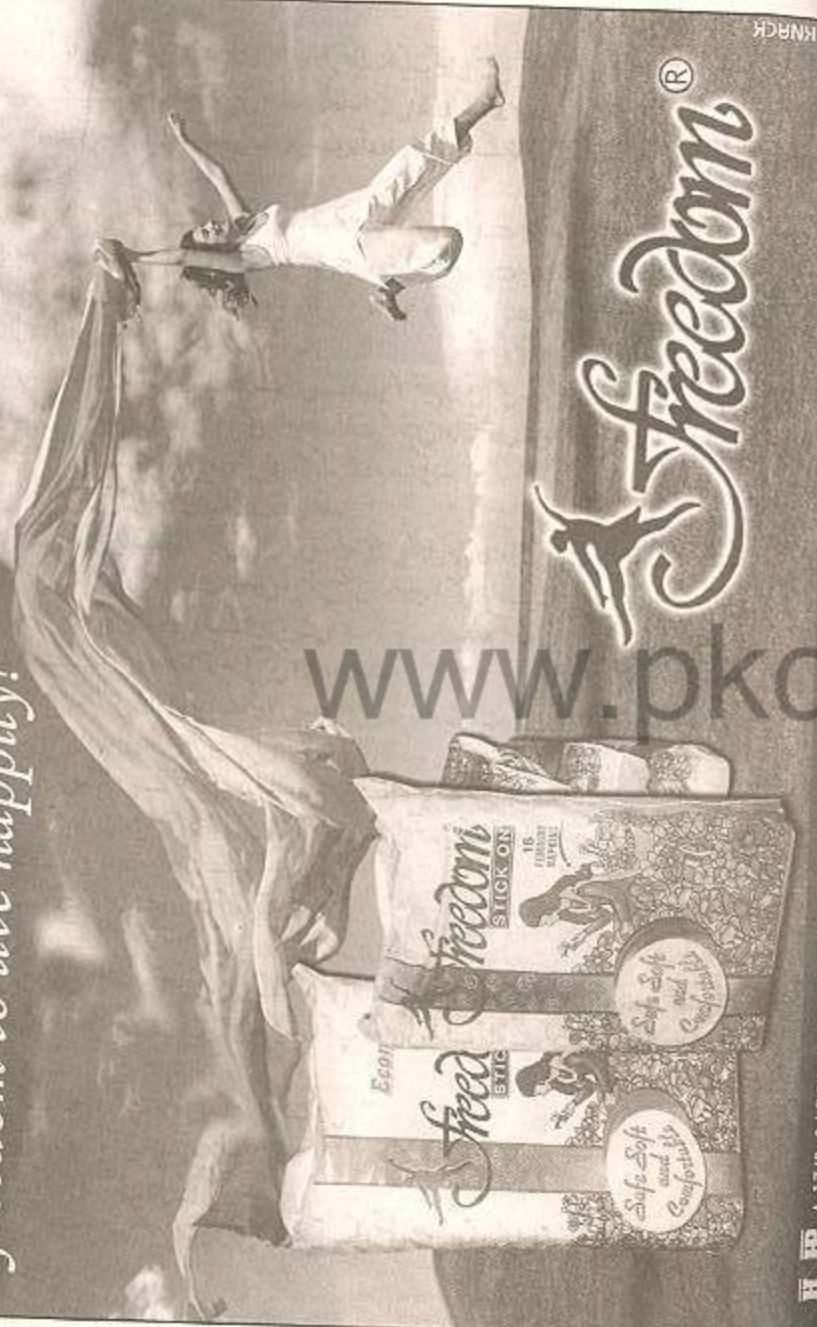
”تم کب کے آئے ہوئے ہو؟ اور تاتے کیوں نہیں آئے کا؟“

شہر پر نے لمحے بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بالکل مختلف رنگ تھا۔ ایسا رنگ جو اس سے پہلے اس چہرے پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے توجہ تنویر کی طرف کر لی۔ جو صوفے کے ایک کونے میں مکی خائبہ باغی سے اپنی بیٹی کو اپنیوں میں گھل مل کر چمکتا دیکھ رہی تھی۔ بہت ظلم کیا اتنے فاصلوں میں رکھ کر۔

وہ اس کو کیا جواب دیتا۔ وہ آنے کا کیوں نہیں بتاتا تھا اور کیسے اسے سمجھاتا اس کے چہرے کا کوئی رنگ اس کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہا۔ وہ جو ابھی بہن کے ساتھ باہر سے آئی تھی۔ اس کے چہرے پہ کیا لکھا تھا۔ شاید وہ لفظ لفظ نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن ہر مفہوم سے آگاہ تھا۔

اس نے آنے کا کیوں نہیں بتایا؟ یہ بھی اب بے معنی لگنے لگا تھا۔

freedom to live happily!



KNACK

®

freedom

HP

A-17/B, S.I.T.E Karachi-75700, Pakistan. Ph: 2562570-2560911, Fax #: (92-21) 2562570-2560911, e-mail: freedomhlp@yahoo.com



عمید نے اپنا کمرہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن اپنی چیزیں ابھی وہاں سے نہیں ہٹائی تھیں۔ اس کو گمان گزرتا تھا وہ ضرور پلٹ کر واپس چلی جائے گی کہ اس کو اپنے شوہر سے خوفناک قسم کا عشق تھا۔ تمام تر خامیوں سمیت اس کے لئے ایک ایک لفظ پر ایمان کی طرح یقین بھی۔ کتنی مرتبہ اس نے حمیرا اور اس تک اپنے شوہر کے بے معنی احکامات پہنچا کر دل آزادی کی تھی۔ کتنی معصومیت سے وہ خواہش مندر ہتی کہ وہ سب کے سب اس کے شوہر کی اسی طرح تابعداری کریں جیسے وہ کرنی آئی ہے۔ گواہ اس کے دل میں کوئی غبار نہیں رہا تھا۔ اور ایسے میں روٹھ کر آجانا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا لیکن واپسی کے راستے بند کر کے آنا اس کی سمجھ سے بالا تر تھا اور کیا جانے جو پھر کسی دن اس کے من میں سائے اور پھر اسی راستے پر پلٹ جائے۔

اگر اس نے اس کو تنہائی میں روئے نہ دیکھ لیا ہو تا تو اس کی اذیت سے کبھی آگاہ نہ ہو پاتی۔ کیا تھا اگر سب کے درمیان بیٹھ کر حرف حرف بول دیتی۔ کیا اس پر اعتبار نہ کیا جاتا۔ لیکن پتا نہیں ہم سب ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اکٹھے بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن مل کر رو نہیں سکتے۔ انسان اپنا اپنا دکھ الگ الگ تالوں میں محفوظ دوسروں سے چھپاتا پھرتا ہے۔

کتنے دن تو وہ اسی لباس میں پھرتی رہی جس میں اٹھ کر آئی تھی۔ عمید کی وارڈ روپ کھلی تھی، سامنے تھی۔ ایک آدھ جوڑے کے سوا اس نے کوئی سوٹ بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ کہہ مے نے تو اس خیال کا بھی کئی دفعہ اظہار کیا کہ ”چل کر اس کے گھر سے اپنے کپڑے جوتے لے آتے ہیں۔ ہماری استعمال کی چیز ہے۔“ ہر مشکل کام آسان کر دیتا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لیکن وہ نہ بازار جانے پر آمادہ ہوتی نہ گھر کے گھر کے نام سے تو اس کی رعیت پہلی پڑ جاتی۔ حتیٰ کہ اس دن آبا نے گیری کے عین درمیان کھڑے ہو کر ذرا سی بلند آوازیں جیسے کسی کو مخاطب کیے بغیر اعلان کیا تھا۔

”تویر کو بازار لے کر جاؤ اور اس سے کوئی اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر آئے۔“

ایسا احکامات بہت ہی کم صادر کرتے تھے۔ لیکن جب وہ صدمہ دے دیتے تو اس میں کسی چوں چراں کی گنجائش نہ ہوتی۔ اماں تک تابعداری سے کھڑی ہو جاتیں۔ اتنے دن سے سستی کرتی تھیں کام چوری کرتی تویر جیسے معمول کی طرح ابھی اور عامل کے پیچھے بے آواز چل پڑی۔ کتنے دن گزر گئے کہ اس نے یوں کھلے آسمان کے نیچے کھلی فضا میں سانس نہیں لیا تھا۔ باہر نکلنے کے تصور سے خوف زدہ تھی۔ رکشہ گھر سے باہر تو کھڑا نہیں تھا۔ وہ بیدل چلنے کی عادی نہیں رہی۔ یا یوں کھلے عام چلنے سے کترا رہی تھی۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ لیکن جتنی دیر ان کو رکشہ نہیں ملا وہ پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھی جیسے اس کے پیچھے مسلسل کوئی آ رہا ہو۔ جانے خواہش مند تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آئے یا خوف زدہ تھی کہ کہیں اس کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا۔

گڑیا جیسے اس ساری فضا سے ایک دم بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کا بچپن جواں بیٹی نے مل کر مار ڈالا تھا از خود ہی بیدار ہو گیا۔ وہ فٹ ہاتھ سے چھلانگ مار کر نیچے اتر آئی۔ گھاس پر پھد کتے کسی بڑے کو دیکھنے کے لیے رکوع میں جا کر ٹھہر جاتی۔ رُک کر نہایت دلچسپی سے درختوں کے کوئوں کو دیکھتی ہاتھ چھڑا کر کسی مرنے والے کے پیچھے بھاگ پڑتی۔ عمید اس کو گھسیٹ کر واپس نہیں لاتی تھی۔ رُک کر اس کا انتظار کرتی۔ اس کا حق تھا بچپن کے مزے لوٹنے پہلی مرتبہ تو اس کے اندر کا بچہ جاگ تھا۔ وہ دور کھڑی اس کے اندر اپنا آب و ہوا دیکھتی تھی۔

”رکشہ بھی نظر نہیں آ رہا۔ یہ ہر جگہ رُک جاتی ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ ٹھہر رہی ہو۔ کب چلیں گے۔ کب نکلیں گے۔ کب پچھیں گے۔ کب واپس آئیں گے۔“

Decora
by
Hankies®
Tissue

... absorbent
..... elegant
..... & luxury



Soaks up excess oil



Adds elegance



Serves well as a serviette



Hankies



Customer Service

H&P
Health & Hygiene Products

hankieshnp@yahoo.com
freedomhnp@yahoo.com

”گڑیا!“ ماں نے جھٹلا کر پوچھا تھا۔ ”تم آخر ٹھیک کیوں نہیں چلتیں؟“
عبیہ نے چلتے چلتے ٹھٹک کر تنویر کی طرف دیکھا۔ انہیں لگا وہ ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا سکتیں۔
”ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔“ عبیہ نے لبتی کے برآمدوں میں اس کے ساتھ چلتے کہا۔ ”سو سڑشال وغیرہ بھی لے لیتا۔“

چھوٹا برس اس کو تھماتے اس نے گڑیا کا ہاتھ تھام لیا۔ کس تیزی سے بیڑھیاں چڑھ کر وہ دکان میں تھسی بغیر سوچ بچار کے جو اس کے ہاتھ لگا اٹھا کر اخرا تفری میں وہ پٹی یہ رنگ اسے پسند تھے یا ڈیزائن کیسا تھا۔ وہ اس سے ماورا تھی۔ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ گڑیا اسی سکون سے stuff toys کے ریک کے شیشوں سے اٹھا نکا کر اندر کا منظر انجوائے کر رہی تھی۔

”اس کا وہ بیان رکھنا۔“ کپڑے پکڑتے اس نے عبیہ کو تنبیہ کی تھی۔ وہ بھی نہایت تابعداری سے شیشوں کے پیچھے گڑیا پر دھیان جمائے کھڑی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا شیشوں میں ابھرتی شبیہ نامانوس نہیں تھی۔ کوئی ہے مگر کون ہے۔ تنویر کا وہ ہم وہ پٹی ہی تھی کہ جیسے رک گئی۔
اس کا سانس حلق میں پھنس کے کیوں رہ گیا تھا۔

اس نے نظریں بچانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ کیوں اس کا جی چاہا وہ ہوا میں تحلیل ہو جائے اور کسی کو نظر نہ آئے۔ اس کے پاس اور بہت سے سوالوں کی طرح ان سوالوں کا بھی جواب نہیں تھا۔ مگر وہ دیکھی جا چکی تھی۔
جائے فرار بھی نہ امکان۔ وہ اوپر والے شیفت میں ایک ترتیب سے لگے کھلونوں کو کھونچتے چڑھا۔

لمحے بھر کے لیے اس کو اور ساتھ کھڑی بچی کو بغور دیکھا۔
”تو آپ ہیں۔“ کسی جوانی تائید کے بغیر اس نے نظریں دوبارہ انہیں شیفت پر لٹکائیں۔
”آپ کی ہم زاد چھوٹی ہو گئی یا تبدیل ہو گئی ہیں؟“
”اضافی ہو گئی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ وہ مسکراتے کے بجائے مزید سنجیدہ ہو گیا۔

”باقی کے ہم زاد کیسے ہیں؟“ رضا، عثمان، سرعباس، کریم بی اور یہ آپ عموما ”حالت سزا میں کیوں پائی جاتی ہیں۔ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے۔“

”آپ نے تو شاید سزا کے ڈر سے آنا ہی چھوڑ دیا۔“
اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔ وہ پکڑتی رہ گئی اور جملہ ہوا ہوا۔
”میں تو سزاؤں کا منتظر ہوتا ہوں۔ مگر لگتا ہے مصطفیٰ کرنے والے جاتے رہے اور یوں بھی لاہور آنا ہی نہیں ہوا۔
رضائے بتایا تھا وہ ان دنوں یہاں نہیں ہو گا۔ رہا آپ لوگوں کی طرف آنا تو مجھے کریم بی کے چہرے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”ابھی آپ نے کہا، آپ سزاؤں کے منتظر رہتے ہیں۔“
”ایسا کہا تھا۔ چلیے آپ سنائیے سزا۔“
”مجھ سے تو اچھی سمجھنی ہوتی ہی نہیں۔“

”گویا جتنی بھی سزا آپ تجویز کریں گی۔ اس سے آپ کی تسلی نہیں ہوگی۔ کیا بنا آپ کی پی ایچ ڈی کا؟“
”نہیں ہوگی۔“
”سچ ہے کہ جا رہا؟“



گھورا۔
”ایسا ابرار؟“ طہ کی بے تابی عروج پر تھی۔
”یہ رہا بکرا۔“ سعد نے اپنی ٹانگوں کے پیچھے چھپے
بکرے کی رونمائی یوں کرائی جیسے جادوگر اپنی ٹوپی میں
سے اچانک کوہ تر نکال کر مجمع کو دم بخود کر دیتا ہے۔ سعد
کی اپنی صحت بھی قابل رشک نہیں، مگر اس کا یہ
مطلب تو نہیں کہ بکرا بھی ایسا مرل اور لاغر خرید لیا
جائے طہ اور عبداللہ تو منہ بسورتے بکرے سے ملے
بغیر ہی اپنے کمرے میں چلے گئے، البتہ فرزانہ کا سر

پچھلے سال کی بسکی مجھے اب تک یاد ہے۔
فرزانہ نے پوری کالونی کو بتایا تھا۔ ”سب کے
بکرے رکشے پر آئے ہیں، تو یہ کے میاں شاپر میں
ڈال کر مکرالائے ہیں۔“
بکرا اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا، مگر فرزانہ کے بکرے
کے سامنے واقعی بلی کا بچہ لگتا تھا، جیسے فرزانہ کے میاں
کے سامنے سعد۔ دونوں ساتھ کھڑے ہوں تو دور سے
یوں لگتا جیسے سو موہلو ان کسی بچے سے راستہ پوچھ رہا
ہو۔ سعد کا اناوند بھی چھوٹا ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو
نہیں کہ بکرا بھی اپنے ناب کا ہی لیا جاتا۔ میرے تو تن
بدن میں آگ لگ گئی تھی، سعد کو خالی ہاتھ دیکھ کر۔
دوپہر کا گیارہ شام سات بجے لوٹا تھا اور جب دروازے کی
تھنٹی سن کر میں بھاگتی ہوئی گئی تو طہ نے بھی میرے
پیچھے دوڑ لگا دی اور عبداللہ ”بکرا آگیا۔“ بکرا ”آگیا“ کی
گردان کرتے ہوئے ہمارے پیچھے لپکا۔ دروازہ کھول کر
ہماری خوشی بل میں غارت ہو گئی۔
”بکرا کہاں ہے؟“ میں نے غصیلی نظروں سے

”ہے۔“ اس نے متانت سے کہا۔
”گویا زندگی بھر کا روگ ہے۔ اس روگ کو پالنے کے سوا کچھ اور بھی کر کے دیکھیے۔“

”یہ میری بسن ہیں تویر!“
وہ اتنی سی دیر میں خریداری کو نمٹا آئی تھی یا بدحواسی میں خریداری کا ارادہ پھر سے ترک کر کے بیٹھی تھی۔
کاؤنٹر پر کھڑے بے ضرر سے لڑکے کو وہ شک سے پلٹ کر دیکھتی ہے، سائنٹی میں فاروق سے ہی ٹکرائی تھی۔
تھیلے سینے سے لگائے اپنے سے ٹکرا جانے والے کو جانچ پرکھ کرتی نگاہوں سے سر سے پاؤں تک گھوما۔ اس
توجہ سے کہ سلام کا جواب کہیں درمیان ہی میں رہ گیا تھا۔
”کیسی ہیں آپ؟“ اسے حیرت ہوئی، وہ کسی سے رساں سے بھی بات کر سکتا تھا۔
”تھنک یو۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔ ”چلو عبیر!“
عبیر کو اچھا لگا۔ چلو کچھ تو اس کے ماضی میں سے سلامت رہ گیا تھا۔ اس نے ایک اجنبی کو دیکھا اور حسب
عادت رد کر دیا تھا۔
ایک ڈول اور کپڑوں کا بل ادا کرتے اس نے پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کی بسن تہمتائے چہرے
کے ساتھ اس سے فرصت سے محو گفتگو تھی جو سب بھلا کر شایع میں لگی چیزوں کی طرف متوجہ تھا۔
”کون تھا؟“ اس نے نسبتاً بلند آواز سے پوچھا تھا۔
”رضا کا دوست ہے۔“
”رضا کا دوست؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔“
”ہاں تمہارے جانے کے بعد گروپ میں آیا ہے۔“ عبیر نے جواباً اپنی آواز مزید دھیمی کر لی تھی۔ وہ بہت
دور نہیں تھا۔

”گروپ میں؟“ اس کا شک بڑھ گیا۔ ”تم سب لوگ جانتے بھی ہو ٹھیک سے۔ مجھے جمال نے خود بتایا تھا۔
میرے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ تم لوگ کسی کا اعتبار بھی تو نہیں کرتے۔ میں نے اس کو بہت دفعہ دیکھا ہے یہ
ہمارے گھر کے آس پاس منڈلا مار رہتا ہے۔“
تویر کی آنکھیں متحرک تھیں۔ بڑی تیزی سے دکان میں چاروں طرف دیکھتے اس نے جھپٹ کر بیٹی کو اٹھایا۔
عبیر کا بازو مضبوطی سے کھینچا اور دروازے کی طرف دوڑی۔
عبیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس دیوانگی میں بھی وہ عبیر کی حفاظت کرتا نہیں بھولی تھی۔



(باقی آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ)



سانے والے فلیٹ کی کھڑکی سے تب تک نکلا رہا جب تک دروازے کے اس پار کھڑے سعد اور دروازے کے اس پار کھڑی میں ایک لاجواصل بحث میں مصروف رہے۔ بکرا اس دوران اطمینان کے ساتھ ہمارے چہرے دیکھتا رہا۔

”یہ کیا اٹھا لائے ہو؟“ میں غصے میں کانپ رہی تھی۔

سعد نے کچھ کہا، مگر مجھے سنائی نہیں دیا شاید غصے کی حالت میں اس کی بات مجھے سنائی نہیں دی۔

”کبھی کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہے تم نے؟ سو بار کہا تھا احسن بھائی کو ساتھ لے جاؤ، مگر تم تو بڑے عقل مند ہو، کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں تمہیں۔“

سعد نے پھر کچھ کہا جو مجھے سنائی نہیں دیا۔ میں نے غور سے دیکھا سعد نہیں۔ بکرا منمنایا تھا۔ سعد تو کن اکھیوں سے دھمکائیوں والے فلیٹوں کی کھڑکیوں میں سے نمودار ہونے والے سروں کو دیکھ رہا تھا، جنہیں اس کام کے سوا کوئی مصروفیت نہیں ہوتی کہ ایف سولہ والوں کا تماشا دیکھا جائے۔ ایف سولہ ہمارے فلیٹ کا نمبر ہے۔

”اس سے چھوٹا نہیں ملا تمہیں؟“ منحنی سے بکری کو دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

”نہیں۔“ سعد نے معصومیت سے کہا۔

”یا اللہ!“ میں ہاتھ پیٹ کر رہ گئی۔

بکری کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے سینے سے لگائے، جب سعد گھر میں داخل ہوا تو طہ نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یہ لائری میں نکلا ہے؟“

اس کے سوال کا جواب ابھی سعد کی زبان پر نہیں آیا تھا، جب عبداللہ نے ہاتھ میں پکڑی سفید ٹکلی کاگز بھر دھاگہ توڑ کر پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”مضبوطی سے باندھ لیں، کہیں بھاگ نہ جائے۔“

بھاگنا کہاں تھا بے چارے نے وہ تو کھڑے ہونے کے لائق نہیں تھا۔ جو کسی سعد نے فرش پر کھڑا کر کے ہاتھ پیچھے ہٹائے دھڑام سے گرا۔

”لگتا ہے اس کا بھی ایکسیڈنٹ ہوا تھا“ ناگوں

میں راؤ پڑنے ہیں شاید۔“ سعد نے بکری کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

گزشتہ سال سعد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ شکر ہے جان بچ گئی، مگر دونوں ٹانگوں کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں نے لوہے کے راؤ ڈال دیے تھے۔ ٹانگوں میں تب کہیں جا کر چلنا پھرنا نصیب ہوا۔ ایک دن تو طہ بیچ کس لے کر سعد کے پیچھے ہی بڑ گیا تھا۔ ”یہاں اب تو آپ ٹھیک ہو گئے ہیں، راؤ نکال کر بیچتے ہیں۔“ اور عبداللہ تو سعد کی ٹانگیں دبانے کے لیے پلاس لے آیا تھا۔ سعد خود کہتا تھا۔ ”میرے جسم کا سب سے قیمتی حصہ میری ٹانگیں ہیں، کیونکہ ہزاروں روپے کے راؤ ڈالے ہیں ڈاکٹروں نے۔“

احسن بھائی کہتے تھے ”شکر ہے ایکسیڈنٹ میں سعد کی ٹانگیں ٹوٹیں اور ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے سرا ڈال دیا۔ اگر خدا نخواستہ گردن۔ گردن میں سرا آجائے تو بندہ زمین پر نہیں رہتا ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔“

غضب خدا کا دس ہزار کا بکرا بالکل ملی کے بلوٹکے جیسا، جہاں بٹھاؤ بیٹھ جائے وہ لے کی طرح میں چپٹی رہی، مگر سعد اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا، طہ نے اسے صوفے پر بٹھا دیا اور عبداللہ فیڈر اٹھائے بکری کے آگے پیچھے۔

”سعد! قد دیکھو اس کا۔“ میں جوں جوں بکری کو دیکھتی مجھے غصہ آ جاتا۔

”قد سے کسی کی شخصیت کو نہیں ناپتے۔“ سعد کا اپنا ہی فلسفہ تھا جو مجھے زہر لگا۔

سانے والی فرزانہ یوں تو میرے گھر نہیں آتی، مگر اس شام چار بار آئی۔ پہلی بار یازمان گئے، دوسری دفعہ اجار گوشت کی ترکیب پوچھنے، تیسری مرتبہ اسے خواتین ڈائجسٹ کی سلسلہ وار کہانی یاد آگئی، جس کی تازہ قسط وہ پڑھ نہیں سکی تھی، چوتھے پلک میں اس کے قدم دروازے پر رک گئے، جب بکری کی منحنی آواز سنائی دی۔

”کوئی مسمان آیا ہے؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں جواب دیا۔

”نہیں کبھی کوئی سر لال۔“

میراجی چالال مل میں اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی آنکھوں میں ڈال دیں، جن کے ہاتھ وہ جو تھی بار چلی آتی تھی، صرف اور صرف ہمارا مرل بکرا دیکھتا مقصود تھا۔ وہ تو شکر ہے اسی وقت سعد کے جی میں بتا نہیں کیا آئی کہ بکری کی منمنائٹ کا جواب اس نے ایک زوردار بکرا نہ آواز میں دیا اور میری عزت رہ گئی۔

مجھے پتا ہے فرزانہ اپنے قد اور نومند بکری کا رعب جمانے آئی تھی جو انہوں نے چار دنوں سے اپارٹمنٹ کے مرکزی گیٹ پر باندھ رکھا تھا، ہر آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑتی اور سب بکری کی بیٹھے تھپتھپاتے تعریفی جملے بولتے ہوئے گزرتے۔

”بیٹھیں ہزار کا لیا ہے۔“ فرزانہ کامیاب ہر ہر لکیر کو یوں بتاتا جیسے ڈائریکٹس کا نیا فریق لیا ہو۔ میں بھی وہاں سے گزری، مجھے تو ذرا پسند نہ آیا۔ نراؤیل ڈول ہی تھا بکری کا، شکل نہ صورت، فرزانہ کے میاں کی طرح پھیلا ہوا، بے ڈھنگا۔ میں نے تو آنکھ پکڑ کر بکری کے کان بھی سمجھ لیا۔ ایک بار تو منمنایا۔ میں اس کی پشت پر پیار کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ بیٹھیں ہزار والے بکری کے گرد میلہ لگا رہتا تھا۔ سارے اپارٹمنٹ کے بچے اس کے گرد جمع رہتے تھے۔ فرزانہ اپنے میاں سے زیادہ خوراک اپنے بکری کو کھلا رہی تھی۔ دودھ کا ڈونگام نہ سے لگاتی، کبھی باداموں کی پلیٹ بھر کر سانے لا رکھتی، سوخنے، چونہ بھر فلیٹ والوں نے بھی اس کے سانے میں ہزار والا بکرا لا باندھا۔ لمبے لمبے کانوں، چمکدار سینکوں والا۔ لیا تو سولہ ہزار کا تھا مگر سب کو میں ہزار کا ہی بتایا انہوں نے۔ دونوں بکری تو ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے اور اپنی زبان میں آپس میں بات چیت بھی کرتے یا ایک دوسرے کو قصاؤں کے لطیفے سناتے مگر دونوں کے مالکان کے درمیان تو ایک سرورجک شروع ہو گئی، خواہوا ہی تیور بگڑنے لگے۔ خیر ہمیں کیا کسی کا نہیں ہزار کا تھا تو ہمیں کیا، کسی نے بیٹھیں ہزار کا خرید لوگوں سا ہم پر احسان

کیا۔ ہماری گنجائش دس ہزار کی تھی، دس کالے لیا مگر دس ہزار بھی بڑی رقم ہوتی ہے۔ میں اور بچے پتا نہیں کیا کیا خواب سچائے بیٹھے تھے اور سعد لے آیا۔

مرل سا بکرا۔

”دس کلو گوشت نہیں ہوگا“ میں سعد کو کھری کھری سناچی تھی مگر ابھی جی نہیں بھرا تھا۔

”دس تو خیر ہوگا“ سعد نے بکری کو چپکے ہوئے کہا۔

”تا چھوٹا سا۔ مرل۔ مجھے تو لگتا ہے اس کی قربانی نہیں ہو سکتی“ میں نے بھنا کر کہا۔

”تمہیں یاد نہیں شادی کے وقت میں بھی ایسا ہی تھا۔ ہو گئی تھی ناں؟“

میراجی چالال اپنا سر پیٹ لوں۔ شادی کا قربانی سے کیا تعلق اور سعد کی بکری سے کیا مما ملکت۔ طہ نے صاف کہہ دیا ”نہیں بکری کو باہر گھاس کھلانے نہیں لے جاؤں گا، دوستوں میں بے عزتی ہوگی۔“ اور عبداللہ نے یہ کہہ کر جواب دے دیا ”میرے دوست کہیں گے اس بار پھر مرغی کی قربانی کی کرنی ہے؟“ میں کچھ نہیں بولی، تھملائی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ کافی دیر کروٹیں بدلتے کے بعد میں ٹیرس میں گئی تو سعد کسی پروفیشنل فوٹو گرافر کی طرح اپنے موبائل کیمرے سے بکری کا فوٹو سیشن کر رہا تھا۔ مختلف پوز، مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں بنا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے سعد کی بات کا منظر یاد آ گیا جب ایسے ہی دولہا بنے سعد کی تصویریں لوگ بنا رہے تھے۔

”بہتر ہو تا تم کیمرے کی بجائے خوردبین سے اس کی تصویریں بناتے“ میں نے جمل بھن کر کہا۔

”او تم بھی بیٹھو اس کے ساتھ، گروپ فوٹو بنانا ہوں“ سعد نے چلتے ہوئے مجھے بکری کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”لا حول۔۔۔ میں بکری کے ساتھ بیٹھوں گی؟“

تصویریں بنو! گس!؟

”احسن کے ساتھ بھی تو بنواتی ہو؟“ سعد نے بکری کے سائیڈ پوز کی تصویر بناتے ہوئے کہا۔ میرے تو تن

بدن میں آگ لگ گئی۔ احسن بھائی سے تو خدا واسطے کا میرے سعد کو ہر بات میں میرے بھائی کو ضرور نصیحت لیتا ہے۔ ایک دفعہ ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ سعد اور احسن بھائی آسنے سانسے بیٹھے تھے۔ عبداللہ نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا تو ڈھیر سارا شور بہا اور پانچ چھ بوئیاں اٹھنی ڈال لیں۔

”برئی بات ہے بیٹا بہت بری بات“ سعد نے اسے ڈانٹا۔

”کھانے دیں، کچھ نہیں ہوتا“ احسن بھائی نے عبداللہ کی طرف داری کی۔

”بد تمیزی ہوتی ہے ایسے برا لگتا ہے یوں پلیٹ میں اتنا سالن بھر لیتا“ سعد نے عبداللہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی۔۔ پلیٹ نہیں بھرتے۔۔ ڈونگے میں ہی کھا لیتے ہیں“ طہ نے اپنی دانت میں بڑی عقلمندی کی بات کی۔

”بس بھی کرس اب کھانا خاموشی سے کھاتے ہیں“ میں نے طہ کو گھورا۔

”بچے کو سمجھانا ضروری ہے، کسی کے گھر جا کر ایسی حرکت کرے گا تو شرمندگی ہوگی ہمیں“ سعد تو اسی وقت عبداللہ کو سارا اسیلہ سارے آواب سکھانے کے در پے تھا۔

”اتنا ڈھیر سارا سالن نہیں ڈالتے“ اپنے ماموں کو دیکھو۔“ عبداللہ کے ساتھ نہ انے بھی چونک کر احسن بھائی کی پلیٹ پر نظر ڈالی، شکر ہے ان کی پلیٹ میں صرف دو بوئیاں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار خوشی ہوئی کہ سعد میرے بھائی کی تعریف کر رہا ہے۔

”ماموں کی طرح۔۔ تھوڑا سا سالن لیتے ہیں۔۔ دو بوئیاں۔۔ پانچ چھ بار۔۔“ سعد نے بہت نرم لہجے میں بہت پیار سے عبداللہ کو سمجھایا۔ احسن بھائی کا بونی اٹھاتا ہاتھ پلیٹ میں رک گیا۔ انہوں نے چومٹی ہار سالن پلیٹ میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اب وہ میرے بھائی کو بکرے سے تشبیہ دے رہا تھا۔

”آجھی قیمت بر بھی کوئی لے تو ابھی اسے بیچ آؤ“

میں پیر پختے ہوئے مڑی۔

”دو گنا قیمت بھی ملے تو کبھی نا بیچوں۔ میں تو اس کی تصویریں اور مودی بنا کر یونیوب پر نوڈ کروں گا۔“ میں نے مڑتے مڑتے سعد کی بات سنی۔

صبح میں جاگی تو سعد مارنگ واک سے واپس آچکا تھا اور میرا جی جلائے والی بات یہ تھی کہ وہ بکرے کو بھی سیر کرانے ساتھ لے گیا تھا جس کا مطلب ہے کہ آجھی کالونی نے ہمارے بکرے کا نا صرف دیدار کر لیا ہوگا بلکہ اس کے بارے میں ساری معلومات سے آگاہی ہو چکی ہوگی کیونکہ سعد کو ہر شخص سے بات کرنے کا شوق ہے۔ وہ تو صبح ناشتے کے لیے اینڈرے لینے نکلے تو شام کو واپس آتا ہے اور پھر بھی دروازے کا آواہا ہٹ کھول کر وہیں کھڑے کھڑے بتا دے گا ”اندھے نہیں ملے کچھ اور نکالو“

میں بچوں کے کمرے میں گئی تو میرا پارہ چڑھ گیا۔ عبداللہ بستر میں مزے سے لیٹا بیٹھا وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا اس کے بیڈ کی پانکٹی پر لیٹے لیٹے بھرا بھی ٹام اینڈ جیری سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور فرش پر دوور سنگ پالی کی ایک کیکر چلی گئی تھی جو میرا چال پالی نہیں تھا۔ کئی کالی گولیاں فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ جو گولیاں بہر حال نہیں تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں عبداللہ کی کلاس لیتی، طہ پتیلی اور چپس کا پیکٹ اٹھائے دروازے میں نمودار ہوا۔

”صبح سویرے پتیلی اور چپس۔۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“

”بکرے کے لیے لایا ہوں“ طہ نے میری طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

”خبردار! خبردار جو اسے پتیلی پلائی“ میں نے طہ کو ڈانٹا۔

”لما! اس نے بکرے کو کیپیول بھی کھلائے ہیں۔“ عبداللہ نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”کیپیول؟“ میں گھبرا گئی۔

”جی! وہ جو پکایا کھاتے تھے“

”لیا والے؟“ کہاں سے لیے؟“ میں نے طہ کا کٹن

پکڑ کر مڑوا۔

”درازمیں پڑے تھے“ وہ بلبلایا۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا اب میں کیا کر سکتی تھی۔ سعد چھ ماہ پہلے دو ہزار روپے کے میں کیپیول لایا تھا، قد بڑھانے والے نمار منہ کھا کر روزانہ جیتے سے اپنا قد بڑھاتا تھا، مجھے تو کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ بچے بھی روزانہ مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیتے مگر جو وہیں روز سعد خوشی سے چلاتا ہوا بچن میں آیا تو میں بھی حیران رہ گئی۔

”تو یہ! دیکھو کمال ہو گیا“

”کیا ہو گیا؟“ کیوں چلا رہے ہو؟ میں پر اٹھے بتا رہی تھی۔

”میرے بازو لمبے ہو گئے ہیں، میرا قد بڑھ رہا ہے“ وہ بہت خوش تھا مجھے افسوس ہی ہوا اس کا مطلب ہے اب احسن بھائی کی پرانی شرمیں سعد کے کام نہیں آسکیں گی۔

”بازو؟ کیسے لمبے ہو گئے؟“ میں پر اٹھا بنانے میں مصروف تھی۔

”کیپیول جو کھا رہا تھا۔“ دیکھو تو شرٹ چھوٹی ہو گئی۔ سعد نے اپنے دونوں بازو میرے سامنے پھیلا دیئے۔ اس کی شرٹ کے کف اس کی کہنیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی طہ چھٹایا ہوا بچن میں آیا ”پپا! میری شرٹ کیوں پسلی آپ نے؟“

سعد کا قد وہ کیپیول نہیں بڑھا سکے تھے بکرے کا قد کیا بڑھاتے۔ میں مطمئن ہو گئی مگر اس بکرے کے ساتھ خوب تماشے ہوئے۔ مجھے یاد ہے طہ نے شیمپو کی بوتل میں ڈال کر بکرے کو خوب نم لایا تھا اور بکرے کی شیخ و پکار سن کر میں بھاگتی ہوئی ہاتھ روم میں نہ پہنچی ہوئی تو یقیناً وہ کچھ دیر میں اپنی رنٹ تبدیل کر دیا ہوتا۔ طہ نے بھی اسے کالے سے سفید کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اسی شام اگر سعد بروقت کارروائی کر کے عبداللہ کے ہاتھوں پر غمال بکرے کو رہائی نہ دلاتا تو ہم اس پست قد بلند حوصلہ

بکرے کی قربانی کے شرف سے محروم ہو جاتے جس کے وانتوں کی صفائی کا ذمہ عبداللہ نے اپنے سر لیا تھا اور اپنے ٹوتھ برش پر ڈھیر سارا پیسٹ مل کر بکرے کی بتیسی کو چکانے میں مصروف تھا۔

”پپا! دیکھیں تو کتنے لمبے دانت ہیں اس کے“ وہ خزانہ کے بکرے کے چمکتے ہوئے دانت دیکھ چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ ان وانتوں کی چمک کا راز روزانہ ٹوتھ پیسٹ میں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جیسے مجھے خزانہ کا بیجیس ہزار والا بکرا دیکھ کر احساس کمتری محسوس ہو رہا تھا ایسے ہی طہ اور عبداللہ کو بھی اس کی صحت اور رعنت دیکھ کر شاید اپنے بکرے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ دس ہزار اور بیجیس ہزار میں بے شک فرق بھی تو بہت زیادہ ہے۔ ایک دن تو خزانہ کے بکرے نے اتنا کروی رستی ترا کر ایسا بھاگا کہ دو میل تک کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ چار چھ لوگ پیچھے بھاگے، کوئی دس فلائنگ کوئی بیس فلائنگ پر ہانپنے لگے جو ذرا قریب ہوا بکرے نے اس کے پیٹ میں سینگ جھلایا۔ بڑی مشکل سے قابو کر کے واپس لائے۔ خوب چرچا ہوا کالونی میں بڑی دادواہ ہوئی بکرے کی اور خزانہ کی۔ خزانہ بھی خوب نمک مرچ لگا کر سب کو سناپی رہی ”بکرا کہاں بیل ہے بیل۔ اتنا موٹا رسہ ترا کر بھاگ گیا“ تھو لوگوں کے قابو نہیں آتا تھا۔ میں نے سعد سے کہا ہم بھی رات کو اپنے بکرے کے گلے کی رسی ڈھیل کر دیں گے صبح چار چھ لوگوں کے ساتھ جا کر ڈھونڈ لانا۔

”کوئی پکڑ کر لے گیا تو اس کی قربانی سے پہلے ہی ہاتھ دھو بیٹھو گی“ سعد نے مجھے وارننگ دے کر چپ کرادیا۔ پھر اسی بکرے کی قربانی ہوئی۔ دو صفائی آئے تھے چھری ٹوکے لے کر۔ طہ نے انہیں پہلے ہی کہہ دیا ”بلیڈ لے آتے“ پہلے تو انہیں سمجھ میں نہیں آیا، بکرے کو دیکھا تو ایسی سمجھ آئی کہ ان کی ہنسی نہیں رکتی تھی۔

”جلدی کیا ہے اگلے سال قربان کر لیں، بکرہ کا قد نکال لے تو“ وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔ سعد کو بہت غصہ آیا،

اس کے استعمال سے چہرے پر بال نہیں بڑھتے

Parley®

ایور ویدک کیم بیچ

اس میں نچرل Herbs اور فوڈ ایکسٹریکٹ شامل

کئے گئے ہیں۔ نچرل Herbs کی وجہ سے جلد پر

سوزش، جلد کھردری اور بال زیادہ نہیں ہوتے اور

Parely Special Food Formula Extract

کے ذریعے جلد کو تروتا پیہی ہے اور گہری جلد گولائی

ہو جاتی ہے۔ یہ مادہ قلع کریم کے چوتھے کی سکس کے

pH Balance کرتا ہے۔

KHYBER CHEMICAL COMPANY
392 GPO Lahore Pakistan
www.parley.pk

انٹرنیشنل معیاری بیکیٹ کے ساتھ



تو ایک ماؤں نو نمبر کا اور دو سر یاؤں دس نمبر کا لے آیا۔ آفس تو کئی بار ایک ہی جراب پہن کر چلا گیا۔ دوسری پہننا یاد نہ رہی مگر صاحب منزلہ تو ہمیشہ گرے گا میرے بھائی کے بھلے پرین پر۔

طہ، عبداللہ کی بے تابی عروج پر تھی۔ میں تیس ہزار والے بکرے کے لیے صبح سے منتظر تھی۔ ایسا صحت مند بلا ہوا بکرا جسے دیکھ کر فرزانہ جل کر کباب ہو جائے اور پورے اپارٹمنٹ میں دھوم مچ جائے۔ بکرا آیا۔ مگر اسے دیکھ کر میری ساری امیدوں پر اس پر گئی۔ تقریباً "دیسای بکرا" جیسا پچھلے سال دس ہزار کا لیا تھا۔ دھلا پٹلا، مسکین سا۔ سعد جیسا چھوٹا تھا۔

"کتنے کالا؟" میں انتہائی ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ طہ اور عبداللہ بھی مایوس نظروں سے اس مسکین بکرے کو دیکھ رہے تھے جو سعد کی طرح چہرے پر انتہائی سنجیدگی لیے کھڑا تھا۔

"دس ہزار کا؟" سعد نے بڑے سکون سے کہا اور میرے صبر کا کیانہ لبریز ہو گیا۔

"چیے کیوں بچلائے؟" میں چلا تھی۔ "چیے نہیں بچائے" سعد نے عجیب بات کی۔

"چیے نہیں بچائے؟" دس ہزار کا بکرے آئے باقی ہیں ہزار۔؟" سعد نے چپ چاپ ایک رسید میری ہتھیلی پر رکھ دی میں ہزار کی رسید۔ سیلاب فنڈ میں جمع کرانی کی رقم کی رسید۔

"سیلاب فنڈ میں؟" میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی کیونکہ سعد کے چہرے پر وہ اطمینان اور سکون تھا جو صبح فیصلے کے بعد مجھے دکھائی دیتا ہے اور جس سے اختلاف میں کر ہی نہیں سکتی۔

"یہ دیکھو۔۔۔ بالکل ہمارا عبداللہ ہے ناں؟" سعد نے ایک بروشر مجھے پتھا دیا جس پر سیلاب زدہ ایک بے گھر بچے کی تصویر تھی۔ بالکل میرے عبداللہ جیسا گہری رنگت، معصوم چہرہ، ننگے پیروں۔۔۔ اور آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی میں نے سعد کو فخر سے دیکھا اور اس کے لائے ہوئے بکرے کو۔ دونوں کا اصل قد مجھے اب نظر آرہا تھا۔

مجھے بھی۔ "تمہارا قد تو پچھلے دس سال سے اتنا ہی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ اس نے میری بات ان سنی کر دی اور خود چھری نوک لے کر آستینیں چڑھائیں۔ کل کتنا گوشت نکلا، کتنا، تقسیم کتنا جمع ہوا۔ میں اس حساب میں بڑنا نہیں چاہتی۔ کافی میں فرزانہ کے بکرے کی تعریفیں اور فرزانہ کا احساس بقا خرومکھ کر میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا تھا کچھ بھی ہوا اگلے سال میں ہزار والا بکرا خرید کر قربانی کرنی ہے جسے دیکھ کر لوگ وادہ کریں اور فریزر بھی چار مہینے کے لیے گوشت سے بھر رہے۔

اس سال میں نے واقعی پائی پائی جو ڈر قربانی کے لیے تیس ہزار بچالے۔ سال بھر بچوں کے فالو کپڑے بنائے نہ اپنے میک اپ میری پائے پر کچھ خرچ کیا۔

"حسن بھائی کو ساتھ لے جاؤ، اچھا سا بکرا لانا ہے۔" میں نے تیس ہزار سعد کو دے ہوئے تاکید کی۔

"حسن کو؟ کیوں؟" سعد نے ہمیشہ کی طرح احسن بھائی کے نام پر نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"نہیں سوچو بوجھ ہے خریداری کی" میں نے بہت تحمل سے کہا۔

"خاک سوچو بوجھ ہے اسے" اور ک اور اروی کا فرق تو پتا نہیں "سعد نے ناگواری سے کہا اور میں محض ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ پچھلے ماہ احسن بھائی سبزی لینے بازار گئے تو سبزی کی دکان پر کھڑے ہو کر شاپر میں اروی ڈالنے گئے، دکاندار دوسرے گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا۔ احسن بھائی نے شاپر میں ڈال کر خود ہی اروی تول ل۔

"آدھا کلو اروی، دکاندار متوجہ ہوا تو احسن بھائی نے اروی والا شاپر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے جیب سے ہونہ نکالا۔

"یہ اروی نہیں اور ک ہے" دکاندار نے شاپر پکڑ کر اور ک واپس ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔ اتنی سی بات تھی جس کا ہتھکڑ سعد نے بنا لیا۔ خود کئی بار مسجد سے جوتا بدل کر آگیا بلکہ مسجد سے کیا بازار سے نئی چپل خریدی



بہت اہمیت دیتی تھی اور بقول فارس۔
خیر میں اس کی بکواس پر دھیان نہیں دیتی۔ دھیان
دینے کے لیے دنیا میں دوسری بہت چیزیں ہیں۔ مثلاً۔

”ارم بلبل۔“ دل نے پوہنی کہا۔
”مثلاً“ اعراف کے بارے میں سوچنا۔“ آپ یہ
ہی سنا چاہ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ سے ہی جھکی
سے کہا۔

”ارم! اس سے باتیں کر رہی ہو؟“
”کسی سے نہیں۔“ میں نے ڈائجسٹ اٹھا کر ایک
طرف رکھا۔

”مئی مجھے بہری کہتی ہیں۔ اس کے بازو بھی ان
بہرے کانوں سے ابھی کچھ بولتے سنا تھا اور تم ہو کہ
صاف انکار۔“

”اور پچھے کیوں لگ جاتی ہو فارس؟“
”تو آگے لگ جاؤں۔ خیر یہ تو مذاق ہے، میں یہ
کسے کے لیے آئی تھی کہ زوہا کا فون آیا تھا۔ وہ تمہیں



جتنا نہیں کتنی جھکنے ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں
لتی۔ پہلے امتحانوں کی وجہ سے، میں اور ریحنا تقریباً
ایک مہینے سے یوں جاگ رہے تھے کہ تنگ آکر فارس
نے اعلان کر دیا تھا۔

”اب اگر امتحانوں کے بعد تم سونا بھی چاہو گی تو
تمہاری آنکھیں بند نہیں ہوں گی۔ کیونکہ بے چاری
ان آنکھوں کو کھلے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔“

”اچھا ہے، زیادہ فلسفہ جھاڑنے کی ضرورت
نہیں۔“ میں چڑ گئی تھی۔
لیکن اب مجھے واقعی یوں لگتا رہا تھا کہ ایگزام نے
نیند آنکھوں سے چرائی۔

”ہاں بالکل یہ ہی وجہ ہے۔“ میں نے خود کو تسلی
دے کر کہی۔

”بھئی کبھی خود کو بھی تسلی دینا چاہیے۔ مجھے ویسے
بھی اپنی ذات کو نظر انداز کرنا پسند نہیں تھا۔ شاید کسی
کو یہ بھی پسند نہ ہوتا ہو۔“

لیکن میں اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی ذات کو

بلارہی ہے۔“
 ”مگر میرا دل نہیں چاہ رہا، اس سے کناکل یونیورسٹی میں ملاقات کرے۔“
 ”اوہ! تمہاری باتوں سے تو یوں لگ رہا ہے کہ جیسے تم پر اہم مشورہ غور لو لگ گئی ہو۔ تمہارے لہجے میں یہ اتنا غور کس لیے آگیا ہے۔“
 ”بے وقوف! جو تجھے غور لگ رہا ہے کہیں وہ محبت کا وصف ہی نہ ہو۔“
 ”اتنی کھلی شاعری سننے سے بہتر ہے کہ بندہ خاموش ہی رہے یا پھر وہی کرے جو ابھی تم کر رہی تھیں۔“
 ”اور میں کیا کر رہی تھی؟“ میں نے یہ سوال اسی سے پوچھ لیا۔
 ”حقیقتاً“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ... یہ میں کیا کر رہی تھی۔ سارے ٹائم ٹیبل آپس میں کس آپ ہو گئے تھے۔
 جو سونے کا ٹائم ہوتا ہے اس میں جاگتی رہتی۔ جاگنے کے ٹائم صرف اور صرف سوچتی رہتی۔ حالانکہ ساری دنیا میں سوچنے کا کام لوگ رات ہی کو کرتے ہیں۔
 دوسرے نارمل انسانوں کی طرح میں بھی رات کو کبھی آنکھوں پر رکھ کر سارے زمانوں کی سیر کرتی رہتی۔
 اور فارس ہمیشہ جل کر یہ ہی کہتی کہ ”کاش تم سعودیہ میں پیدا ہوئی ہوتی، تو تمہارے اوپر کسی چوری کا الزام لگا کر اب تک تمہیں اس بازو سے محروم کر چکی ہوتی۔“ میں نے بازو آنکھوں پر رکھا، اور نکل گئی کسی دوسرے جہان کی سیر کو اور اب شاید اسی بد تمیز کی بددعا میں لگ گئی تھیں۔
 اور اگلے دن جب بالکل نئی بات رچا کر رہی تھی کہ ”ارم تمہاری آنکھیں کیوں اتنی بوجھل ہیں۔“ اسی وقت میری نظر نے اعراف کو دیکھ لیا۔ وہ بظاہر ہماری طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی ہماری باتیں سن رہا تھا۔ بلکہ وہ اور جنید سرباقر کے نوس میں دماغ کھپا

رہے تھے۔
 ان کا لکچر مشکل ہی اتنا ہوتا تھا کہ رچا کا خیال تھا کہ پچھلے جنم میں ضرور سرباقر فریقہ وغیرہ کی کسی یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے ہوں گے۔ تب ہی تو ایسی جتنی زبان استعمال کرتے ہیں، بلکہ پورا زور خطابت ہی اس بات میں صرف کرتے ہیں اسٹوڈنٹس کہیں ان کا لکچر سمجھ ہی نہ لیں۔ اور اسی بات پر اس کی اعراف سے لڑائی بھی ہو گئی تھی۔
 میں نے اتنے لڑکوں میں کم از کم اس جیسا لڑکا نہیں دیکھا تھا۔ اسی بچپن میں ہم لوگوں کو کما کرتی تھیں، لڑکے ایسے ہوتے ہیں جیسے بے سر کی فوج۔
 یہ ہی حال مجھے لڑکوں کا لگتا تھا۔ جیسے ہر چیز نے ان پر سے کنٹرول کھو دیا ہو۔ ہر لڑکا کہ نہ کسی تنظیم سے وابستہ اور ہر لڑکا ہاتھوں سے نکلا ہوا لگتا تھا اور ہمارے گروپ کا منتقلہ فیصلہ یہ تھا کہ ”لڑکیوں کا مستقبل نہایت تاریک معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جس قسم کے لڑکے سامنے آ رہے ہیں یہ ہونہار سپورٹ کچھ بھی بن سکتے ہیں۔ مگر شوہر نہیں۔“
 یہ بات ارم نے منہ سے نکالی تھی اور سب اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔
 ”تم جو یہ اتنے بڑے بڑے بول بول رہی ہو، تو بیٹا یا دو رکھنا سب سے پہلے تمہیں ہی اسی قسم کا شوہر ملے گا۔“
 ”اللہ نہ کرے! ارم کا دل یوں بھی بہت نازک تھا۔ اس سے تو بہتر یہ ہے کہ میں ساری زندگی کنواری ہی رہوں۔“
 ”فکر نہ کرو، جس طرح تمہارے سارے کزن امریکہ، کینیڈا کی راہ لے رہے ہیں اس سے تو یہی نظر آ رہا ہے کہ مستقبل بھی وہی ہے جو حال ہے۔“
 ”اب ایسی بھی بات نہیں۔ مجھے وہ اپنے کزن پہلے بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔“
 تب ہی رچا نے گلا صاف کیا۔
 ”کیا حلق میں مینڈک پھنس گیا ہے؟“

”نہیں! پانی پھنس گیا ہے۔“
 ”ارم کی بات سنو، پہلے اس کو ہر تیرے مہینے اپنا کوئی نہ کوئی کزن پسند آجاتا تھا، کسی کے بال اچھے ہیں۔ کوئی مسکراتا اچھا ہے۔ اور اب ذرا یہ کیا کہہ رہی ہے، یہ سب اعراف کی وجہ سے ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“ میں نے آنکھیں پٹپٹا کیں۔
 ”مطلب یہ کہ اپنی ارم جتنی خوبیاں الگ الگ بندے میں تلاش کرتی تھی وہ سب خوبیاں جب اس نے ایک ہی بندے میں دیکھ لیں تو پھر اس نے سوچا کہ ٹائم ویسٹ کرنے کا فائدہ۔“ ارم سب کے مذاق کا نشانہ بنتی تھی۔ اور اب بھی بن رہی تھی۔ لیکن مجھے بس یوں لگا کہ جیسے ارم کے متعلق باتیں نہیں ہو رہی ہوں، سب میرے متعلق یہ باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے ایک دم سے رونا کو ڈانٹ دیا۔
 ”رونا! بہت بری بات ہے اگر وہ ہم لوگوں کی باتیں سن لیتی ہے تو اس کا کیا مطلب ہوا۔۔۔“
 ”اوہ سووری۔“
 ”کوئی بات نہیں۔“ ارم نے بھی فرائضی سے معاف کر دیا۔
 یہ اعراف کے متعلق ہم لوگوں کی پہلی باضابطہ بات چیت تھی۔
 اس سے پہلے ہم لوگوں کا اپنی ہی شرارتوں سے اور باتوں سے دل نہیں بھرنا تھا کہ ہم لوگ کسی اور طرف بھی دھیان دیتے۔ لیکن کبھی اعراف کے لیے سوچنے بیٹھتی تو حسب حال کوئی چیز بھی تشبیہ کے لیے نہیں ملتی۔
 پہلے پہل تو میں خودیہ سمجھتی رہی کہ اگر تھوڑے دنوں کی بات ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔
 زندگی میں بہت ساری چیزیں اچھی لگتی ہیں اور اچھا لگنا مسئلہ بھی نہیں۔
 فارس بھی تو یہی کہتی تھی کہ ”اللہ نہ کرے ارم جیسی پسند کسی کی ہو، کسی بھی چیز کو پسند کر لیا اور پھر تقدیر پر قانع ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ مقدر میں ہوگی تو مل جائے گی، ارے کچھ ہاتھ

پاؤں ہلا پڑتا ہے۔ کوئی ترکیب سوچنی پڑتی ہے۔“
 اور میں اکثر یہ ہی سوچتی کہ شاید فارس صبح ہی کہتی ہو، کیونکہ اس کو اکثر چیزیں ہی اس وجہ سے حاصل ہو جاتی تھیں کہ ہاتھ تو ہاتھ بعض اوقات خود کو ہی پورا گھسنا پڑتا تھا۔
 تب کہیں جا کر وہ جبران سے کوئی چیز حاصل کر پاتی تھی۔
 دونوں جڑواں تھے، شکل بھی بہت ملتی تھی۔ اس کے باوجود بھی ایک منٹ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔
 اور اگر اس طرح وہ چیز نہیں ملتی تو کوئی نہ کوئی ترکیب استعمال کرتی۔ اور وہ ترکیب کچھ اس قسم کی ہوتی کہ وہ کسی ایسے دماغ میں ہی آسکتی تھی جس دماغ کو شیطان کا گھر بنا گیا ہے۔
 اور وہ اکثر یہی سمجھے اس قسم کے مشوروں سے نوازتی رہتی تھی کہ جس کو سن کر ہی میرے ہاتھ پاؤں پسینے سے بھیگ جاتیں۔
 ہاں رچا کو فارس کی باتیں بڑی پسند تھیں۔
 میں دونوں سے کتنی بھی بی بی تھی کہ ”سنو تم دونوں آپس میں دوست بن جاؤ، روزانہ دنیا میں ایک نیا کارنامہ ہوا کرے گا۔“ لیکن رچا کو میرے بغیر شاید ایک گھڑی کا بھی چین نہیں تھا۔
 جبران بھی رچا سے یہ ہی کہتا کہ ”رچا آپ اپنا بستر لے کر ہمارے گھر ہی کیوں نہیں رہ جاتیں۔“
 اور وہ بد تمیز ہمیشہ یہ ہی کہتی۔
 ”جبران! تم ابھی چھوٹے ہو، ورنہ مجھے آنے میں کیا اعتراض تھا۔“
 اور اب وہ فارس کا دماغ کھارہی تھی۔
 ”اف فارس! میں تمہیں کیا بتاؤں، ہمارے پچاس منٹ میں کیسا لڑکا آیا ہے۔“
 ”کیا؟“ فارس سارے کام چھوڑ کر دم سے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔
 ”تو بے رچا! کچھ شرم کرو، وہ ابھی کالج میں پڑھ رہی ہے۔“

دکن

نومبر 2010 کے شمارے کی ایک جھلک

- اداکارہ "صنم بلوچ" سے شاہین رشید کی ملاقات
- اداکارہ "عظمی طاہر" دو کے پھاڑے کے ساتھ
- کوئٹہ ایکسپریٹ "شمینہ جلیل" سے ان کے گھر کی باتیں
- "بول کے لب آزاد ہیں تیرے" قارئین کے لیے دلچسپ سلسلہ
- "درد دل" نبیلہ عزیز کا سلسلہ وار ناول
- "دست کوزہ گر" فوزیہ یاسمین کا نیا دلچسپ سلسلہ وار ناول
- "پرکھ" نایاب جیلانی کا دلچسپ ناول
- "عشق آتش" سعیدہ راجپوت کا ناول
- "حرف تکمیل ہیں" سدرۃ الصنتی کا ناول
- "ہنستی اچھی لگتی ہو" شیریں ملک کا ناول
- "کیسی لاگتی یاری" سائرہ عارف کا ناول و اختتامی مراحل میں
- "گوشہ عافیت" شگفتہ بھٹی کا دلچسپ ناول
- صائمہ، نفیسہ، سعید، شری احمد، مہزیلہ، حقو، میراگل اور ام شامہ کے افسانے اور مستقل دلچسپ سلسلہ

اس شمارے کے ساتھ دکن کتاب

کرن کتاب "مکرون ہیکوان"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ ملحدہ قوی خدمت ہے، استفادہ کیجئے۔

حالات تو ایسے تھے کہ رویا کرتے۔
"افوہ" اتنی دھوپ میں تمہیں شاعری سوجھ رہی ہے۔
"فارس نے کمرے کا پرہہ برابر کیا۔

"ارم! کتنے دن ہو گئے رہنا آئی نہیں۔"
"تمہاری ہڈی دوستی ہو گئی ہے رہنا ہے۔"
"یہ تو بات ہے۔" فارس نے سر ہلایا یا یقین کرو میرے اور اس کے خیالات اس قدر ملتے ہیں کہ کیا جتاؤں۔"
"تم دونوں اپنی تجزیہ کاریوں کو انڈر اسٹینڈنگ کا تو نام مت دو، بڑی مہربانی ہوگی۔"
"تو تم بھی ہمارے جیسی کیوں نہیں بن جاتیں۔"
"مجھے تو معاف ہی رکھو۔" میں نے ہاتھ جوڑے۔
"بچ ارم! کوئی چیز اگر نہ ملے تو بس اسے چھین کر حاصل کر لیتا چاہیے۔"
"چھیننے سے کیا وہ چیز اپنی ہو جاتی ہے بے وقوف لڑکی۔"

"بے وقوف تو تم ہو، اگر آج اپنی نہیں تو کیا ہوا کبھی نہ بھی تو اپنی ہوئی چلے گی۔"
"اچھا میں صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔"
زندگی کے متعلق ہر ایک کے اپنے خیالات ہیں اور ہر ایک کو اتنا تو حق حاصل ہے کہ وہ زندگی کو اپنے خیالات کے مطابق ہی بسر کرے۔
اور یہ تو وقت ہی بتاتا ہے کہ اس کے بعد آدمی کے حصے میں کیا آتا ہے بخت یا سخت۔

امی نے صبح یونیورسٹی بھی نہیں جانے دیا اور آپا کی طرف بھیج دیا۔ ایک تو ان کی طبیعت صحیح نہیں تھی اور دوسرے امی کو بھی کچھ کام تھا، میں آپا کی طرف گئی تو انہوں نے روک لیا۔
"ارم! آج نہیں رک جاؤ۔" ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔
میں ایک دم چونک گئی۔
عموماً وہ روک کر نہیں تھیں بلکہ یہ ہی کوشش کرتی

رہتی ہیں۔
فارس تو اس کا سیدھا جواب یہ دیتی کہ سب سے زیادہ تو ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے سائیں ہی کافی ہوتی ہیں۔
لیکن آپا کے ساتھ تو ساس بھی نہیں تھیں۔
میں نے بہت دفعہ سوچا کہ آپا سے پوچھوں گی لیکن وہ ان کا ٹائم ٹیبل۔
اف خدا لیا۔ اتنے بھاگتے دوڑتے ٹائم ٹیبل کے ساتھ کون چل سکتا تھا۔
امی کو آج بھی مجھ پر یا فارس پر ذرہ برابر بھی اعتبار نہیں تھا۔ وہ اپنے سب کام آپا کے لیے سنبھال کر رکھتیں کہ جب ماہم آئے گی تو سب کے کپڑے بھی اسی وقت آئیں گے، کسی کے شادی کے لیے، کوئی تحفہ خرید جائے گا۔ تو وہ بھی آپا ہی لے کر آئیں گی۔
اس کے علاوہ بھی فلاں ڈھکال کام بھی وہی کریں گی۔
فارس غصہ بھی ہو جاتی۔

"ہی! آپا کی ساس نہیں تو کیا ہوا آپ تو بالکل ساس کی طرح کرتی ہیں۔ دو گھنٹی بھی نہیں آرام نہیں۔"
"میں تو تم سے گروا میں یہ سارے کام۔" امی باندان کا ڈھکن بن کر فارس کو گھورتیں۔ "دکان دار ایک چیز دکھا رہا ہے تو ان کی نظر برابر وانی دکان کے کپڑوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ کیونکہ دماغ تو حاضر ہوتا نہیں۔"
"تم آخر امی کو چھیڑتی ہی کیوں ہو۔" مجھے غصہ آنے لگا۔

"اتنی مشکل سے تو دوپہر میں نیند آتی تھی۔ اور ابھی ذرا ہی تو آنکھ بند ہوئی تھی۔"
"تو اور کسے چھیڑوں؟ سب سے پہلے تو تم ہی پیو گی۔"

"چھاپ کر جاؤ۔" میں نے کروٹ بدلی۔
"ایک بات بتاؤ ارم! تم اتنا غصہ کس لیے کرتے ہو گی؟"

"صو لا" تو مجھے غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ۔" میں نے فھنڈی سانس لی۔ "کیونکہ

"ارے تو پھر کیا ہوا؟" ریحان ذرا جواثر ہوا ہوا اس نے بھی ریحان کی اس لڑکے کے بارے میں پوری تفصیل بتا کر دم لیا۔
"شاید اس کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ اس میں اتنی خوبیاں ہیں جتنا تم نے فارس کو بتایا ہے، بندے کو جھوٹ میں بھی ایک حد رکھنی چاہیے۔"
"میں نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔ لیکن تمہیں آخر اتنی خار کس لیے ہے؟"
"نہیں گونی خار نہیں ہے، تمہارا تو بس دماغ خراب ہے۔"
"رہنا بالکل صحیح کہہ رہی ہیں، یہ ہر وقت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔"
"کیوں۔ یہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔" ریحان کو فوراً میری فکر لاحق ہو گئی۔
"اب یہ ایسی ہی ہو گئی ہیں، اور تو اور وہ راتوں کو جاگ کر او اس غریب سہمی جاتی ہیں۔"
"کیا واقعی۔" ریحان نے آنکھیں پھاڑیں۔
"پہلے ہی آنکھیں بہت پھٹی ہوئی ہیں، انہیں مزید نہیں پھاڑو۔" میں نے فحاشی سے کہا۔
"دیکھ لیا اس جیسی لڑکی کو، میری خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں کو کیا کہہ رہی ہے۔"
"افوہ! کتنا لاترے ہیں آپ لوگ۔"
"چلیں رہنا جی! آپ اور بتائیں، کیا بتا رہی تھیں؟"
"ایک آدھ دن اور انتظار کر لو، کل تک ہو سکتا ہے کہ اس بندے میں کچھ اور خوبیاں بھی ریحان دریافت کر لے۔ پھر آکھیں ہی سن لینا۔" میں نے حل کر کہا۔
"تم اس قدر غصے میں کیوں ہو؟"
"جی نہیں۔"
آدھا جملہ ابھی میرے منہ ہی میں تھا کہ اسی وقت بڑی آپا آئیں۔
حسب معمول ان کا منہ اترا ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنے سال ہو گئے تھے مجھے ان کو خوش دیکھے ہوئے نہ جانے یہ شادی شدہ لڑکیاں اتنی خوف زدہ کیوں

تھیں کہ ہم لوگ جاوید بھائی کے آفس آنے سے پہلے ہی گھر چلے جائیں۔ پھر بتائیں آج کیا بات ہوئی تھی؟
 ”گھر فون کر کے فارسی کو بتایا تو وہ چڑ گئی۔
 ”کیا ضرورت ہے تمہیں رکنے کی۔“
 ”کیوں بھی ایسی کیا بات ہو گئی اگر میں ذرا رک ہی گئی ہوں۔ تم جو آئے دن خالہ امی کے یہاں رک جاتی ہو میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔“
 ”ان کے یہاں کوئی جاوید بھائی جیسا بندہ جو نہیں ہے۔“
 ”جاوید بھائی جیسا بندہ کیا مطلب؟“ میں ہنسی ہو گئی۔
 ”کچھ نہیں تم نہیں سمجھو گی۔“ فارس نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”بھئی کچھ سمجھاؤ گی تو سمجھ میں آئے گا۔“
 ”جو دیکھنے سے کچھ نہیں سمجھتے پھر انہیں سمجھانے سے کیا حاصل۔ یوں بھی میں تم سے چھوٹی ہوں۔ جو باتیں تمہیں سمجھ کو سمجھانی چاہیے تھیں نا وہ مجھے بتانی پڑتی ہیں۔“
 ”یہ بات تو صحیح ہے۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔
 اب میں اس کی طرح کا داغ کہاں سے لے کر آتی۔
 ایک تو وہ ہر بات کی ترہ تک بھی فوراً پہنچ جاتی تھی۔
 پھر ان حالات سے بچ نکلنے کا حل بھی آ جاتا تھا۔
 کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو دس ترکیبیں گھڑی گھڑائی اس کے پاس موجود۔
 اور اب میں نے مری سانس لے کر ریپور کو دیکھا۔ اور واپس رکھ دیا۔ آج میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب اس سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔ خود ہی ذرا کھوج لگانے کی کوشش کروں گی۔
 کہ آخر اس کی فضول باتوں کا مقصد کیا تھا۔ میری زندگی میں جو دو لوگ آئے دونوں کی ہی بس کیواس سنتے رہو میں نے غائبانہ طور پر ہی ریتا کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔

آپنی کے کمرے میں جھانکا تو وہ ابھی تک سو رہی تھیں۔ شاید تھک گئی تھیں۔
 ہر چیز جیسے انہوں نے شیشے کی طرح چمکائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کھانا بھی انہوں نے دو طرح کا بنایا۔
 ”جاوید رست لائٹ ڈنر لیتے ہیں۔“
 ”اچھا۔“ میں صرف آنکھیں ہٹھکا کر رہ گئی۔ میں تو ایک بھی کھانا ہی سے اچھا خاصا ڈائنٹ سننے کے بعد پکائی تھی۔
 واقعی شادی تو فل ٹائم جاب ہے۔ یونہی خیالوں میں گھرے گھرے میں لان میں آکر بیٹھ گئی۔ جب ہی جاوید بھائی کی گاڑی کا ہارن بج اٹھا۔
 ”ارے اتنی جلدی یا بچ نکل گئے۔“ میں جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگی۔
 آنے والے جاوید بھائی ہی تھے۔ ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست بھی تھا۔
 کچھ عجیب سا ہی دوست تھا۔ میں ایک دم سامنے سے ہٹ گئی۔
 آپنی کو جلدی جلدی نیند سے اٹھا کر جاوید بھائی کے آگے کھڑا کیا۔
 ”اچھا۔“ وہ ایک دم یوں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ جیسے ان میں اس پر گنگ لگ گئے ہوں۔
 ”تم ذرا پہلے ہی اٹھا دیتیں۔“
 ”آپ اتنی تھکی ہوئی لگ رہی تھیں کہ میرا تو ابھی بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اٹھاؤں، لیکن اصل میں جاوید بھائی کے کوئی دوست بھی آئے ہیں۔ اب چائے وغیرہ تولے کر جانی ہی پڑے گی۔ اور وہ شکلا کچھ اچھا بھی نہیں لگ رہا ہے۔“
 ”کیا مطلب؟ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔“
 ”پتا نہیں، مطلب وغیرہ۔ میں نہیں جانتی۔ مگر اس کی آنکھیں اچھی نہیں تھیں اور آپ کو تو پتا ہے نامیری زندگی میں آنکھوں کی کتنی اہمیت ہے۔“
 ”ہاں ہاں مجھے سب یاد ہے اور یوں بھی تمہاری عادتیں مجھ سے بہت ملتی ہیں۔“
 ان کے ہونٹوں پر پھیلی سی ہنسی تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ میں تو ڈر گئی۔ ”میری اور آپ کی عادتوں میں بہت فرق ہے۔ آج آپ نے سارا دن جس طرح کام کیا ہے اور پھر ایک دم سوتے سے اٹھ کر جس طرح بیٹھ گئی ہیں میں تو شاید ساری زندگی بھی نہ کر سکوں۔ آپ کو پتا ہے امی سے کس قدر ڈانٹ پڑتی ہے مجھے۔“
 آپنی تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر ان کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔
 ”بے وقوف! یہ میری عادتیں نہیں یہ میری زندگی کی مجبوریات ہیں۔“
 میں کچھ اور بھی کہتی، لیکن اتنے میں جاوید بھائی خود اندر آ گئے۔
 ”تم اتنی دیر سے سو رہی تھیں؟“
 ”نہیں اب تو اٹھ گئی ہوں۔“ آپنی بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔
 ”ہمت بے وقوف عورت ہو تم، تمہیں پتا بھی تھا آج زوار کو آنا تھا، پھر بھی اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔“
 وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔
 ارم ایک لمحے کے لیے چور سی بن گئی۔ نہ جانے ایسا ہی لگایا اسے ہی محسوس ہوا کہ جاوید بھائی کو اصل غصہ کسی اور بات پر تھا۔ اور وہ نکل کسی اور بات پر رہا تھا۔ اور نہ جانے وہ دوسری بات کیا ہو سکتی ہے۔
 اسے یاد تھا، اس نے یہ بات پہلے بھی آپنی سے پوچھی تھی۔
 اور آپنی نے اس کا اتنا چوم کر کہا تھا۔
 ”تم ان سب باتوں پر اپنا دھیان نہیں دو، مرد کی دوسری بات کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی من چاہی لڑکی سے شادی نہ ہو تو اس کی دوسری بات یہ ہی ہوتی ہے کہ اگر وہ لڑکی اس کی زندگی میں ہوتی تو شاید نہیں بلکہ یقیناً زندگی گل و گلزار ہوتی۔“
 ”اور اگر اسی لڑکی سے شادی ہو جائے تو؟“
 ”دوسری بات اچھا چیز اسٹینٹس وغیرہ ہو جاتی ہے۔“

آپنی کا یہ جواب اس کی سمجھ میں اتنی تفصیل سے آیا تھا۔ پھر اس نے کبھی آپنی کی زندگی کو تفصیل سے کرید ہی نہیں۔
 اور آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ ہر ذمہ کریدنے کے لیے ہوتا بھی نہیں، اور یوں بھی جو چیز سامنے نظر آ رہی ہو۔ اس کی کرید کر لیا کرتا۔
 رات کے کھانے پر وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا بس کسی طرح صبح ہو جائے تو یونیورسٹی جائے، پھر وہاں سے گھر ایک ہی دن میں گھر بھی تو بہت یاد آنے لگا تھا۔
 مگر آپنی دو دفعہ اسے بلانے آگئیں تو ناچار اسے اٹھنا پڑا۔
 ”ارے آؤ بیٹھو، بیٹھو کہاں جناب ہو گئی تھیں؟“
 ”جی کہیں نہیں، یہیں تھی۔“ وہ آہستہ سے جواب دیتی وہیں بیٹھ گئی۔
 ان کا دوست بھی وہیں موجود تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔
 ”بھلا کیا ضرورت تھی مجھے بلانے کی۔“ اس پر اسے جاوید بھائی کی لگاوت بھری گفتگو سے الجھن ہو رہی تھی۔
 جو لوگ اپنی بیویوں سے تحقیر آمیز لہجے میں بات کرتے ہوں پھر انہیں کیا حق ہے کہ وہ اپنی سالیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کریں یا انہیں خوش کریں۔
 ”آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہی ہیں۔“ زوار شاہ نے دُش اس کی طرف بھائی۔
 ”رکھ دیجئے لے لوں گی۔“ میں نے رکھائی سے کہا اور اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
 ”بھابھی، آپ کی بہن بالکل بھی آپ کی طرح نہیں ہیں۔“ وہ سنگ پر اس وقت ہاتھ دھو رہی تھی۔
 جب اس نے زوار شاہ کی رائے سنی۔
 ”جواب! آپنی کی کوئی آواز نہیں آئی۔ اور وہ بول بھی کیا سکتی تھیں۔“
 ان کے بس میں ہوتا تو وہ شاید زوار شاہ جیسے آدمی کو اپنے گھر میں بھی نہیں ٹھہرتیں۔

”تو آپ جاوید بھائی سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“
 ”اس موضوع پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“
 آپلی کے لہجے میں ٹھنکن تھی۔ ”اور تم بھی سو جاؤ، صبح
 یونیورسٹی جانا ہے کہ نہیں۔“
 ”جانے پر یاد آیا کہ امی نے کہا تھا کہ آپ نے مجھے
 بلایا تھا۔ مگر کس لیے؟ یہ تو ابھی تک پتا نہیں چل
 سکا۔“

”پتا چل جائے گا، فی الحال تو سوؤ۔“
 لیکن سوناٹا آسان کب تھا۔

اس پوری رات میں عجیب عجیب سے خواب
 دیکھتی رہی، تو صبح اپنی سوچی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے
 غصہ آنے لگا۔

حالا تکہ ربحا اکثر مجھ سے کہتی تھی۔

”تمہاری آنکھیں اتنی خوب صورت ہیں ارم، کہ
 تم ذرا بھی رو لیا سو کر اٹھو تو یہ اور زیادہ قیامت ڈھاتی
 ہیں۔“

اور میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا
 دیا تھا۔

کہ ربحا بی بی کا ”قیامت ڈھانا“ تو ہر دوسرے جیسے
 میں آتا تھا۔

کسی کی فلم ہٹ ہو گئی تو قیامت، کسی اداکارہ کی
 طلاق ہو یا شادی تو قیامت۔

میں تو اب ربحا کے جملوں کو خاطر ہی میں نہیں لاتی
 تھی۔

”ارم جلدی کرو۔“
 ”بس آپلی آئی۔“ وہ بیک کاندھے پر لٹکاتی ہوئی

بولی۔

آپلی ناشا ڈاننگ ٹیبل پر لگا چکی تھیں۔ اس کے
 باوجود بھی اس کے پاس بیٹھ کر چائے پینے کا نام نہیں

تھا۔

اس نے یونہی کھڑے کھڑے جلدی جلدی دو
 گھونٹ چائے کے اتارے۔

چائے پیتے پیتے یونہی اس کی نگاہ جاوید بھائی پر چلی
 گئی۔

وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے ان کی آنکھوں
 میں کیا تھا۔ وہ ایک دم چوری سن گئی۔
 ”تم آج آؤ گی؟“ جاوید بھائی نے براہ راست ہی
 اس سے پوچھ لیا۔
 ”نہیں۔“ اس کے منہ سے اتنی تیزی سے نکلا کہ
 وہ خود شرمندہ ہو گئی۔

”تم جب سے آپلی کے یہاں سے آئی ہو، کتنی چپ
 چاپ ہو۔“

”نہیں تو۔“
 ”نہیں تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ مگر ہے کہ
 تم اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔“

فارس اسے ایسے ہی بڑی بین کے سمجھایا کرتی
 تھی۔

”تو اور کس پر توجہ دیتی ہوں؟“ وہ بلاوجہ ہی چڑ گئی۔
 ”کاش کہ تم کسی اور پر بھی توجہ دے لیا کرو۔“

فارس نے شراوت سے کہا۔
 ”بلکہ کسی اور کو چھوڑو، خود اپنے آپ کو ہی کبھی
 غور سے دیکھا ہوتا، خود پر ہی توجہ دی ہوئی تو آج یہ
 نہیں ہوتا۔“

”اب خبردار جو تم نے آج کے واقعے کا کسی سے ذکر
 کیا۔“ میں نے آنکھیں نکالیں۔

”توبہ کرو۔“ فارس نے کہا۔ ”لیکن سچ بتاؤ علی بھائی
 نے تمہیں کہاں دیکھا تھا۔ اور کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں نے اتنے غور سے اس کی باتیں نہیں سنی
 تھیں۔“

”اچھا۔ وہ کیسے ہیں؟“
 ”ٹھیک ہوں گے۔“

”یہ کس قسم کا جواب ہوا۔“ فارس نے چڑ کر کہا۔
 لیکن میرا دل بھی کہیں اور تھا اور دماغ بھی۔

آج اتنے دنوں بعد گئی تھی، تو ربحا نے بتایا کہ
 اعراف نے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا
 ”بہت دنوں سے آپ کی دوست نظر نہیں آ رہی، خیریت

تو ہے۔“

”جس ہیرو سے سب بات کرنا چاہتے ہوں، وہ اگر
 آکر تمہارے بارے میں پوچھ لے تو کون نہ مر جائے
 حیرت سے ان خدا۔“

”اچھا تھا کہ مر رہی جاتیں۔“
 ”شرم تو نہیں آتی نا۔ سچ بتاؤ اعراف سے پہلے بھی
 تمہاری بات ہوئی ہے۔“

”یار کیا ہو گیا ہے، اسے کیا ضرورت ہے مجھ سے
 بات کرنے کی اور مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اس کی
 بات پر غور کروں۔“

میں نے یہ بات کہنے کو تو ربحا سے کہہ دی تھی۔
 لیکن دل کی اپنی ہی تاویل ہوئی ہیں۔
 اپنے خواب ہوتے ہیں۔
 اپنی خوش فہمیاں ہوتی ہیں۔
 گھر اگر بھی بہت دیر تک سوچتی رہی۔ ”اس نے کیا
 کہا ہو گا۔ اس نے کیوں پوچھا تھا اور پھر صرف میرا
 ہی کیوں۔“

میں رات کو کتنی ہی دیر تک جاگتی رہی۔ اور اس
 دن پہلے دفعہ میں نے صبح کو اپنی آنکھوں سے طلوع
 ہوتے دیکھا۔ زندگی کے کتنے ہی برس گزر گئے تھے۔
 لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔

”تم کیا سوچتی رہتی ہو؟“ ایک دن فارس نے مجھے
 پکڑ لیا۔

”کچھ نہیں۔“
 ”کچھ کیسے نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں، جس دن سے
 تم آپ کے پاس سے آئی ہو بہت چپ چپ رہنے لگی
 ہو۔ میں نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی اور آج پھر کہہ
 رہی ہوں، بولو غلط کہہ رہی ہوں۔“

”نہیں بھئی۔“ میں گھبرا گئی۔ ”تم نے پہلے کبھی کوئی
 بات غلط کہی ہے۔ بات یہ ہے کہ شاید میں ہی کچھ غلط
 ہوں۔“

مجھے صبح کا واقعہ یاد آیا۔

میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی، جب اچانک ہی کوئی
 میرے قریب آکر بیٹھ گیا۔

میں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ ظاہری بات ہے
 کوئی بھی اسٹوڈنٹ کسی بھی جگہ بیٹھ سکتا ہے، اب
 کسی پر کوئی پابندی تو نہیں تھی۔

تو میں نے بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا کہ کافی کام کرنا
 تھا۔ پھر اسائنمنٹ سہنٹ کروانا تھا۔ حالانکہ صبح
 بات تو یہ تھی کہ صرف فلم ہی کانڈ پر چل رہا تھا، ورنہ
 ذہن تو جانے کہاں، ہٹک رہا تھا۔

آج صبح آتے ہوئے میں نے اعراف کو دیکھا تھا۔ وہ
 ربحہ سے شاید کسی موضوع پر بات کر رہا تھا۔
 بلیک پینٹ، گیم ٹرکی شرنٹ، آستینوں کو اس نے
 فولڈ کیا تھا اور اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

کہ میں نے بے ساختہ ہی نظر نہالی تھی۔
 وہ دونوں اس طرح کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ
 میں گزر بھی نہیں سکتی تھی اور اب واپس پلٹنا بھی بڑا
 عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ میں راستہ
 ہی مانگ لیتی۔ اور راستہ تو مانگ لیتی لیکن پتا نہیں کیوں
 میرا دل ہی خراب ہو گیا۔

زندگی میں کسی نہ کسی چیز کی کمی آدمی کو خوار ضرور
 کرتی ہے اور ربحہ کے سامنے تو مجھ میں بہت ساری
 چیزوں کی کمی تھی۔
 دولت کی کمی تھی۔
 وہ دونوں چیزوں میں یکساں روزگار تھی۔
 اور جس وقت وہ کسی سے باتیں کر رہی ہو اس وقت
 تو اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

چھوٹی سی خوب صورت ناک کو چڑھا کر باتیں کرتی،
 کچھ اس کی عادت بھی تھی۔ لیکن بعض لوگ ہوتے نا
 جن کو خدا فرصت میں بنا تا ہے، پھر ہر چیز ان ہی کے
 لیے ہی ہوتی ہے۔
 اعراف نے پتا نہیں مجھے دیکھا تھا یا نہیں، پھر مجھے
 خود ہی ان کے نزدیک جانا پڑا۔
 ”پلیز راستہ چاہیے۔“ میں نے کوشش کی تھی کہ
 نظر اعراف کے چہرے پر نہ پڑے۔



www.iqbalpharma.com

نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی

جوشانہ پلس



100% بھول
100% موثر
جرم کے معترفی قہور سے پاک

ٹانسلز کے آپریشن
سے پہلے ایک بار ضرور آزمائیں۔

صرف توت سیاہ نہیں بلکہ لاثانی کا
توت سیاہ + ملٹھی
پراسرار کریں

لاٹانی کا
توت سیاہ
+
ملٹھی
سیرپ



لاٹانی کا
عرق
مہزل

وزن گھٹائیں
صحت پائیں

REDUCE WEIGHT
GAIN HEALTH

ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو کم
کرنے کیلئے موثر دوا



ہی رکھو۔ میں ہاتھ جوڑتی۔
"تو تم کیا سمجھتی ہو کہ ہر دفعہ کیا علی صبا واقعہ ہوگا؟
کیونکہ ان دونوں کا سابقہ ریکارڈ بھی کوئی اچھا نہیں
تھا۔"
اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون دھکا کے پاس
ہی رکھا تھا۔ اسی لیے میں نے اٹھالیا۔
"ہیلو؟"
"ہیلو، تنک تو میری آواز صحیح رہی۔ اس کے بعد نہ
جانے کیا ہوا ایک دم سے چہرے کے تاثرات اور لہجہ
بدل گیا۔ "ہاں جی، نہیں جی بات سنو جی اور لہجہ تو اس
نے ایسا برا کر لیا کہ میں نے کالوں میں انگلیاں ٹھونس
لیں۔ "ہاں جی، میں ارم ہی بول رہی ہوں، تمسی کوئی
کام ہے؟"
"تم آخر کر کیا رہی ہو۔" میں نے اس کے زور سے
چنگلی کالی۔
"آئے ہائے تمیز مار دیا۔" یہ جملہ بھی ریسپور کے
اندرونی ارشاد فرمایا گیا۔
اس کے بعد وہ جانے بھی فون رکھ دیا۔ کیونکہ اگلی
طرف سے بھی فون بجنے لگا تھا۔
"دیکھا، کیسا کام کیا؟"
"کون سا کام، کام تو تم نے کوئی سا بھی نہیں کیا،
صرف بدتمیزی کی ہے۔"
"جناب اعلیٰ طرف علی صاحب تھے۔"
"نہیں سچ۔" قارن اچھل پڑی۔
"مجھے جلدی سے شامش دو، کتنا اچھا کام کیا۔ اب
وہ پاگل ہی ہو گا جو اپنا رشتہ نیچے گا۔"
"اور پاگل سے تو کبھی شادی کرنی ہی نہیں
چاہیے۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ کبھی ریحما کی شادی
نہیں ہوگی۔" قارن نے افسوس سے سر ہلایا۔
"تم سچ جاؤ گی، ہاں اب بتاؤ تم خوش ہونا۔" اس
نے میرا سر ہلایا۔
"جانتی نہیں۔" میں نے سچول سے جواب دیا۔ "دو
سالگ رہا ہے۔ اگر ابو کو پتا چل گیا؟"
"کوئی پتا نہیں لگتا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

اور میں نے کہا بھی آہستہ ہی تھا۔ حالانکہ راستہ ہی
تو مانگا تھا۔
لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اپنا لہجہ بھی بڑا بے مایہ سا
لگا۔ جیسے کسی کال ہی تو مانگ لیا ہو۔
اعراف ایک دم سے ہٹ گیا۔
"سوری۔" آپ کو پریشانی ہوئی۔" وہ واقعی اتنا
شرمندہ ہو رہا تھا کہ خود مجھے بھی خفت کا احساس ہونے
لگا۔
"نہیں سوری کی کیا بات ہے۔" میں نے قدم
آگے بڑھائے۔
"بوجہ مراد بھی اپنے راستے پر مڑ گئی تو اعراف نے
آگے بڑھ کر میرے ہاتھ سے بکس لے لیں۔
"اتنی کتابیں، کیا کریں گی آپ؟"
"بڑھوں گی۔" میں نے سادگی سے کہا۔
"تنبلی بڑھ لیں گی؟"
"ہاں، مجھے اسٹڈی کرنا اچھا لگتا ہے۔"
"صرف کتابوں کی؟"
"نہیں بسا وقت انسانوں کی بھی۔" میں نے
سادگی سے کہا۔
"آپ باتیں اچھی کرتی ہیں۔" اعراف نے بے
ساختہ ہی کہا۔
"آپ؟" یہ میرے لیے نئی اطلاع تھی۔
کیونکہ میں اتنا زیادہ بولتی کہاں تھی۔ گھر میں فارس
بہت زیادہ بک بک کرتی تھی اور خاص طور پر مجھے
سمجھانے کا فریضہ تو اسی نے سنبھالا ہوا تھا۔
اور کلچ میں رہنا بھی۔
کبھی کبھی تو میں غصے میں کہہ دیتی ہوگوں کو مرنے
کے بعد منکر نکیر ملتے ہیں۔ مجھے تو زندگی ہی میں مل
گئے۔ بس ہر کام کرنے سے پہلے تم لوگوں سے پوچھوں
اور پھر ہر کام کرنے کے بعد۔"
"تو مانی ڈیر فرینڈ! تم اگر صرف ہم سے مشورہ کر لو تو
ہم تمہیں اتنے زبردست قسم کے مشورے دیں گے جو
دوسرا کوئی فیس لے کر بھی نہیں دے گا۔"
"اپنے مشورے خدا کے واسطے تم لوگ اپنے پاس

حالات۔ اب کو ایک ہفتے کے بعد ہی پتا چل گیا کہ ہم لوگوں نے کیا شرارت کی تھی۔ یاد دہ سرے لفظوں میں بد تمیزی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہم لوگوں کی ذرا سی غاصبت اندیشی کی وجہ سے اتنا اچھا رشتہ چلا گیا۔

البتہ امی نے کچھ نہیں کہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑی آپا کی طرف سے پریشان رہتی تھیں۔ اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ اب اگر کہیں بیٹیوں کا رشتہ ہو تو ان کی خوشی سے ہو۔

انہوں نے ہم دونوں کو بلا کر صرف اتنا کہا تھا کہ۔ ”جو کچھ بھی کیا وہ اچھا نہیں کیا۔ علی جیسے لوگ بار بار نہیں ملتے۔“

”بس امی لوگوں کو تو ہر کوئی اچھا لگتے لگتا ہے۔“ میں نے کمرے میں آکر کہا۔

”میری بات ہے۔ اس طرح نہیں کہتے۔“

”صحیح تو کہہ رہی ہوں انہیں تو جاوید بھائی بھی بہت اچھے لگتے تھے۔“

”مگر تم نے امی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان میں آنسو تھے۔“ فارس کو ابھی تک افسوس ہو رہا تھا۔ ”امی کہہ رہی تھیں کہ علی اچھا لڑکا تھا تمہیں ہمیشہ خوش رکھتا۔“

”بس رہنے دو امی کوئی نجوی ہیں جو انہوں نے کہا۔“

”اچھا بس۔“ فارس نے۔ مجھے پھر ٹوک دیا۔

”امی کو کوئی بات بتانے کی ضرورت نہیں۔ ماؤں کو ہر چیز کی خبر ہوتی ہے۔“

”دو نہ سو ہی پرانے زمانے کا فلسفہ۔“ میں نے ناگ چڑھائی۔

”ہر دفعہ تو یہ ڈرامہ نہیں چل سکتا۔ تم کسی ایک جگہ ٹک کیوں نہیں جاتیں یہ تیرا رشتہ ہے نا۔ جس کے ساتھ برا سلوک ہوا ہے۔ تمہیں کس کی تلاش ہے؟“

”کیا مطلب۔“ میں ایک دم گڑبڑا گئی۔

”تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو۔ جیسے میں نے کوئی

خفیہ راز پوچھ لیا ہو۔ ایک سیدھی سی بات ہے جس کا جواب اگر لگی میں ہو تو آئندہ آنے والے رشتوں کا انکار نہیں کروانا۔“

”بھی دیکھنا غور کر لینا امی کبھی لائٹ میں نہیں سوتی تھیں اور اب پوری پوری رات ان کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے۔“

امی کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہو۔ اس سے تو بل ہی زیادہ آئے گا؟“

”دماغ خراب ہے تمہارا۔ اس کا مطلب ہے وہ رات بھر سوتی نہیں ہیں۔“

”تو کیا میری وجہ سے۔“ میں جھنجھلا گئی۔

”نہیں پڑوسیوں کی وجہ سے۔“ فارس نے خفگی سے کہا۔

”تمہاری وجہ سے ارم! صرف تمہاری وجہ سے۔“

اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ کچھ سوچ لو۔ تمہیں شاید خود نہیں پتا کہ تم بدل رہی ہو۔ پہلے کم از کم میری باتیں یا امی کی سن تو دیتی تھیں اب نہ جانتے کہاں گم رہتی ہو۔ اول تو سنتی نہیں ہو اور سنتی ہو تو بھتیجی نہیں۔“

”اس سے تو کچھ ایسا لگاں ہو رہا ہے کہ جیسے تم کسی پاگل کا نقشہ بیان کر رہی ہو اور میں کم از کم پاگل نہیں ہوں۔“

”پاگلوں کے سر پر سیٹنگ نہیں ہوتے نہ ان کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے ارم! ایک منٹ لگتا ہے دنیا کو پھڑپھڑانے میں۔ پھر ایسا موقع ہی نہ آئے دو۔“

”الف خدا یا۔“ میں نے سر دونوں ہاتھوں میں قہام لیا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ میرے سر میں درد اور میری سماعت کا جتنا حوصلہ تھا وہ سب استعمال ہو گیا ہے۔ امی کو اگر میری وجہ سے پریشانی ہے تو وہ بے شک ماتم آپنی کی طرح مجھے بھی کہیں دھکا دے دیں۔“

”علی کو جاوید بھائی سے نہیں ملاؤ۔“

”میں کسی کو بھی کسی سے نہیں ملا رہی ہوں۔“ میں چڑھ گئی تھی کتنی دیر سے بحث چل رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا کوئی رزلٹ نہیں

نکلنا تھا۔

اس دنیا کو کتنا شوق ہوتا ہے سمجھانے کا۔

”جو بھی ہو۔ تمہارے لیے بہت اچھا ہو۔“ فارس نے کہا۔

اس کے سابقہ رویوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے رمان سے کہا۔

”تو تو ماں باپ کوئی دشمن نہیں ہوتے۔ یہ اور بات کہ کسی بھی گھر میں عمو“ بڑا بیٹا یا بیٹی قریبان ہو جاتے ہیں۔ جب بھی کسی بڑے بڑے کی شادی کرتے ہیں۔ تو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ایک سو اگر خراب آجائے تو اس سے گھر کس حد تک ڈسٹرب ہو جاتا ہے یا پورے گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔“

اسی طرح ایک داماد بھی خراب نکل جائے تو گھر میں کوئی سکھ بھی دکھ کی طرح ہی لگتا ہے کوئی خوشی خوشی کی طرح نہیں لگتی۔“

جس دن سے میں بڑی آپا کے پاس سے آئی تھی مجھے واقعی کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

بلکہ امی نے دو دفعہ مجھ سے کہا کہ کلج سے واپسی پر آپا کو دیکھتی ہوئی آنا لیکن میری ہمت ہی نہیں ہوئی۔

بلکہ فارس کی تو عادت تھی کہ وہ کبھی کبھی سنا بھی جاتی یا بڑی آپا کو ہی زندگی گزارنے کے چند خوب صورت نکتے بتاتی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ کوئی بھی کام کر رہی ہوتی ذہن اس کا بڑی آپا کی طرف ہی رہتا۔

اور اب بھی نوٹس بناتے بناتے میں نہ جانے کن کن زمانوں کی سیر کر آئی۔

مجھے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ کوئی وہیں آکر بیٹھ گیا تھا۔

یو نہی دھیان میں گم میں نے نظر اٹھائی تو۔۔۔ تو اعراف پر نظر پڑی۔

”نہ گھٹیں آپ؟“ اعراف نے مسکرا کر کہا۔

”جی۔“ امی میری کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ ”میں تو نوٹس بن رہی تھی۔“

”واقعی۔۔۔ اعراف نے میرے پین کی طرف اشارہ کیا۔“

”اوہ خدا یا۔“ قلم کا ایک تھک تو اترا نہیں تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید قسم کا غصہ آیا۔

”تو بے کس قدر جھپٹی ہو گئی ہوں یا دوسرے لفظوں میں یا گل۔“ میں نے ہونٹ دانتوں سے کاٹا۔ ”یہ شخص جو سامنے بیٹھا ہے یقیناً اس نے کچھ اچھا تو نہیں سوچا ہو گا۔“

لیکن اعراف نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ جاتے جاتے اس نے رک کر صرف اتنا کہا۔

”آپ کو دیکھ کر ایسا تصور کیوں ابھرتا ہے جیسے آپ بچپن کی کسی کہانی کا کردار ہیں۔ ایک بھولی بھٹی شہزادی جو اپنے گھر کا رستہ بھول کر کسی دوسرے دیس میں آگئی ہو۔ آپ جیسی لڑکیاں کم کم ہی دیکھی ہوں گی یا شاید نہ ہونے کے برابر۔“

اس نے کہا اور وہ چلا گیا۔

اور پھر جاتے جاتے میرا صبر و سکون لے گیا۔ میں ایسی یا گل تو نہیں تھی۔

مگر اس دن آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے دس دفعہ یہ جملہ دہرایا ہو گا۔

میں نے بہت سوچا کہ رہا کو بتا دوں کہ میں اس سے کبھی کوئی بات چھپاتی نہیں تھی۔ لیکن بتانے کو تھا ہی کیا؟

اول تو شاید وہ میری بات کا یقین ہی نہیں کرتی کہ اعراف کی ایک نگاہ کی لڑکیاں منتظر رہتی تھیں۔

وہ بھلا ساری دنیا کو چھوڑ کر میرے پیچھے کیوں آئے گا۔ پھر وہ خود ہی اس قسم کا نہیں تھا۔

بس وہ پڑھائی یا پڑھائی سے متعلق ایک شوٹی ہی میں رہتا اور نہ ہی وہ زیادہ بات کرنے کی کوشش کرتا۔

اس کے گروپ میں تین لڑکے اور لڑکیاں تھیں اور وہ عمو“ ان ہی کے ساتھ رہتا۔

پھر اب کیا ہو گیا؟

میں نے بہت دفعہ یہ سوال خود سے پوچھا۔

”پھر۔۔۔؟“ آئینے سے پوچھا۔

نہ آئینے نے ہی کوئی جواب دیا۔
نہ خود سے ہی کوئی جواب ملا۔ وہ جو کہتے ہیں تاکہ
زندگی ایسا لطیفہ ہے۔ جس پر ہنسنے کے بجائے رونا آتا
ہے تو صحیح کہتے ہیں۔



بڑی آپا نے شام کو مجھے بلایا تھا۔
اب پتا نہیں کیوں؟ اور شام کو جانے کا مطلب یہ
تھا کہ پھر ان کے گھر رات کو رہنا پڑتا اور نیند تو اب گھر
میں نہیں آتی تھی تو آپا کے یہاں کہاں سے آتی۔
لیکن جانا تو تھا حالانکہ میں نے فارس کی کتنی منت
کی کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی چلے۔
لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔
کالج میں رہتا تھا مجھ سے پوچھا بھی کہ کیا ہوا لیکن
میں نے نال دیا۔
”میں آئی سے کہوں گی کہ اب پڑھائی میں تمہارا
دل نہیں لگتا۔ بس اب تمہاری شادی وادی کر دیں
۔ چاہے علی جیسے بندے کے ساتھ ہی۔“
”کیا کیو اس ہے۔“ میرے سامنے اعراف کا سر ہا
آلیا۔

پھر اس کی باتیں۔
بالکل ابھی ابھی تو دل نے دھڑکننا سیکھا تھا۔
ابھی ابھی تو آنکھوں میں سونے آئے تھے۔
وہ کتنا بھی اعراف کی باتوں سے دامن چھڑاتی۔ مگر وہ
اس کا لہجہ سوہ اس کے لفظ۔
پھر سرگوشیاں جیسے ہواؤں میں بکھر جاتیں۔
پھر سوچنے کا جائگے کا ایک لامتناہی سلسلہ
شروع ہو جاتا اور اب رہا کو دیکھو کس قدر ڈراؤنی
باتیں کر رہی تھی۔ چاہے علی جیسے بندے سے ہی
سہی۔

اس وقت بھی بڑی آپا سے باتیں کرتے ہوئے میرا
ذہن رہا کی باتوں ہی میں الجھ رہا۔
”تم کہاں کھو جاتی ہو؟“

”کہیں نہیں۔“
”اچھا بات سنو تمہارے لیے کوئی رشتہ وغیرہ آیا
ہوا ہے؟“
”نہیں تو۔ کیوں؟“ میں نے حیرت سے آپا کو
دیکھا۔

”بس ایسے ہی۔“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مسلتے
لگیں۔
”پھر بھی۔ آپا کوئی بات تو ہوگی؟“
”نہیں بس ایسے ہی۔“ ان کے چہرے پر کرب کی
تحریق تھی یا خفت کی۔ یہ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن
آپا کا سوال مجھے الجھن میں ڈال گیا تھا۔
”آپا کچھ تو بتادیں۔“

”کیا بتاؤں میرے پاس بتانے کے لیے کچھ ہے ہی
نہیں۔ زوار شاہ نے رشتے کے لیے کہا ہے۔ ایک دفعہ
پہلے بھی ذکر کیا تھا۔ پھر وہ ملک سے باہر چلا گیا۔ اور اب
اس نے تمہارے جاوید بھائی سے کہا ہے۔ جاوید تو
پچھلے چند دن سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن میری ہمت
ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اور اب بھی میں نے تمہیں اس
لیے نہیں بتایا ہے کہ مجھے تمہاری کوئی قربانی چاہیے
یا میں تم سے کہوں گی کہ تم میرا گھر بچانے کے لیے زوار
شاہ سے شادی کر لو۔ لیکن بات یہ ہے کہ مجھے ایک
بات جاوید نے بھی کہی۔

لیکن اگر تمہاری کہیں کوئی بات چل رہی ہوتی تو
میں کہہ سکتی تھی کہ ارم کا رشتہ تو تقریباً طے ہے
یا اس طرح کی کوئی سی بھی بات۔“
”اف خدا یا۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”کم از کم
آپا میں ابھی اتنی سمجھ داری تو بھی کہ انہوں نے مجھ
سے کچھ طلب نہیں کیا۔ میں ہر چیز دے سکتی تھی۔ مگر
اپنی ذات کی قیمت پر کچھ نہیں۔“
اور اب تو اس کا اپنا بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ تو میں آپا کو
کیا دے سکتی تھی۔

میں کتنی ہی دیر سر جھکا بیٹھنے کی بیٹھی رہ گئی۔
اس دنیا میں سب ہی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔
گھر بھی اور دل بھی۔

اب گھر بچاؤ لیل۔
اسے غصہ زوار شاہ پر بھی نہیں تھا۔ نہ جاوید بھائی
پر، ہر انسان اپنے طرف سے مجبور ہوتا ہے۔ جاوید
بھائی کا طرف اتنا ہی تھا۔

ماٹ از رات کا اصول صرف ہم جیسے لوگوں کے
معاشرے ہی میں چلتا ہے۔ بس اپنے سے کمزور انسان
کو دباتے جاؤ۔ بڑی آپا نے ہی ایک دفعہ اسے بتایا تھا
اور وہ جلد اسے آج یاد آ رہا تھا۔
”انسان کسی سے کسی وقت بھی برا سلوک کر سکتا
ہے۔ بات صرف موقع ملنے کی ہے۔“

”تو اس سے یہ ظاہر ہوا ارم سلطان! کہ آج جاوید
بھائی کو بھی موقع مل گیا۔“
مجھے آپا پر بھی غصہ تھا انسان آخر اپنے آپ کو اتنا
کمزور بنائے ہی کیوں کہ دوسرا ہر کوئی اس پر اپنی مرضی
مسلط کر سکے۔

میں شام کو گھر آئی تو کمرے میں چار اجنبی خواتین
موجود تھیں۔
”امی! یہ کون ہیں؟“
”بھول گئیں۔“ امی نے چائے نکالتے ہوئے کہا۔
”یاد رکھتے کہ اب دوسری بست سی باتیں
ہیں۔“ میں نے چیخے سے سوچا۔
”بتائیں نا؟“ اس نے دل کے دھڑکنے کو نظر انداز
کیا۔

”علی کے گھر والے ہیں۔“
”کیا؟ اب یہ لوگ دوبارہ کیوں آئے ہیں؟“
”اب کوئی آگیا ہے تو اسے نکال دوں اور پھر یہ تو ان
لوگوں کی مہمانی ہے کہ تمہاری ایک دفعہ کی بد تمیزی کے
بعد دوبارہ بھی آگئے۔ ورنہ آج کل بڑا برا وقت ہے۔“
”امی! ہم لوگ جس کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔
وہاں برا وقت کبھی جاتا ہی نہیں ہمیشہ ہمارے آگے ہاتھ
باندھ کر کھڑا ہی رہتا ہے۔ کسی موسٹ او بیڈنٹ
سرونٹ کی طرح۔“

میں پیر پختی اندر آئی اور امی حیران سی کھڑی رہ
گئیں۔ یہ میری عادت نہیں تھی اور فطرت بھی نہیں

پھر ایسا کیا ہو گیا تھا۔

رات کو گھر کے محل میں ایک تباہی خوار سہلے
توا دھرا دھری باتیں کر کے اس کشیدگی کو کم کرنے کی
کوشش کرتی رہی۔ پھر تھک گئی۔

”مسئلہ کیا ہے ارم۔“
میں نے غصے میں فائل کٹنی پین کا کپ زور سے
بند کیا۔ چادر کا کونہ زور زور سے پکڑ کر بھاڑا سفار سے
غور میرا معاشرہ کرتی رہی۔
”میرا خیال ہے ہاتھ روم بھی صاف کرو۔ آج تم
نے سارے ضروری اور غیر ضروری کام نمٹانے کا سوچ
لیا ہے۔“

”میں کر رہی ہوں غیر ضروری کام۔“ میری خوب
صورت موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو فارس
گھبرا گئی۔

”امی کو بہت شوق ہو گیا ہے شادی کرنے کا۔“
لیکن اب تو اجازت نہیں دیں گے۔ تم صحیح کہہ رہی
ہو نا؟ ہاں بھی کاسن سینسن کی بات ہے امی ابائی اتنی
اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ پھر وہ امی کو شادی کی
اجازت کیسے دے سکتے ہیں؟“

”فارس! میں نے آنکھیں نکالیں۔ تم اچھی طرح
جانتی ہو میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔“
”مجھے اچھا تو نہیں لگتا کہ ہوں تو میں تمہاری بہن
اور اس قسم کی باتیں دوستوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔“
”کس قسم کی بات؟“ میں نے ابرو اچکائے۔

”اب اس ٹایک پر بات نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔“ خت
زہر لگتی ہیں ایسی ٹوکیاں جو کندھے اچکا کر، آنکھیں چپکا
کر بات کرتی ہیں۔ لڑکیوں میں گریس ہونا چاہیے۔“
”افہ پلیر خاموش ہو جاؤ اب اور نہیں پکاؤ۔“
”تمہیں کون پکا سکتا ہے۔“ فارس نے ناراضی
سے کہا۔ ”تم۔ خود تو چاہو اگلے کو پکا لو یا کچا کھاؤ، کچھ
بھی فرق نہیں پڑتا۔“

”پڑتا کیوں نہیں ہے یہ؟“ میں نے شرارت سے
کہا۔ ”کچا کھانے سے بد بھنسی ہو جاتی ہے۔“
”بس باتیں بناؤ۔“

”اچھا لوگ تو کہتے ہیں کہ میں بولتی ہی نہیں۔“
”جن لوگوں نے یہ کہا ہے انہیں پتا ہے کہ حسن خود آدھی دلیل ہے۔“
”اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خوب صورت ہوں انہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔“
”سچ بچہ۔“ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”آج پہلی دفعہ تم نے اقرار کیا ہے کہ میں خوب صورت ہوں۔“

”خوب صورتی کو نہ اقرار کی ضرورت ہے نہ انکار کی۔“ فارس کا لہجہ مدہم تھا۔ مگر میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔

”عمر کا ایک وقت آتا ہے جب ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ آپ کسی غیر ضروری چیز کی طرف دھیان دیں۔ سوچ کے سلسلے ہوں یا خوابوں کے سارا دھیان صرف ایک طرف ہی ہوتا ہے۔“

فارس کی دو ایک جگہ بات چل رہی تھی اور اس سے پہلے بھی اس کے رنگ کو جب بنا کر رشتے واپس چلے جاتے تھے۔

ای کا خیال تھا کہ کوئی اچھا رشتہ آجائے تو وہ ہم دونوں کی ساتھ ہی شادی کر دیں۔ پھر آپا کی طرف سے بھی پریشان رہتی تھیں۔ امی کو پریشان دیکھتی تھی۔ تو دل میں ایک کلک سی ہوتی تھی کہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ امی علی کا رشتہ آنے پر خوش تھیں۔

کتنا اچھا ہوتا کہ یہ رشتہ فارس کے لیے ہوتا پھر تو کوئی مسئلہ کی بات ہی نہیں تھی۔

”اعراف“ میں نے ایک گہری سانس لی ہے۔ ”یہ دل جو مجھ سے بہت کچھ کہتا ہے۔ یہ دل تم سے بھی تو کچھ کہتا ہو گا۔ پھر راستے آگے کیوں نہیں جاتے۔ سب چیزیں اپنی جگہ کیوں رک گئی ہیں۔“

شام ڈھلنے کو کبھی سارے پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں پر محو پرواز تھے اور میں بڑی بے بسی سے سوچ رہی تھی کہ ”کاش کبھی ایسا ہوتا کہ وہ دل جس پر سے پہلے

اختیار ختم ہوتا ہے۔ پھر اعتبار۔ جو آپ کو دھوکا دے کر کسی اور کے لیے دھڑکنے سے لگتا ہے۔ وہ چاند جو ماتھے پر چمکتا ہے۔ وہ چاند مقدر تک کیوں نہیں آتا۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو کم از کم وہ دل ہی واپس لوٹ آئے۔ ان پرندوں کی طرح جو اپنے اپنے ٹھکانوں پر شام کو واپس آ جاتے ہیں۔ اور دیکھا جائے تو اس دامن میں ہے ہی کیا۔ کچھ جملے اور کچھ کہتی نظر۔

اب اتنی ذرا سی بات پر کیا زندگی حرام کریں اور ایسا بھی نہیں ہوتا کہ صرف اندھیرے ہی منظر ہوں، ہمیں نہ کہیں روشنی کا بھی وجود ہوتا ہو گا۔ میں اس روشنی کو تلاش کروں گی۔

میں نے سوچا مگر روشنی۔ روشنی کا تعلق تو کہیں اندر سے ہوتا ہے۔ اندر اس جگہ سے جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی شاید خود اپنی بھی نہیں۔ اور اندر اندر بہت اندھیرا ہے۔ ”میں شیخی سوچتی رہی فارس نے جھانکا تو وہ بھی ڈر گئی۔“

”تم کیا مجھے کی طرح ایک جگہ تک کر بیٹھ گئی ہو۔“

”میں چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ اس لیے۔“
”تنتے چھوٹے سے گھر میں کہاں زیادہ چلنے کی گنجائش ہے۔“ فارس نے افسردگی سے کہا تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔
”اب تم مسکرا کیوں رہی ہو؟“

”رونے کا کوئی موقع ہے نہ دستور۔ اس لیے صرف مسکرایا جا سکتا ہے۔ اُنی سمجھ میں بات۔“
”سنا صبح کہہ رہی تھی۔ ارم بہت عجیب ہو گئی ہے سوال اور جواب کا آپس میں کوئی تعلق ہی نظر نہیں آتا۔“

”آہا بہت اچھی بات ہے۔ کاش یہ بات کبھی دل کو بھی سمجھ میں آجائے۔“
”دل کو سمجھایا جا سکتا ہے۔“ فارس نے خفگی سے کہا۔

”دل ہی کو تو نہیں سمجھا سکتے۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی

میں رات کی روٹی ڈالنے جا رہی ہوں۔ تم سالن دیکھ لیتا۔

”دیکھ لیا۔“ فارس نے چٹکی بجائی۔ ”ہم کتنی بے مقصد گفتگو کر رہے تھے جو اگر کوئی سن لیتا تو بچ بچ ہمیں پاگل یا بے وقوف تو ضرور سمجھتا کہ یار یہ کیسی گفتگو ہو رہی ہے۔ جس کا نہ سر ہے نہ پیر۔ اور یہ دونوں خواتین ضرور پاگلوں کے کسی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ہماری گفتگو کا آخری جملہ سن لیں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم نہ پاگل ہیں نہ بے وقوف۔ حقیقت ہمیشہ اپنے آپ کو نہیں نہ کہیں سے منوا ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ حقیقت میں بڑی طاقت ہے۔“

جب تک فارس بات کرتی رہی میں سر اٹھا کر اس کا منہ نہ دیکھتی رہی۔
بس ایک لمحے کی شعبہ گری ہوتی ہے۔
ایک لمحہ ہی پھیل کر زندگی بن جاتا ہے۔
بس ایک لمحہ میں نے ایک گہری سانس لی۔
پچھلے پڑھ سال سے میں زندگی کو گزار رہی تھی یا زندگی مجھے کچھ پتا نہیں تھا دل پر دھند کی ایک چادر تنی ہوئی تھی۔
اور صبح نظر نہیں آتی تھی۔

ابھرتے ڈوبتے سورج سے توڑیوں رشتہ میں شام اوڑھ کر سو جاؤں اور سحر نہ کروں۔ آج ہی تو میں نے دعا مانگی تھی۔

”کہ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو وہ دل ہی واپس لوٹ آئے ان پرندوں کی طرح جو شام کو اپنے ٹھکانوں پر واپس لوٹ آتے ہیں۔“
مصیبت کی گھڑی طے ہوتی ہے باقی سب کچھ رائیگاں ہے۔

اور مجھ جیسے لوگ جنہیں خوابوں سے محبت ہو جائے۔ آج میرے پاس وقت تھا یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مجھے حقیقت کے دو جملوں کے پیچھے چلنا ہے یا سارے ان دو لمحوں کے پیچھے۔

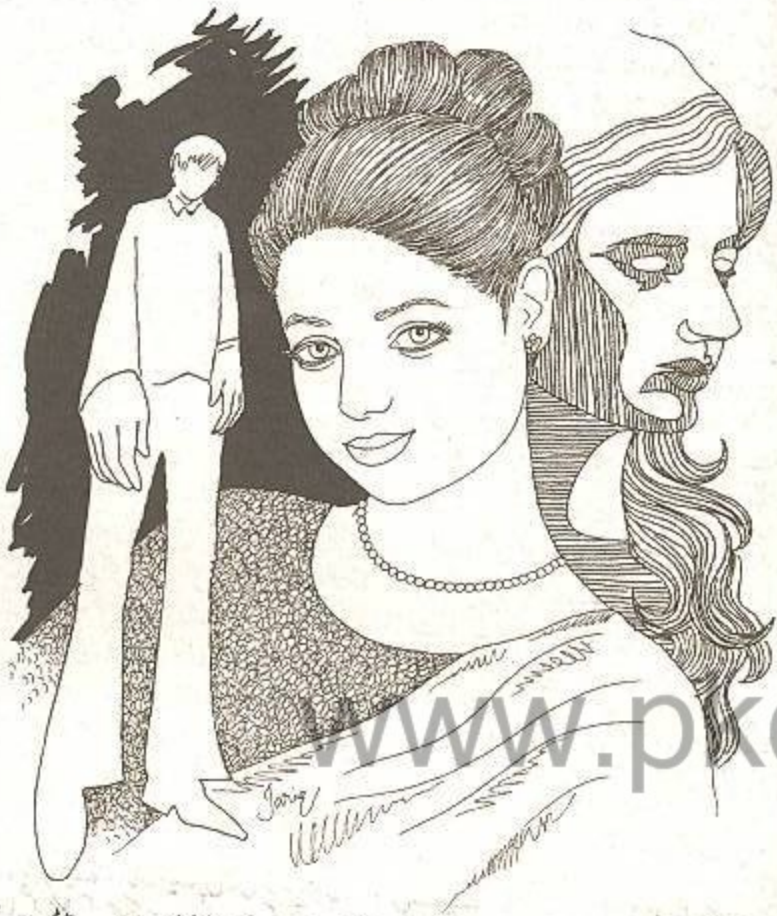
جب اعراف نے مجھے دیکھا تھا اور مجھ کو کہا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا عمر تو وہیں ختم ہے۔ ایک زندگی

تھی وہ میں اس کے پیچھے گنوار ہی تھی۔ اور گنوار بھی دیتی۔ مگر ہم زندگی پھر صرف خوابوں کے چرے ہی تو سنوارتے ہیں۔ لیکن آج ایک دم سے۔ سال کی رت جگموں سے سرخ آنکھیں یاد آئیں۔ یا پھر ان کا صبر سامنے آیا۔ وہ ہم دونوں کے لیے دعا کرنے والے اٹھے ہاتھ یاد آ گئے۔

وہ ان کی جائے نماز میں سجدے کی میلی جگہ یاد آ گئی۔ ”محبت کی طرح حقیقت کی گھڑی بھی طے ہوتی ہے۔ باقی سارے راستے اندھیروں کی طرف جاتے ہیں۔“ یہ فارس نے کہا تھا۔

اور میں نے سوچا تھا۔ کہ ہم جیسے لوگ جو زندگی بھر صرف خوابوں کے چرے ہی سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ اور بھولی جاتے ہیں کہ بہت سی چیزیں روشنی سے مشروط ہوتی ہیں۔ اور روشنی صرف وہاں ہے جہاں حقیقت ہے۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تتلیاں پھول اور خوشبو
راحت جبین
قیمت --- 225/- روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37- اردو بازار، کراچی۔



”لے منی! یہ باہر پھینک آ۔ غریبوں نے رکھے روزے اور دن بڑے آئے۔ میں نے بخت کی تھی یہ کج بخت ماری ساری پگھل کر جڑ جڑا گئیں۔ اب تو کسی کام نہ آئیں گی۔ سب پیسے حرام ہو گئے۔“

اماں نے بڑے دکھ سے موم بیٹوں کا خراب ہو جانے والا پیکٹ منی کے ہاتھ پر دھرایا۔ منی نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ دس بارہ موم پتیاں جڑ کر ایک ناقابل استعمال شکل اختیار کر چکی تھیں۔ جون جولائی کی گرمی نے موم پگھلا ڈالا تھا، اوپر سے شاید یہ پیکٹ کسی چیز کے نیچے دبایا تھا جس کی شکل اتنی بگڑ گئی تھی۔ منی نے اسے کھول کر نرم ہو جانے والا موم باہر نکال لیا۔ نرم، نرم، ملائم ساموم اسے اتنا بھایا کہ اسے باہر پھینکنے کا ارادہ ایک بل میں ترک کر دیا گیا۔ دھانکے نکال کر پھینک دیے اور موم کو ہاتھوں سے دبا دیا کہ منی نے ایک گڑیا بنائی۔

گڑیا جو اس کی مرضی کے مطابق عمل کرتی تھی۔ منی کا جب جی چاہتا تھا اسے بٹھا دیتی۔ اس کے بازو اوپر اٹھا کر رقص کا پوز بنادیتی۔ یا سیدھی بیٹھی گڑیا کا سر دائیں بائیں موڑ دیتی۔ یہ ایک اچھا مشغلہ تھا۔ وہ شام تک اسی میں مصروف رہی۔ اماں خوش کہ کبھی ٹپلی نہ بیٹھنے والی منی موم بیٹوں کے ناکارہ پیکٹ کی بدولت امن سے ایک جگہ ٹک کر بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر موم کی گڑیا اور منی لازم و ملزوم ہو گئیں جب بھی منی کی ڈھنڈیا بجاتی وہ گھر کے کسی نہ کسی پرسکون

ایکے گوشے میں اپنی موم کی گڑیا کو کسی نئے انداز سے کھڑا ہونا یا بیٹھنا سکھارہی ہوتی تھی۔ اب تو اسے اتنی مہارت حاصل ہو چکی تھی کہ ایک منٹ میں تھاپ تھوپ کر ایک پتلا بنایا۔ مہارت سے اس کے دو کان کھینچے۔ منی سی ٹانگ ابھاری اور پٹل سے اس کے ہونٹ اور آنکھیں تراش ڈالیں۔ سچا سچا کوئی لباس اسے پہنایا اور پھر اسے اپنے بیٹھنے یا رقص کرنے کا کوئی نیا انداز سکھانے کو بھی اس کی ٹانگ اوپر اٹھا دیتی۔ منی دو گول ہاتھ ہوا میں معلق کر دیتے جاتے۔ اماں خوشی سے نہال ہر کسی آتے جاتے کو بتائیں کہ موم کے ایک بے کاریکٹ نے ان کی جان کو کیسا سکون دیا تھا وہ منی جو بھی ان کے قابو نہیں آتی تھی۔ جس کے پیچھے انہیں طویل پتی دوپٹوں میں بہرہ دینے کو جاکتا پڑا تھا، اس موم کے پیکٹ نے قابو کر لی تھی۔ اب اگر اماں کو اس سے کام کروانا ہوتا تو پہلے کی طرح گھنٹوں اس کے پیچھے چنچنایا چاہتا نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ ایک ہی دھمکی کا گرہ ہوتی تھی۔

”اٹھ جانی! نہیں تو لے کر تیری یہ موم گلی میں پھینک دوں گی۔ پہلے کام کر لے پھر بھیت ریتا۔“ اور منی منہ بسورتی اٹھ کھڑی ہوتی پہلے گڑیا کو کسی محفوظ ٹھکانے پہ چھپاتی پھر بھاگ کر وہ کام کرنے میں جت جاتی۔ اماں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ انہوں نے گویا منی نامی بھوت کو قابو کرنے کا منتر جان لیا تھا۔

وقت یونہی بر لگا کر اڑتا رہا۔ منی اسکول جانے لگی۔ اب وہ موم کی گڑیا کے ساتھ کھینچنے کے لیے بہت کم وقت بچا پاتی تھی۔ کیونکہ اسکول سے واپسی پر گھر کا کام کر کے جب وہ بہن جی کے گھر سے قرآن کا سبق یاد کر کے آتی تو اکثر ہی شام کے سایے لے لے ہو چکے ہوتے تھے پھر کچھ دیر بہن بھائیوں کے ساتھ اچھل کود اور رات کا کھانا کھاتے ساتھ ہی منی کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ ”وکل تو گڑیا سے ضرور کھیلوں گی۔“ کا عند کرتی بچپن کی میٹھی نیند کی دواؤں میں کھو جاتی۔ ہاں مگر جمعہ کا دن اس کے لیے بڑا خاص ہوتا تھا۔ اسے اسکول سے چھٹی ہوتی تھی۔ وہ صبح سویرے اپنی

گڑیا کے ساتھ کسی اکیلے گوشے میں جا بیٹھتی اور پچھلے چھ دنوں کی کسر اس ایک دن میں پوری کر لیتی اس روز اس کے کسی بہن بھائی کو اس کے ساتھ کھینچنے کی اجازت نہیں تھی۔

بھائی تو خیر دونوں اس سے بڑے تھے اس لیے اسے ساتھ نہ کھلانے پر ایک ایک ہاتھ جڑ کر ہر گلی میں کھینچنے چلے جاتے مگر بھائی تین سال کی چھوٹی بہن منی آپا کی سارا وقت منٹیں کیے جاتی۔ اس کے لیے موم کی گڑیا ایک کریر تھی۔

”تپا تو دوں گی نہیں، ساتھ کھینچے دو۔“ منی بے نیازی سے گڑیا کو کپڑے پہنانے یا اور ایسے ہی کسی کام

میں مصروف رہتی۔

”آپ! میں اپنے دودھ میں سے دودھ تمہیں بھی دوں گی۔“ اب کے رشوت پیش کی جاتی۔ منی ایک شان بے نیازی سے اسے دیکھتی۔

”اور ساتھ میں وہ بیٹھا رہا تھا بھی دو گی جو ہر صبح صرف تمہارے لیے بنتا ہے اور ماں مجھے میٹیں کرنے پر بھی نہیں دیتی۔“

منی نے بغور چھوٹی بہن کو دیکھ کر دوسری شرط بھی پیش کر دی۔ منی خوشی خوشی راضی ہو گئی اس کے لیے اس پر اٹھنے کی کوئی اہمیت نہیں تھی جو اسے ہر روز صبح میں ملتا تھا۔ مگر منی کے لیے وہ حجر ممنوعہ تھا۔

بھائیوں کا جس دن دل چاہتا وہ ماں سے فرمائش کرتے۔ ماں فوراً ”ماں صدقے“ ماں واری میں ابھی اپنے پیر کو پکا دیتی ہوں۔“ کہتی انہیں بیٹھا رہا بنا دیتی مگر تمہیں کرنے پر بھی منی کو کبھی کبھار ہی ایسا براٹھا ملتا تھا اور نہ عموماً ”سوچھی روٹی اور رات کے بچے سارن کے ساتھ ناشتہ کرتی۔ بھائیوں کو روز چڑی روٹیاں ملتی تھیں۔ کبھی کبھار منی پر بھی عنایت کر دی جاتی اور اس روز منی کا چرو کھل کر گلاب ہو جاتا جب وہ ویسی بھی سے چڑی ہوئی روٹی سے ناشتہ کرتی تھی۔

وہ بھی قصوں کے معمولی گھرانوں جیسے ایک گھرانے کی بیٹی تھی۔ جہاں سب بچت عموماً ”بیٹیوں کے حصے سے کی جاتی ہے۔ ماؤں کے پاس ایک ٹھوس دلیل ہوتی ہے۔

”اس ننیدی کا کیا ہے۔ ابھی کھانے سمنے کو منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ دودھ میں کاندھوں برابر آجائے گی تو پھر اسے جینز بھی چاہیے ہو گا اور ہمارے گھر کون سا قانون کا خزانہ دفن ہے۔ آج بچائیں گے تو کل اس کو جیزوینے کے قابل ہوں گے۔“

اور بیٹوں کے بارے میں ان کا فلسفہ ہوتا ہے۔

”یہ آج کھائیں گے تو کل کمائیں گے۔ ہمیں ان ہی کے سہارے بڑھاپا گزارنا ہے۔ آج ہم ان کا خیال کریں گے تو کل بڑھاپے میں یہ ہمارا خیال کریں گے۔“

ایسا کہتے ہوئے مائیں بالکل بھول جاتیں کہ ان کی بیویوں کے آنے کے بعد حالات کس رخ پر جاسکتے ہیں۔ بس انہیں گھر میں بڑی ہوتی بیٹیوں کی خوراک ایک اضافی خرچ نظر آتی تھی۔ منی بھی اسی سوچ کا شکار تھی۔

منی کے شرط مانتے ہی اس نے اسے گڑیا کو چھونے اور کھیلنے کی اجازت دے دی۔ منی نے بڑے شوق سے کالی سیاہ بھتے جیسی گڑیا کو ہاتھ میں لیا اور منی سے پوچھا۔

”آپ! تمہاری گڑیا کالی کیوں ہے؟“ منی قدرے شرمندہ ہو کر تانے لگی۔

”ایسے ہی۔ کالی تو نہیں ہے۔ بس ذرا سالوٹی ہو گئی ہے تو نے نہیں دیکھا پہلے ماں کیسی گوری ہوتی تھیں اب وہ بھی کالی ہو رہی ہیں۔ سب لوگ پہلے گورے ہوتے ہیں پھر چولے کے پاس بیٹھے اور دھوئیں کی وجہ سے کالے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میری گڑیا بھی پہلے گوری تھی۔ اب یہ جی ساوٹ ہو گئی ہے۔“

منی کو اس کا فلسفہ سمجھ میں آیا نہیں اس نے سر ہلادیا۔ جبکہ منی اس کا کہنے کو سوچنے لگی۔ آج سے پہلے اسے اپنی گڑیا کے کالے ہونے کا خیال نہیں آیا تھا ویسے بھی اب موسم کی چمک ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ماں سے موسم بٹیوں کے ایک اور پکٹ کی فرمائش کرے گی تاکہ اس کی گڑیا پھر سے گوری ہو سکے۔

اب اسے ماں کی جگہ گھر کے سب کام سنبھالنے پڑ گئے تھے۔ ماں اب سارا دن یا تو پرانے صندوقوں سے کپڑے نکال نکال کر جانے کیا کیا باقی رہیں یا پھر محلے کے گھروں کے دورے پر نکل جاتیں۔ اب تو عرصہ ہو گیا تھا منی ان کی اس عادت سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ اور اکیلی ہی گھر کا سب کام نمٹاتی۔ بھائیوں کے خورے بھی برداشت کر لیتی اور وہ جس کام کا حکم دیتے اسے بھی فوراً ”جی جی“ یہ اس کی خوشی سے زیادہ اس

کی مجبوری تھی۔ کیونکہ دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں اب سرداری تھی۔ منی کے لیے وقت بالکل ایک لگی بندھی ڈگر پر چل رہا تھا جس میں اس کی اپنی ذات کے لیے دیکھی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ ماں کو سہیل ملتا کبھی پسینہ نہیں رہتا تھا۔ سو اس کی کوئی قابل ذکر سہیلی بھی نہ تھی جس کے پاس وہ دھڑکی بیٹھ ہی لیا کرتی۔ اگر کام سے فارغ ہو جاتی تو گھر کی سیکن زوہ پسترا کھڑتی دیواروں کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھتی رہتی۔ اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں ایک ایک کر کے اگلے گھروں کو رخصت ہو چکی تھیں۔ کبھی بھی آدھی رات میں بے وجہ آنکھ کھل جاتی تو دیر تک نیند ہی نہ آتی۔ وہ تب وہ بڑی حسرت سے سوچتی کیا وہ زندگی کی خوشیوں پر کوئی حق نہیں رکھتی؟ کیا زندگی کے دامن میں اس کے لئے کچھ بھی انوکھا کچھ بھی اچھا نہیں ہے مگر اس کے ان بے زبان بے آواز سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسے ہی کسی دن کورات کرتے اس نے ماں کو اپنی ایک رشتے کی بہن کو بتاتے سنا کہ وہ اپنے دو پرانے کپڑے چھپا کے بیٹے سے مغلوب ہے اور ماں انتظار کر رہی تھیں کہ کب وہ اگر ان سے شادی کی بات کرتے ہیں اس کا دل کسی خوشگوار لے پر دھڑکنے لگا۔ کوئی تھا اس دنیا میں وہ جس کے نام منسوب تھی۔ اب سے نہیں بہت بچپن سے مگر اسے علم ہی نہ تھا۔ اس نے بہت سوچا مگر نہ تو ان پچا کا ناک نقشہ یاد آیا نہ ہی ان کا کوئی بیٹا اس کے دماغ کی اسکرین پر جلوہ گر ہو سکا۔ اس نے اپنے لیے ایک خیالی پیکر تراش لیا۔

اب منی کی تنہائی کو سوچوں کے لیے ایک دلچسپ اور نیا موضوع مل گیا تھا وہ کون تھا کیسا تھا کیا کرتا تھا کہاں رہتا تھا۔ یہ سب سوچتے سوچتے اس کو ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ وہ اس ان دیکھے شخص کی محبت میں مبتلا ہوئی جا رہی ہے۔

پھر ایک دن بالکل عجیب گئی۔ وہ گمنام سے چچا اپنی بیوی کے ہمراہ آگئے تھے۔ وہ خوشی سے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ بیٹھک میں دونوں بیٹیوں لپا اور امی کے ساتھ ان کی لمبی ملاقاتیں ہو رہی تھیں اور وہ منی کے ساتھ مل کر ان کی خاطر تواضع کا سامان تیار کر رہی تھی اس نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی کہ اندر کیا طے ہو رہا ہے۔ وہ تو بس خوش تھی کہ اب کوئی دن جاتے ہیں اس کی زندگی ایک حسین کڑواہٹ لینے والی ہے۔ ہوش تو تب اڑے جب بیٹھک سے دونوں بھائی کف اڑاتے باہر نکلے اور چند لمحوں بعد چچا چچی بھی ناراض سے اٹھ کر چلے گئے۔

اسے کچھ پتہ نہ چل سکا تھا کہ کیا ہوا مگر کافی دنوں تک بے چین اور اداس بھرنے کے بعد وہ جان ہی گئی کہ چچا چچی کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ دونوں بھائی ان لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے چچا چچی سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ ان بھائیوں کو بیٹیاں نہیں دیتے تو یہ بات بھی بھول جائیں کہ کبھی منی ان کی بہو بنے گی۔ مگر چچا چچی اس بات پر آمادہ نہیں تھے ایک تو ان کی بیٹیاں پڑھ لکھ گئی تھیں اور یہ دونوں بھائی مل سے آگے پڑھ نہ سکے تھے۔ دوسرے چچا چچی ان لڑکیوں کے مزاج کے پیچھے پن سے گھبرائے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ وٹے ٹے کی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ مگر بھائیوں نے اس بات کو غیرت کا مسئلہ بنالیا۔

ماں نے بڑی حسرت سے اپنی پڑوس کو بتایا تھا کہ اگر چچا چچی مان جاتے تو ان کو گھر سامان سے بھر جانا تھا۔ اچھا کھانا پیتا گھر نہ تھا۔ بیٹیوں کو اچھا جینز لازمی ملنا تھا۔ منی کو پہلی مرتبہ ماں کا رویہ قابل نفرت لگا تھا۔ وہ اس بات پر تو افسردہ تھیں کہ ان کے بیٹوں کو ان فرمائش پر لڑکیاں نہیں دی گئیں مگر انہیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ منی کا بچپن سے جڑا رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بیٹی ایک۔ اچھے گھر کی بہو بننے سے محروم کی گئی تھی۔ انہیں منی کی خوشیوں کے قتل کی کوئی پروا نہیں تھی۔

MEDICAM DENTAL CREAM



مسوڑھوں سے بخون



دانتوں میں ٹھنڈا آگے



دانتوں میں درد

اگر چاہو یہ تعلیقیں ہی نہ ہوں تو...

میڈی کیم ڈینٹل کریم



سوچنے والی کیا بات ہے!

☆ ☆ ☆
اسی شام ایک مرتبہ پھر بڑے سالوں بعد چچا اور چچی ان کے گھر آئے۔ وہ آیا کا حال پوچھنے آئے تھے خاطر تواضع سے فارغ ہو کر وہ پھر اپنی برسوں پرانی کالی سیاہ گڑیا کے پاس آن بیٹھی۔ گڑیا کو اٹھاتے ہوئے اس نے اسے سانولے پڑتے ہاتھوں کو دیکھا جو مشقت کا کام کر کے بھدے ہوئے تھے۔ ابھی وہ گڑیا سے دل کا درد کہنے ہی والی تھی کہ چچی اس کے پاس آگئی سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے دھیرے سے کہا۔

”پتہ! تیرے ساتھ ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ مگر تو ہمت کرے تو اپنا نصیب پھوٹنے سے بچا سکتی ہے۔ میرا بیٹا تیرا بانی ہے۔ ہم نے اس کی شادی کر دی تھی۔ مگر سال بعد اس کی بیوی بچے سمیت مر گئی۔ اس بات کو بھی دو سال ہو گئے ہیں۔ میرا بیٹا لاکھوں کے کاروبار کا مالک، بڑھا لکھا، خوب جوان ہے۔ تو اگر ہاں کرے تو ہم تجھے اپنی بیویاں کر لے جائیں گے اچھی طرح سوچ لینا یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔“
منی نے اضطرابی انداز میں گڑیا کی مڑی ہوئی گردن سیدھی کرنی چاہی۔ وہ ٹوٹ کر دھڑ سے الگ ہو گئی۔ منی نے حیران نگاہوں سے گڑیا کی طرف دیکھا اور ایک پل میں فیصلہ کر لیا۔ چچی پر آمد سے باہر نکل رہی تھی جب وہ بھاگ کر اس کے پیچھے آئی۔
”چچی! کچھ کہنے کی کوشش میں اس کی سانس پھول گئی تھی۔“

”اس جمعہ کو بھائیوں کے سالے کی شادی ہے۔ سب وہاں ہوں گے۔ صرف میں اور آیا گھر میں ہوں گے۔“
وہ رکی پھر بغور چچی کی طرف دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔ چچی نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

”میرا بچہ! ہم ضرور آئیں گے۔ تم تیار رہنا۔“ جمعہ کے روز اپنے خوب دو لہا کے ہمراہ رخصت ہونے سے قبل باپ سے پیار لینے کو چھٹی منی نے سوچا۔
”بار بار موڑ تو موم کی گڑیا بھی ٹوٹ جاتی ہے۔“

ماں بھائیوں کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ تب آنے جانے والوں کے سوالوں سے منی کو پتہ چلا کہ کی منگنی ٹوٹنے کا ساری دنیا کو علم تھا۔ عورتیں اظہارِ افسوس کرتیں تو اس کے سینے میں آگ بھڑک اٹھتی مگر وہ لب سے رکھنے پر مجبور تھی۔ بھائیوں کی شادیاں دھوم دھڑکنے سے ہو گئیں۔ شادی میں آئے ایک خاندان نے منی کو اپنی بیوی بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تھوڑی جا بچ بڑا ل کے بعد ہاں کر دی گئی یوں بھائیوں کی شادیوں کے محض چھ ماہ بعد ہی منی کے لیے تیار کر کے رکھا جانے والا چیزے کرخصی رخصت ہو گئی۔

☆ ☆ ☆
زندگی منی کے لیے مزید دشوار ہو گئی وہ سارا دن کام کرتی اور بھائیوں اور بھابیوں کے منہ کے بگڑے زواہیوں کو دیکھتی۔ منی کے لیے پھر کسی نے کچھ نہ سوچا۔ ایسا ہمار ہو گئے۔ منی ان کی دن رات خدمت کرنے لگی۔ تب سارے گھر والوں کی بے رخی سستے بوڑھے بیمار باپ کو اپنی خدمت گزار بیٹی کی اجڑی زندگی کا دھیان آیا۔ انہوں نے شور مچایا تو بھائیوں نے ایک ماہ بعد انہیں مبارک باد دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کا رشتہ طے کر چکے ہیں۔ ایک ماہ بعد سادگی سے شادی کر دی جائے گی۔ منی کچھ ختم کر رہ گئی اس کی شادی محلے کے اس شخص کے ساتھ طے ہو گئی تھی جو دو بیویوں کو طلاق دے چکا تھا اور جس کے تین لوفریئے تختے میں بری طرح بدنام تھے۔ اپنے واویلا تو کیا مگر ان کی کسی نے نہ سنی۔ منی کو بے اختیار اپنی موم کی گڑیا یاد آئی۔ وہ خود بھی تو موم کی ایک گڑیا ہی تھی جسے جس طرح چاہا موڑ توڑ کر رکھ دیا گیا بغیر یہ سوچے کہ ایسا کرنے سے اسے کتنی تکلیف ہوگی۔

اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے سامان سے اپنی گڑیا نکالی۔ لکڑی کی بوسیدہ صندوقچی میں پڑی یہ گڑیا ابھی تک اسی طرح گردن موڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ جس طرح آج سے دس پندرہ سال پہلے دیکھ رہی تھی منی گڑیا کو دیکھ کر زار و قطار روئی۔

عزیزتوں کے گلے شکر

برسات کے موسم ہمیشہ یادوں کے مغلستان میں لے جاتے ہیں۔ اچھی اور بری یادیں۔ تلخ اور شیریں یادیں۔ روشنائی خانہ بھی یادوں کے طویل سفر پر رواں دواں تھی۔

وہ اس وقت پچھلے برآمدے میں کھڑی رم جھم برستی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھلے دھلائے درختوں اور جھومتے سرخ گلاب کے پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ دائیں طرف کبھی زنان خانے کے ہاتھ روم ہوا کرتے تھے۔ سیکن زوہ دیواروں والے جن کی ٹوٹی چھت میں چوہوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ اکھڑے پلستر والے فرش پر جگہ جگہ پانی بھر جاتا تھا۔ زنان خانے کے ان ہاتھ روم میں غسل کرتے ہوئے ایکٹائی آنے لگتی تھی۔ لیکن اب ان کا نام و نشان نہیں

مکمل ناول

تھا۔ بہت سال پہلے انہیں گرا دیا گیا تھا۔ پھر اس اونچی نیچی زمین کو برابر کر دیا گیا۔ یہاں پر اس وقت بہت بڑا چڑیا گھر بنادیا گیا تھا۔ ہر طرح کے جانور چمٹ دی کرتے ہوئے موسم آنجوائے کر رہے تھے۔ یہ چڑیا گھر اس کی چھوٹی دونوں بیٹیوں ماہی اور ماہ نور کے شوق کی وجہ سے ان کے بابا نے بنوا کر دیا تھا۔ اس سے آگے وسیع و عریض لان تھا۔ کبھی یہاں کچا مچن ہوا کرتا تھا۔ بڑے بڑے آم اور کیکر کے درخت سایہ فگن تھے۔ آج لاش گرین گھاس سے پورا لان ساجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اعلا قسم کے پھولوں کے جھومتے پودے ہمارد کھا رہے تھے۔

لان میں ماہی اور ماہ نور کے لیے جھولے بھی لگوائے گئے تھے۔ پورچ میں ایک جیب کھڑی تھی۔



اس کے ایک طرف ہادی اور ماہ نور کی سائیکل بھی کھڑی تھیں۔ ایک ہی رنگ کی یہ دو سائیکل زخام لے کر آیا تھا۔ یہ دونوں پچھلے صحن میں اپنے سائیکلنگ کے شوق کو پورا کرتی تھیں۔ سبھی بھی ان کے بابا موڈ میں ہوتے تو دونوں بچوں کو فارم ہاؤس لے جاتے۔ کون کتنا ہے وقت بدل نہیں سکتا۔ وقت بدل سکتا ہے۔ سوچ میں تبدیلی لانی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لگن اور صبر کی۔

تیرہ سال بعد وہ ایک خوشنما جزیرے پر قدم رکھ چکی تھی۔



لیکن ہاؤس میں سروریکھشن کا اعلان ہوتے ہی ہاسٹلز کے رومز میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ سب کی خواہش تھی کہ ہاسٹل سے نکلے والی وہی پہلی لڑکی ہو۔ روشانے ازبک نے جگر جگر کرتی آنکھوں سے اس دل افروز منظر کو دیکھا اور کامن روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہ رات کو ہی پیکنگ کر چکی تھی۔ اس وقت اسے صرف ایک فون کرنا تھا۔ گھوڑا لگی کے ایک اسکول میں اس کی ایک سال چھوٹی بہن شانزے زیر تعلیم تھی۔ اس نے مس ڈانٹا سے پریشانی لے کر شانزے کو فون کیا۔ شانزے بھی ”ازبک ہاؤس“ جانے کے لیے بے تاب تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے بابا احمد خان ازبک کا ڈرائیور مہی سی چمکتی گاڑی میں اسے لینے کے لیے آگیا۔ ازبک ہاؤس میں پہنچ کر آزادی اور خوشی کے احساس نے روشانے کو فریش کر دیا تھا۔ وہ اسی سرشاری کے عالم میں گول فریڈ عبور کر کے سیکنڈ فلور پر اپنے اور شانزے کے مشترکہ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا سجا سجاا قیمتی ڈریکوری سنز سے سجا اور جگہ گانی روشنیوں میں نہایا روم بالکل ویسے ہی تھا۔ وہ کائن کا آرامہ وہ سوٹ پہن کر بیٹھ گئی۔

ماربل کے چمکے فرش پر اپنے ازلی با اعتماد باوقار انداز میں چلتی ہوئی لان کے پچھلے حصے کی طرف آگئی۔ چار

عدد خوب صورت مورگھاس پر ٹہل رہے تھے۔ تب ہی ڈرائیور نے پر ایک اور گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

روشیا بھاگ کر شانزے تک پہنچی۔ شانزے نے خوب ہنسنے پہنچ کر اسے پیار کیا تھا۔ وہ بھی بیٹگی آنکھوں سے شانزے کی پیشانی چومنے لگی۔

”یہ بزرگانہ اسٹائل کہاں سے سیکھا ہے؟“ شانزے نے حیرانی سے پوچھا۔ بابا کو یہ ڈل کلاس کے محبت بھرے اظہار کہاں بھاتے تھے اور غریبی سے ایسا کچھ سوچنا بھی حماقت تھی۔ روشانے مسکراتی تھی۔ شانزے ہنسنے لگی۔

مانکہ ممی اپنی شادی کے دس سال بعد بھی ان کے لیے نئی ممی تھیں۔ ممی بابا کی سیکنڈ وائف تھیں۔ حسین اسٹائلش اور بابا کی طرح جمل انیو کیٹلڈ۔ ان کی ماں بد صورت اور ان بڑھ تھیں۔ سو بابا کا ملال نئی ممی کو باکر بھی کم نہیں ہوا تھا۔ ان کی ماں نے بد قسمتی سے بابا کے ساتھ صرف تین سال گزارے تھے۔ ممی کی وفات کے بعد مسز ڈیوڈ نے ان کی پرورش کی تھی۔ چار بابا بچے سال کی تھیں تب بابا ان کے لیے نئی ممی لے آئے تھے۔ مانکہ کا ان کے ساتھ روایتی سویتی یاں کا سا سلوک نہیں تھا۔ وہ ان سے نہ محبت جتاتی تھیں نہ نفرت۔ بابا کی صرف وہ ہی دو اولادیں تھیں۔ مانکہ ہر سال انہیں مردہ بیٹے کا تحفہ دے کر انہیں خوب ناراض اور بے زار کر دیتی تھیں۔

اس کے بابا بہت وجیمہ آدمی تھے۔ اونچے لمبے گورے چنے، دولت کی فراوانی، خوشحالی کی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک تھی۔

مانکہ اپنے دو بھائی چیزیں لاتی تھیں۔ جو کہ روشی اور شانزے سے چھ سات سال بڑے تھے۔ وہ دونوں برلن کے کسی کان میں زیر تعلیم تھے۔ کافی بڑھا کو اور ذہین لڑکے تھے۔ آتے جاتے حال احوال پوچھنے کے علاوہ اسٹڈیز سے متعلق گفتگو بھی کرتی جاتی تھی۔ ویلی اور صمیم کی آمد بھی قریب قریب تھی۔ شانزے طویل سفر کی وجہ سے بہت تھکی ہوئی تھی۔

اس لیے کھانا کھا کر فوراً ”سوئی“ جبکہ روشی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت مہم جو قسم کی لڑکی تھی۔ ہر وقت متحرک رہتی۔ جبکہ شالی اپنے آپ میں گن رہنے والی تھی۔ وہ کھیل کود میں حصہ بھی نہیں لیتی تھی۔ البتہ روشی کو نت نئے گیمز میں دلچسپی تھی۔ وہ فٹ بال، اور جمناسٹک کی شوقین تھی۔ اسکول کی طرف سے ہونے والے سالانہ مقابلوں میں اس نے سائیکلنگ میں اول انعام حاصل کیا تھا۔

اسکول کا پہلا دن پہلے دن کی دہان کی طرح یادگار تھا۔ ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ دونوں پرچوشی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ تب ہی مسز ڈیوڈ کی تاسف سے بھرپور آواز سنائی دی۔

”دیکھا شے بے زکریا ہاوتیں۔“

”ماما... روشی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ پہلی مرتبہ کچھ کھو دینے کا احساس روشی کی پلکوں کو بھگو گیا تھا۔ پھر ممی ان کی زندگی میں چلی آئیں۔ بے حد لبرل سی ممی نے نہ جانے کیسے ان کی خاندانی روایات کو تسلیم کر لیا تھا۔ شاید بابا کی محبت میں۔ بابا کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر تو ضرور تھا، تب ہی تو ممی جیسی ماؤرن خاتون یا ہر نکلنے سے پہلے چادر اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ بابا کے حکم سے سرمائی کاتو وہ تصویر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

ان کے ازبک ہاؤس میں دنیا جہاں کی نعمتیں تھیں۔ انگریزی ٹیلی ویژن، اخبارات اور رسائل کی بہتات تھی۔ روشی اچھی کتابوں کی دیوالی تھی۔ سو اس کا سارا دن بابا کی لائبریری میں گزرتا۔ پھر اچانک اک نیا واقعہ رونما ہوا۔ ممی اسپتال گئیں اور ان کے لیے ایک اور بھائی لے آئیں۔ بہت خوب صورت گلابی گلابی سایہ بچہ صرف چار دن زندہ رہا تھا۔ مسز ڈیوڈ نے بتایا یہ ان کا چچا تھا جو کم سن ہی میں ہی وفات پا گیا تھا۔ ممی رور رہی تھیں۔ شالی کو بھی رونا آگیا۔ ان دنوں بابا بہت جلال میں نظر آتے تھے۔ اور ممی بہت چپ چاپ تھیں۔ پھر غیر محسوس طریق سے ممی

ان کے قریب آتی چلی گئیں۔ اب وہ ان کے بیڑ روم میں اچھا خاصا وقت گزارنے لگی تھیں۔ ان کے ساتھ اسکول کی باتیں کرتیں۔ اپنے بچپن کی شہرتیں بتاتیں۔ یہ کہ وہ بہت جیتس تھیں۔ بہت بولڈ تھیں۔ بالکل روشی کی طرح۔ روشی اپنی تعریف پر شرماتی تھی۔

ممی اکثر انہیں اپنے ساتھ لے جاتیں، کبھی پردے والی گاڑی میں وہ ایٹ آباد کی سڑکوں کو روندتے ہوئے دور دور تک نکل جاتیں۔ ایک دن ممی انہیں ریسنورٹ لے گئی تھیں۔ وہ تینوں فیملی کیبن میں بیٹھی تھیں۔ ممی نے آنے سے پہلے انہیں بھی چادریں اوڑھنے کے لیے دی تھیں۔ شانی حیران تھی کہ روشی نے بغیر احتجاج کیے چادر اوڑھ لی ہے۔ ممی نے انہیں بہت اسٹائلش کپڑے بھی لا کر دیے تھے اور ان کی جینز شرٹ وارڈروپ سے غائب ہو گئی تھیں۔ روشی نے کچھ دیر سوگ منایا اور پھر خوشی خوشی ممی کے لائے ڈریسز زیب تن کر لیے۔ وہ زیادہ دیر صدمات کو اپنے اوپر طاری کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ پھر ایک صحیح بیاناے ناشتہ کرتے ہوئے ان دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا تھا۔

”اب تم دونوں پردے والی گاڑی میں اسکول جایا کرو گی اور دونوں چادر اوڑھا کرو گی۔ شانی تو خاموش رہی تھی البتہ روشی بول پڑی۔

”ہم لوگ سندھی اجرک اوڑھ کر اسکول جاتے ہیں بابا!“

”گڈ گرل۔“ بابا کے منہ سے تعریفی کلمات برآمد ہوئے۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹیاں ہر طرح کے ماحول اور وقت کے مطابق خود کو ہر جگہ ایڈجسٹ کر سکتی ہیں۔“

”تھینکس بابا!“ ان دونوں کے لیے بابا کے یہ الفاظ کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ وہ کہاں کسی کی تعریف کرتے تھے۔

”روشیا اب تم ہائیک لے کر باہر نہیں جایا کرو گی۔“

سائیکلنگ بھی نہیں کیا کروگی۔ اسکی شنگ کے خیال کو بھی دل سے نکال دو۔ میں تمہارے انہیملو گوٹھ بھجوا رہا ہوں۔ یہ گھر ہے کوئی Zoo نہیں۔ ویسے بھی تم اب بڑی ہو چکی ہو۔ یہ شوق بچپن کی حد تک ٹھیک تھے۔ ان لیکشنز میں تم دونوں کی ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔" پاپا روشی کے حواس اڑاتے می کی طرف متوجہ ہوئے۔

"مائلہ! تم انہیں اپنی زیر نگرانی کو کنگ سکھاؤ گی۔ سلائی کرکھائی بھی آتی چاہیے۔ ان کی ماں ہر فن میں عاق تھی۔ ہمارے خاندان کی عورتیں بہت سلیقہ مند ہوتی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔ اچھی بیٹیاں اپنے بزرگوں کی دستار کا بھرم رکھتی ہیں۔"

"لو کہ پاپا! روشی جو احتجاج کرنا چاہتی تھی ایک دم لب بھینچنے خاموش ہو گئی۔

ان کا تعلق ازبک قبیلے سے تھا۔ ان ہی رسم و رواج کی وجہ سے روشی کو اپنی بہت سی خواہشات کا کلا گھونٹا پڑا تھا۔ گوٹھ میں دادا تھے، دادی تھیں۔ دادا کے کئی بھائی تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے پاپا شہر میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ شہر کے بہترین انگریزی اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ دادی کو تو فرنگی عورت کا بوتیوں کو نہلاتا دھلاتا پسند نہیں تھا۔ بلکہ انہیں تو روشی اور شانی کا فر فر انگریزی بولنا بھی کھلکتا تھا۔ جینز شرٹ سے بھی انہیں چڑھتی تھی۔ روشی انگریزی، چانینز اور اٹالین کھانوں کی شوقین تھی اور دادی کو اس کے کھانے پینے پر بھی اعتراض رہتا تھا۔

جانوروں سے روشی کو بے انتہا محبت تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ کئی کئی دن بولائی بولائی سی پھرتی رہی تھی۔ اس کی افسردگی کو محسوس کر کے شانی نے کہا۔ "روشی! تم اچھی طرح رو کر دل کا غبار ہلکا کر لو۔ میں جانتی ہوں تمہیں جانوروں کے گوٹھ چلے جانے کا بہت دکھ ہے۔"

میں کیوں روؤں۔ بزدل روتے ہیں شانی ڈارنگ!

میں تو اسٹون گرل ہوں۔ بہت بہادر اور دلیر۔ وہ ایک دم ہنسنے لگی تھی۔ اس کی بہت ساری عادتیں پاپا جیسی تھیں۔ بہادر، نڈر اور کسی بھی مشکل میں نہ گھبرانے والے۔

بیکن ہاؤس میں ان کا آخری سال تھا۔ ان لیکشنز کے بعد انہیں صرف ایک مرتبہ اسکول جانا تھا، صرف اور صرف فاسل ایگزامز کے لیے۔

ان ہی دنوں دادا، دادی ازبک ہاؤس چلے آئے۔ وہ ہری پور سے آرہے تھے۔ دادی کی زبانی پتا چلا تھا کہ ہری پور سے ایک سو پچتر میل دور روشی اور شانی کا نھیلی گاؤں ہے۔ اس کے نانا، دادا کے گئے بھائی تھے۔ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اس کے آخری نمبر والے ماموں قبیلے کے سردار بنے تھے۔

اورنگ زیب میر سے بڑے اس کے پانچوں ماموں وفات پا چکے تھے اور آج دادا نے بنایا تھا کہ وہ ہری پور اس لیے گئے تھے کہ اورنگ زیب میر نے اپنے سب سے بڑے ولی عہد کے سر پر دستار رکھ کر اسے علاقے اور قبیلے کا سردار بنا دیا ہے۔ اور اس مہمن میں وہاں ایک ضیافت کا انتظام تھا۔ دادا بتا رہے تھے اور نگ زیب میر بہت دولت مند ہیں۔ ان کی بہت سی جاگیریں اور جائیدادیں تھیں۔ اورنگ زیب حیات میر کے اس عمل کو دادا بہت سراہ رہے تھے۔

دادا ایک ہفتہ رو کر چلے گئے تھے۔ ان دنوں دادی، می سے کافی کچھنی کچھنی سی تھیں۔ صرف ایک ماہ بعد دادا اور دادی ایک دفعہ پھر آگئے تھے۔ اس دفعہ وہ اکیلے نہیں تھے، بلکہ پوری برادری ان کے ساتھ تھی۔ یکایک پورچ میں کئی گاڑیاں آکر کھڑی ہونے لگیں۔ پچانو، جیب، پراؤ، دادا کی لینڈ کروزر، ہر رنگ کی قیمتی چمکتی دکتی گاڑیاں۔ ان گاڑیوں میں سے اعلیٰ سفید رنگ کے اونچے شعلے والے اوپھو عمر آدمی نکلے۔ کئی

عورتیں بھی تھیں۔ پراؤی لباس پہنے، سر سے لے کر پیروں تک سیاہ چادر میں لپی۔ لان میں لگے بھولوں کی طرف بھاگتے دوڑتے، اچھلتے کودتے بچے بھی تھے۔ کچھ حیران اور کچھ پریشان دکھائی دیتے پاپا بھی برلیف کیس تھا مے آگے تھے۔ یقیناً دادا نے فون کر کے انہیں بلوایا تھا۔ شانی اسے کھینچ کر گلاس ونڈو کی طرف لے آئی تھی۔ اب وہ دونوں بہت حیرانی کے عالم میں بیٹھ جھانک رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد سب لوگ اندر چلے گئے تھے۔ مسز بوڈ نے کہا۔

"تم دونوں کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوچ نہیں بیڈ روم سے ملے گا۔"

"کیوں آئی؟" شانی خاموش تھی، مگر روشی خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

"تو کونسی بچن۔" مسز بوڈ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پھر بھی آئی۔ اچھے تو بتا لے۔" روشی کا چہرہ اپنے عروج پر تھا۔ مگر انہیں کچھ بھی بتایا نہیں گیا۔ چند گھنٹوں بعد گاڑیوں کے دروازے کھولنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ گاڑیاں اشارت ہوئیں۔ چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا تھا۔

روشی نے بڑے برابر کیے اور پھر اپنے بند پر آکر ڈھے گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی شانی کی طرح گہری نیند سو رہی تھی۔

رات ڈنر کے لیے انہیں نیچے بلوایا گیا تھا۔ وہ فریش ہو کر نیچے آئیں، تو ڈائننگ روم میں ایک اور چہرے کا اضافہ ہو چکا تھا۔

"یہ گل بخت ہے۔" ان دنوں کے چروں پر بڑے بڑے سوالات مائلہ نے پڑھ لیے تھے۔

"کون گل بخت؟" روشی نے حیرانی سے پوچھا۔

شانی ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔

"تمہاری ماں کی چچا زاد اور تمہارے پاپا کی خالہ زاد گل بخت ہے۔" یہ تعارف کچھ الجھا الجھا سا تھا۔

"میلو گل بخت!" اس نے اور شانی نے انا انا ہاتھ

گل بخت کی طرف بڑھایا۔ ہراؤی گھیر وار سرخ روشی لباس زیب تن کیے ملے تھکے سونے کے زوہرات پہنے وہ بے حد گوری سی لڑکی روشانے کی ہم عمر تھی۔ پندرہ سالہ گل بخت نے شرائے شرائے انداز میں ان سے ہاتھ ملایا۔

"گل بخت نہیں، می بولو۔ یہ تم دونوں کی نئی می ہے۔" مائلہ نے پورے اطمینان سے انہیں بے اطمینان کر دیا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں می؟" روشی لرزا تھی۔ وہ پہلے کی طرح پرسکون تھیں۔

"تو کیا انہیں پاپا کی ایک اور شادی کا افسوس نہیں ہوا؟" روشی نے حیرانی سے سوچا۔

"می! آپ کو دکھ نہیں ہوا، آپ نے پاپا کو روکا نہیں۔"

خواتین ڈائجسٹ

اس کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



بساطِ دل

آمنہ ریاض

قیمت --- - 500 روپے

مکملہ لاہور:

کتبہ مدران ڈائجسٹ: 37 - ادوار بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

”ہمت سے معاملوں میں ہم لوگ بے اختیار ہیں“
تمہارے دادا کا یہ فیصلہ احمد کو بھی پسند نہیں تھا۔ مگر تمہارے پاپا کو ایک اور شادی پر اعتراض نہیں تھا کہ ایک وارث کی خواہش ان جاگیرداروں کو مضطرب رکھتی ہے، ہمیشہ۔ انہیں اعتراض گل بخت سے شادی پر تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ ان پڑھ ہے۔“ مانگہ نے انگریزی میں اپنی بات مکمل کی تھی۔

ان دونوں نے بے دلی سے کھانا کھایا۔ پھر اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔
شالی کو دادا، دادی کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ گل بخت سے پایا اتنے بڑے تھے ان کے خاندان میں بے جوڑ شادیوں کا نزل سے رواج تھا۔

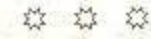
مئی اور گل بخت کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ مئی جیسی حسین اور پڑھی لکھی فر فر انگریزی بولنے والی خوب صورت رنگ رنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس عورت کا گل بخت سے مقابلہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ مگر گل بخت نے ان دو سالوں میں اس تیزی سے مئی کی طرح رنگ ڈھنگ اپناتے تھے کہ ہاٹل سے آکر روشی اور شالی چیران ہی تو رہ گئیں۔ مانگہ ان دنوں ملک سے باہر تھیں۔

ان کی ملاقات رات کے کھانے پر گل بخت سے ہوئی تھی۔ وہ اس وقت جدید انداز کے کپڑوں کے سوٹ میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ان دو سالوں میں اس نے پایا کے دو بیٹوں کو جنم دے کر ازبک ہاؤس میں اپنی حیثیت کو منوالیا تھا۔ دادی تو ویسے بھی ہر وقت بھانجی کے واری صدقے جاتی تھیں۔ دو لڑکوں کی مال، بن کر یہ پہاڑی لڑکی پورے ازبک ہاؤس کی حکمران دکھائی دینے لگی تھی۔ احمد صاحب ان دنوں ملک سے باہر گئے تھے۔

واپس آئے تو ان کے ساتھ دو فلپائی عورتیں تھیں۔ انہما اور انشان کے لیے علیحدہ علیحدہ گورنس آئی تھیں۔ ان کے بیڈ رومز بھی بہت خوب صورت تھے۔ رنگا رنگ کھلونوں، جھولوں اور دیدہ زیب چیزوں سے بھرے ہوئے پاپا، اشتر اور انشان کے لیے بہت ساری

چیزیں لائے تھے۔ ان دونوں کے لیے بھی خوب صورت تحائف اور پر فوم تھے۔ روشی خوبصورت کی دیوانی تھی۔

گل بخت کے لیے انہوں نے علیحدہ سے کافی شاپنگ کی تھی۔ اسی لیے وہ ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔



دلی اور مصمم واپس آچکے تھے۔ ان کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور دونوں ہی کسی غیر ملکی فرم سے منسلک ہو چکے تھے۔ اب وہ دونوں علیحدہ فلیٹ میں رہتے تھے۔ روشی لان میں منہل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں

سفر نامہ تھا۔ ”مشرق کا سونڈر ریلینڈ سوات“ اس نے یہ سفر نامہ کئی مرتبہ پڑھا تھا۔ وہ اس نقش میں قید تھی۔ لے ”ازبک ہاؤس“ اور بیکس ہاؤس کے علاوہ کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

بقول دادی کے وہ دونوں بڑی ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کو اسکول سے انھوا لیتا چاہیے۔ مگر پاپا نے دادی کی اس خواہش کو پورا نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں اب اے لیول کر رہی تھیں۔

گل بخت کے چھ عدد بسن بھائی پورے گھر میں غل غپاڑہ مچائے رکھتے تھے۔

شالی پہروں کرٹھا کرتی۔ پھر ہر دوپہر روشی کی توجہ بھی اس مسئلے کی طرف مبذول کرواتی۔ روشی خود بھی حیران تھی۔ مئی کے دو بھائی بھی تو تھے۔ مگر وہ ایسے نہیں تھے۔ بہت سلجھے ہوئے، شائستہ مزاج کے ذہین لڑکے تھے۔ خصوصاً دلی میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت نفیس مزاج کا تھا۔ اس کا دھیسے پرائر لہجے میں بولنا روشی کو بہت پسند تھا۔ اس کی شائستگی، اس کی ذہانت اور شخصیت کا سحر روشی کو بہت اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔

”اس۔۔۔ یہ میں دلی کو کیوں سوچ رہی ہوں؟“ روشی نے حیرانی سے خود کلامی کی۔

”روشی! روشی! شالی آواز دے رہی تھی۔

روشی جلدی سے کتاب اٹھائے اندر کی طرف بھاگی۔ ”یہ تو بات کرو۔“ شالی نے اس کے ہاتھ میں ریسیور کھدایا۔

”کس کا فون ہے؟“ اس نے اشارے سے پوچھا۔ ”مئی کا۔“ شالی میگزین اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی مئی کو بہت مس کرتی تھیں۔

”مئی! آپ کب آئیں گی؟“ وہ تیسری مرتبہ پھر پوچھ رہی تھی۔

”پچھ دنوں تک۔“ مئی کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔ ”مئی! ہم دونوں آپ کو بہت مس کر رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں محبت تھی، محترم تھا۔

”میں جلد آؤں گی۔“ مئی نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

”تم دونوں اپنا خیال رکھنا، کچھ گل بخت سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔“ مئی تاکید کر رہی تھیں۔ انہیں دور بیٹھ کر بھی ان کا خیال تھا۔

”پاپا کب آتے ہیں؟“ ”جی! آپا! کسی دن کے لیے بھی اپنی روٹین چیلنج نہیں کر سکتے۔“ روشی نے مئی کو تسلی دی تھی۔ وہ سری طرف مئی شاید جھینب گئی تھیں۔

تب ہی گل بخت انشان کو اٹھائے چلی آئی۔ ”تمہارے پاپا کا فون آنے والا ہے۔ فون رکھو“ انہوں نے ضروری بات کرنی ہے۔

”اوہ نم۔“ روشی ریسیور کریڈل پر پٹ پٹ کر وہ پھپھرتی بیڑھیاں چڑھ گئی تھیں۔

شام کو انشان کو لے کر شالی کالونی کی سڑکوں پر نکل گئی۔ روشی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خرگوش کے خالی پنجرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس پنجرے میں اب اشتر کے آسٹریلیئن طوطے چمک رہے تھے۔ کچھ دور گل بخت کی بکری کے بہت خوب صورت سفید بچے گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ یہ بچے گل بخت، انشان کی پیدائش کے بعد گوٹھ سے لائی تھی۔ اسے اپنی اس بکری کے بچوں سے بہت پیار تھا۔ احمد صاحب

نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ نہ جانے کیوں روشی کا دل اس سا ہوا گیا۔

”پاپا نے مجھ سے کہا تھا یہ گھر ہے، وہ نہیں۔ اور اب پاپا کو اس گھر میں موجود نو نظر نہیں آتا۔“ ”جی۔“ گل بخت نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوئی تھی۔ ”ایسے خربے، لاڈ صرف شوہر اٹھا سکتے ہیں۔ اور گھر گوٹھ میں ماں ہر وقت مجھے کوستی پر ہتی تھی۔ لاڈو (بکری کا بچہ) کے پاس جانے نہیں دیتی تھی۔ میں نے اماں کے بونے سے پیسے لے کر مرغی کے بچے خرید لیے تو اماں نے ڈنڈے کے ساتھ میری دھناتی کی۔ وہاں اپار کے ساتھ سوکھی روٹی ملتی۔ اماں نے بکری کا بچہ چوری چوری بچا دیا۔ ان دنوں اماں پر قرض چڑھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو تین دن روٹی رہی تھی۔ ایسا باب چڑھا کہ آٹھ دن برسرِ بڑی رہی۔ ہم اچھے کپڑے اور اچھے کھانے کے لیے ترستے تھے۔ خالہ (روشی کی دادی) مینے بعد آتی تھیں۔ فروٹ، کپڑے اور راشن لے کر۔ سچ کہوں یہاں آکر میری ساری خواہشات پوری ہو گئی ہیں۔ تم بھی اس وقت کا انتظار کرو۔ جب تم مومن بنو گی۔“

لفظ دامن کس قدر اچھوتا اور پیار سا احساس تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں کوئی شادی انینڈ نہیں کی تھی۔ اس نے بھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ اسے سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں ملتا تھا۔ وہ سفر نامے پڑھتی تھی، کوکنگ کرتی تھی۔ سلائی کرتی تھی۔ کورس کی کتابیں پڑھتی تھی۔ چھوٹے بھائیوں کو نئے نئے گیمز سکھاتی۔ سائیکلنگ کرواتی۔ اسٹوریز سناتی۔ مزے مزے کی ڈشز بنا کر کھلاتی۔ گل بخت حیران ہو کر روشی کو دیکھتی رہتی کہ اتنا کچھ بنانا آتا ہے۔ گل بخت کبھی کبھی حیرت سے اسے دیکھتی اور کہتی۔

”کاش! میں تمہارے جیسی با اعتماد اور بولند ہوتی۔“ فر فر انگریزی بولتی۔ انگریزی کھانے بناتی۔ میرے ہاتھ میں بھی تمہارے جیسا ذائقہ ہوتا۔ پھر تمہارے پاپا میری تعریف کرتے۔ میری کوکنگ کو سراہتے۔ پھر

”کاش! میں تمہارے جیسی با اعتماد اور بولند ہوتی۔“ فر فر انگریزی بولتی۔ انگریزی کھانے بناتی۔ میرے ہاتھ میں بھی تمہارے جیسا ذائقہ ہوتا۔ پھر تمہارے پاپا میری تعریف کرتے۔ میری کوکنگ کو سراہتے۔ پھر

انہیں مالکہ آپا کی یاد کم کر آتی۔

”بے چاری شوہر برست عورت! اس کی صرف اتنی محدود سی خواہش ہے۔ روشنی جیرائی سے سوچتی۔ اس وقت اسے یہ اندازہ نہیں تھا یہ محدود خواہش نہیں تھی۔ دراصل اسی ایک خواہش کے ساتھ عورت کی پوری زندگی جڑی ہوئی ہے۔

”روشنی! کسی نے بہت نرمی سے اسے رکارا تھا۔ وہ جو ”در پختہ شب“ کو پڑھتے پڑھتے اونٹنے لگی تھی ایک دم ہڑبکا کر اٹھ بیٹھی۔

”ولی بھائی! آپ آپ کب آئے ہیں؟“
”تینیس سال پہلے۔“ ولی اطمینان سے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

”ازبک ہاؤس کب آئے ہیں؟“
”ابھی ابھی، تم کیوں کھڑی ہو بیٹھ جاؤ۔“ ولی نے نرمی سے کہا۔

”آپ کے کہنے پر نہیں، اپنی مرضی سے بیٹھ رہی ہوں۔“ اسے اپنی ناک بڑی عزیز تھی۔ ولی ہنس دیا۔
”بالکل نہیں بدلیں، کسی ہی ہو جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا۔“

وہ روشانی کو ایک ٹکڑے بکھار رہا۔
اس کے ریشمی سیاہ بال، کالی رات کی مانند نرم نمی آنکھیں، جن میں فزانت جگمگا رہی تھی۔ اوس میں پیچیدگی تو لیکسی مڑی ہوئی لابی پلکیں۔ وہ تو سراپا گلاب تھی۔

روشنی بہت چھوٹی تھی، جب وہ وسیع وعریض محل نما ”ازبک ہاؤس“ میں آتا تھا۔ وہ اسے بہت پیاری لگی تھی۔ بہت اپنی اپنی سی۔ مگر دل کے ہزار چاہنے کے باوجود وہ روشنی کے قریب نہیں ہو سکا تھا اور وہ اپنی دنیا میں گم رہتی تھی۔ وہ پاپ کارن اور چپس کھانے کی شوقین تھی۔ ولی ڈجیروں اور ہیر پاپ کارن کے لفافے لا کر کینٹ میں رکھ دیتا تھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا خیال رکھنے لگا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں ولی بھائی!“

”آل۔۔۔ ہاں۔۔۔“ ولی چونکا۔
”آپا کا کوئی فون آیا ہے؟“ وہ مالکہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

”تقریباً“ روز ہی بات ہوتی ہے۔“
قیس ٹرائی کھینچا، آیا تھا۔ ولی نے اس کی پیار ماں کی طبیعت کا پوچھا۔ وہ ایسا ہی تھا، بہت حساس اور نرم مزاج۔ اسی بل اٹھنے سنگ روم میں جھانکا۔

”آئی! آئی مجھے فلگ بنا کر دو۔“ اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ بک تھی۔

”ہائے! اٹھ! آپ تو اتنے بڑے ہو گئے ہو۔“ ولی نے اٹھ کر سے ہاتھ ملایا۔ روشانی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ اپنی ہنس کی سوکن کے بیٹے کو کس والہانہ انداز میں پیار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حیرت ولی سے کبھی نہیں رہ سکی تھی۔ ابھی تو وہ دھیسے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”بچے تو بچے ہوتے ہیں، معصوم ناچان۔“ اس نے اٹھ کر گلے پیار کیا۔
وہ گلے بخت سے بھی ملا تھا۔ پھر بچے بغیر چلا گیا۔ حالانکہ گلے بخت نے ولی کو بہت روکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد روشانی افسردہ ہو گئی۔ روشنی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ”گردش“ میں پاؤں اور ”مسورج“ کے ساتھ ساتھ ”میں گم ہو چکی تھی۔

ان ہی دنوں مالکہ واپس چلی آئیں۔ مئی پہلے سے زیادہ اسماٹ ہو چکی تھیں۔ وہ پہلے بھی زیادہ نہیں بولتی تھیں۔ اب تو بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔ زیادہ تر اپنے بید روم میں رہتیں۔

”ازبک ہاؤس“ میں تو گلے بخت چمکتی تھی۔ اس نے اب پھاڑی لباس پہننا ترک کر دیا تھا۔ وہ ریشمی نفیس شیفون کی ساڑھیاں پہنتی تھی۔ بوتیک سے اسٹائلشن سوٹ منگوائی۔ ولی وی دیکھ دیکھ کر اسے میک اپ کرنے کا سلیقہ بھی آیا تھا۔

ان ہی دنوں ایک بار پھر گھر میں کچھ غیر معمولی سی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ داوی کی آمد کے ساتھ کچھ نہ کچھ نیا اور اٹو کھا ضروری ہوتا تھا۔

اب بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ روشانی رو رہی تھی۔ اس کے مسلسل آنسوؤں نے روشنی کو چڑا دیا۔

”کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟“ روشنی نے کوئی بیسویں مرتبہ پوچھا تھا۔
”مئی جا رہی ہیں۔“ اس نے سول سول کرتے ہوئے بتایا۔

”کہاں؟“ روشنی اچھل پڑی۔ ”ابھی دو ہفتے پہلے تو وہ آئی ہیں۔“ اس کی حیرت بجا تھی۔
”واپس برلن۔“ روشانی نے ناک رگڑی۔
”مگر کیوں؟“

”یانا نے داوی کے مجبور کرنے پر یہ گھر اٹھارہ اشنان کے نام کر دیا ہے۔ مئی کو اس بات کا غصہ ہے۔ ان کی حیثیت کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اور وہ اب ”ازبک ہاؤس“ میں رہنا نہیں چاہتیں۔“

”اور کیا کیا کہتے ہیں؟“
”انہوں نے مئی کا غصہ کم کرنے کے لیے ایک گھر خرید کر مئی کے نام کیا ہے، مگر وہ ”ازبک ہاؤس“ تو نہیں ہے نا!“ روشانی رنجیدگی سے بولی۔

”اب کیا ہو گا؟“ روشنی بھی گھبرا گئی۔ مئی سے وہ دونوں ہی الٹیج تھیں۔ دوسرے دن اس نے مئی کو دیکھا۔ انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا اور ان کی آنکھیں سوچی سوچی تھیں۔ داوی نے سنا تو پھر سے طوفان کھڑا کر دیا۔ مگر مئی نے کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا۔ انہوں نے کورٹ کے ذریعے احمد صاحب سے خلع لے لیا اور ان دونوں کو بلکا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

مئی کے جانے سے نہ روشنی خوش تھی نہ روشانی۔ جی کہ گلے بخت بھی چپ چپ تھی۔ فقط داوی خوش تھیں۔ گلے بخت جسے وہ دونوں داوی کے ہزار مرتبہ ٹوکے پر ”مہربانی“ کہنے لگی تھیں۔ داوی کا دایاں بازو تھی۔ داوی کی خد متیں کرنے کے علاوہ بھی وہ داوی کی

پسندیدہ ہستی تھی۔

گلے بخت نے ہی انہیں ایک دن بتایا تھا کہ داوی، روشنی کی ممالیعی داوا کی بھیجی ہے احمد صاحب کی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔ مگر داوی کی ضد اور فیصلے سے مکرانہاں آسان تھا۔ داوی نے ان کی ماں پر زندگی کے دروازے تنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ رات دن جانوروں کی طرح ان سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح جی رہتی تھیں۔ پاپا شرمیں رہتے تھے شاید اسی لیے وہ جلد ہی زندگی سے بے زار ہو کر ابدی نیند سو گئی تھیں۔ احمد صاحب کا رویہ ان کے ساتھ نارمل تھا۔ مگر وہ کم کم ہی گونہ جاتے تھے۔

مئی نے برلن جا کر ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں لا شعوری طور پر ان کی کال کی منتظر تھیں۔ پھر ایک دن ولی ”ازبک ہاؤس“ چلا آیا۔ اس کے ساتھ مصمم بھی تھا۔ مصمم بھی ولی کی طرح بہت عجیلا تھا۔

دونوں بھائی ایک ہی فیلڈ سے وابستہ تھے۔ ”مئی نے محض اینٹوں کے اس مکان کی خاطر اپنی دس سالہ ازوادی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔“

”ابا کی سوچ ہمیشہ سے خود غرضانہ تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے لیے سوچتی ہیں۔“ مصمم نے کہا روشنی کو بہت برا لگا۔

”نہیں، مئی ایسی نہیں تھیں۔“
”اب وہ تمہاری مئی نہیں کسی اور کی مسزین چکی ہیں۔“ صائی کے لیے میں سخی تھی۔ ولی نے سر جھکا لیا تھا۔

”مئی نے کس سے شادی کی ہے؟“ روشنی کے اٹھنے کے بعد روشانی نے پوچھا۔

”کسی پاکستانی پروفیسر کے ساتھ۔“ یہ جواب بھی مصمم کی طرف سے آیا تھا۔
”مئی نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ وہ کب تک تمہارے سکتی تھیں۔“ روشانی نے افسردگی سے کہا۔ اسی پل روشنی

ٹرائی گھسیٹی آگئی۔ لوازمات سے بھری ٹرائی دیکھ کر صمیم نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ”کنج میں نے لُج بھی نہیں کیا۔ سارا دن سائٹ پر گزار گیا تھا۔ اس ظالم انسان نے کچھ کھانے نہیں دیا۔“

”میرے حصے کے بھی تین سینڈویچ ہضم کیے ہیں اس نے۔“ ولی نے جل کر اسے دیکھا۔

”تو اب صمیم بھائی کو لُج کروا دیتے۔“ شانی نے ہمدردی بتائی۔ ”یہ تجھ کو اپنی جیب میں سے کھونا پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا۔“ صمیم نے مظلوم شکل بنالی۔

”تو تم نے ہی حاتم طائی کو خوش کر دینا تھا سخاوت کر کے کہ ان کی گدڑی سنبھالے ایک ”خنی“ اب تک موجود ہے۔“ ولی نے تلملا کر کہا۔

”ہیں نے گدڑی تمہارے لیے رکھ چھوڑی ہے۔“ صمیم چکن رول سے انصاف کرتے ہوئے بولا۔

ولی نے بھی حساب برابر کر کے ہاتھ جھاڑے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی نوک جھونک روشنی اور شانی کے لبوں پر مسکن لے آئی تھی۔



شانی کو موسیٰ بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان دونوں گل بخت گوٹھ گئی ہوئی تھی۔ گھر میں روشنی اور شانی تھیں یا پھر نوکروں کی فوج دوسرے تک شانی کا بخار کم نہ ہوا تو روشنی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگی۔

بخار کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔ شانی پر غشی طاری ہونے لگی تو اس نے پیلا کو فون کیا۔ پیلا میننگ میں مصروف تھے۔ ان کی سیکرٹری نے کہا کہ وہ گاڑی بعد ذرا آئیں گے۔

پچھتی ہیں۔ کچھ دیر بعد گاڑی آگئی تھی۔

ڈاکٹر اسجد بیگ نے شانی کا معائنہ کر کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے۔ شام تک رپورٹس مل گئی تھیں۔

شانی کو یہ قان کی شکایت تھی۔ شانی کو بخار کا زور نہ ٹوٹنے کی وجہ سے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ پیلا میننگ کے بعد کلینک چلے آئے تھے۔ انہیں اچانک بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا۔ اور ادھر شانی بھی ایڈمٹ تھی۔ پیلا کچھ

دیر سوچتے رہے تھے، پھر انہوں نے فون کر کے کسی کو بلوایا تھا۔

کچھ دیر بعد ولی کو پیلا کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ مٹی کے اس انتہائی رد عمل کے باوجود پیلا کا ولی سے ملنا ملنا اچھے سے باعث تھا۔

ولی انتہائی ذمہ داری سے ڈاکٹر زورم اور میڈیکل اسٹور کے چکر لگا رہا تھا۔ روشنی نے ان باج ”چھ گھنٹوں میں اس کی بہت سی غویوں کو محسوس کیا تھا۔“

ولی اور روشنی نے کھانا کھٹے کھایا تھا۔ وہ روشنی کو لُخت نہ لُخت حیران کر رہا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ دیتا تھا۔ اس کے انداز میں کس قدر اپنائیت تھی۔

روشنی ابھی کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے درمیان معلق تھی۔ جو خواب وہ دیکھتی تھی، ان کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید پورے ہو جاتے، اگر وہ ازبک خاندان کی بیٹی نہ ہوتی۔ وہ احمد خان ازبک کی بیٹی نہ ہوتی۔

”روشنی! کیا سوچ رہی ہو؟“ ولی نے بہت نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

”ابا!۔“ وہ چونکی تھی، پھر ولی کو اپنی طرف دیکھتا باکرہ دے جھینپ گئی۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ میں فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹر کر سکوں گی۔“

”تو اس میں مشکل کیا ہے۔ تمہارے پیارے طرح کی مہنگی تعلیم انورڈ کر سکتے ہیں۔“ ولی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں کوک تھما دی۔

وہ ہیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

صبح تنگ شانی کا بخار اتر گیا تھا۔ دس بجے تک وہ اسے گھر لے آئی تھی۔ گل بخت بھی آچکی تھی۔ اور اب شانی کو یہ قان کے نقصانات کے متعلق بتا رہی تھی۔

”اعمریزی دوالی کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں گوٹھ سے دوالی منگوا کر دوں گی۔ بیت خان بہت اچھا حکیم ہے۔“

گل بخت ہمدردی سے شانی کا سردیاتی رہی۔ پھر اس کے لیے اسی حکیم کا بیانا ہوا شربت لے آئی۔ شانی اس

شریت کو پینا نہیں چاہتی تھی۔ روشنی کا بھی یہ ہی خیال تھا۔ مگر گل بخت نے زبردستی شانی کو یہ شربت پلا دیا۔

اور وہ جو بیماری کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑی سی ہو رہی تھی شربت پی کر منٹوں میں تھک چکی ہوئی نہ جانے اس شربت میں کیا جادو تھا کہ پھر شانی کو ڈاکٹر اسجد بیگ کے کلینک لے کر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ دونوں حیران تھیں اور گل بخت مسرور انہیں دیکھ رہی تھی۔



ان دونوں ولی ایک بہت بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کامیابی پر اسے مزید کئی پروجیکٹ ملنا تھے۔ یہ تمام تعمیراتی پروجیکٹ بیرون ملک کے تھے۔ سنڈے کو اس کی بیوس آئرس کی فلائٹ تھی۔ وہاں اسے تین اور ہوٹل کا پروجیکٹ ملا تھا۔ سو یہ اس کے کیرئیر کا بہترین پروجیکٹ تھا۔ روشانی خان کی ہمراہی اس کی اولین خواہشوں میں سے ایک تھی، اور وہ اسے پانے کے لیے طویل ترین انتظار بھی کر سکتا تھا۔ ابھی رات کو ہی تو ولی نے شانی کی خیریت پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔ فون روشنی نے اٹھایا تھا اور وہ اس سے بہت دلچسپی سے بیوس آئرس کے جانوروں کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ اس سے وعدہ لے رہی تھی کہ وہ روشنی کے لیے اعلاسل کا خرگوش یا کتا لے کر آئے۔

ولی حیران تھا کہ روشنی کو کپڑوں، جیولری کا شوق نہیں تھا۔ اسے شائنگ پر جانا پسند نہیں تھا۔ نہ جانے کس رو میں ولی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ روشنی میں تمہیں دنیا بھر کی گاہ۔ اور وہ حیران تھی، پریشان تھی۔

”ایسا کیسے ممکن ہے ولی بھائی!“ اس کے لہجے میں بلا کی معصومیت تھی۔

”باہر جانا مشکل نہیں۔ اگر تمہارے پیلا چاہیں تو تمہاری یہ چھوٹی سی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔“ ولی نے اس کی آزدگی محسوس کر لی تھی۔

”ہماری بہت سی ایسی خواہشیں ہیں جو پوری نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے میں کسی بھی چیز کا ”عزم“ نہیں

کرتی۔“ یہ تو اچھی بات ہے۔“ ولی اس کے بلند حوصلے کو بے حد سراہتا تھا۔

اگلی شام وہ بیوس آئرس پہنچ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد پاکستان میں روشانی کے شایان شان گھر بنانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے وہ رات دن کی پروا کیے بغیر کام کر رہا تھا۔

یہ جرمنی کا شہر برلن تھا۔ وہ مائلہ آپا سے ملنا چاہتا تھا۔ ان کے اس شدید رد عمل کی ”وجہ“ جانتا چاہتا تھا۔ طلاق کا یہ انتہائی فیصلہ انہیں اس وقت کرنا چاہیے تھا جب احمد خان ازبک نے شادی کی تھی۔ اب جبکہ ان کے دو بیٹے بھی ہو چکے تھے، یہ فیصلہ کرنا کہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑیں، یہ سراسر حماقت ہی تو تھی۔

وہ مقررہ وقت کے مطابق ڈنر سے پہلے ان کے فلیٹ پہنچ چکا تھا۔ مائلہ کے نئے ہونیوڈ سے ملاقات اتفاقاً نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تھے۔

رات کو فرصت سے ولی نے مائلہ آپا سے گفتگو کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ عمر وہ بھی گویا جان بچکی تھیں۔ تب ہی پہلے ہی پیش بندی کے طور پر انہوں نے مصروف سے انداز میں کہا۔

”مجھے صبح کے لیے لیکچر تیار کرنا ہے۔ تم بھی تھکے ہوئے ہو۔ ابھی سو جاؤ، پھر بات کریں گے۔“ اب مزید بھلا وہ کیا بات کرنا۔

آپا کے سرد رویے کی وجہ سے جو تنگی ابھی فی الحال وہ محسوس کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کڑواہٹ کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پٹلیوں پر اک بھولے بھالے معصوم سے نوجو خیرے کا عکس نمودار ہونے لگا تھا۔ جس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ وہ کسی دھلے ہوئے ترنوازہ گلاب کی مانند تھی۔ شگفتہ و لفریب اور حسین۔ وہ ہر رنگ میں بہت پاکیزہ تھی۔ دلشین اور معصوم۔

دلی خاقان نے یاسیت سے سوچا تھا کہ کیا احمد خان ازبک اپنی بیٹی کو دلی خاقان کے حوالے کر دیں گے؟ وہ جوان کی سابقہ بیوی کا بھائی ہے جسے انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ کتنے احسان تھے احمد خان کے ان پر۔ مگر تپانے خان کی کسی قربانی کی احسان کو یاد نہیں رکھا تھا۔

ان دونوں بھائیوں نے اچھی اور مہنگی ترین تعلیم احمد خان کی بدولت حاصل کی تھی۔ جس کا تعلق اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔ اور مالک مکان نے اپنا گھر خالی کر دیا تھا۔ ان دونوں رشتہ دار بھی اپنے رنگ بدل چکے تھے تب احمد خان نے ہی انہیں سارا دیا تھا۔

مالک احمد خان کی سیکریٹری تھیں۔ پھر ایک دن انہوں نے گھر آکر بتایا تھا کہ وہ احمد خان سے شادی کر چکی ہیں۔ صرف چند دن بعد وہ سب "ازبک ہاؤس" میں شفٹ ہو گئے تھے۔ جہاں ہر طرح کی آسائش تھیں۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی مگر اپنائیت نہیں تھی۔ آپا کے پاس ان کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ مالک نے اپنا تعلیمی سلسلہ دوبارہ جوڑ لیا تھا۔

دس سال بعد آپا کی احمد خان سے علیحدگی کم از کم اس کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ ان ہی سوچوں میں کم وہ نیند کی وادی میں اتر گیا تھا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یونیورسٹی جا چکی تھیں۔ فریش ہونے کے بعد اس نے ناشتا کیا۔ پھر اچانک ہی اس کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ وہ روٹھانے سے بات کرے۔

اس کی انگلیاں "ازبک ہاؤس" کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ فون روشنی نے ہی اٹھایا تھا۔

"دلی بھائی! روشنی کی نیند ایک دم غائب ہو گئی تھی۔"

"کیسے ہیں دلی بھائی؟ کب آئیں گے؟" روشنی نے پوچھا۔

"بھئی بی بی! تو بہت کام ہے۔" وہ اسے اپنے کام

کی تفصیل بتانے لگا تھا۔

"اچھا تو پھر آپ میرے لیے ہمنگ برو لے کر آئیے گا۔"

"ہمنگ برو؟ یہ کیا چیز ہے؟" دلی حیران ہوا۔

"یہ چیز نہیں پرندہ ہے۔ دنیا کا سب سے چھوٹا پرندہ۔" روشنی اب اسے پرندوں کی نسل کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ شاید اسے ایک بہترین سامع کی ضرورت تھی جو اس کی گفتگو کو بڑے شوق اور محمل سے سنتا رہتا اور قطعاً برونہ ہوتا۔

"یہ بہت خوب صورت پرندہ ہے (روشنی کو سارے جانور خوب صورت ہی لگتے تھے۔ وہ غلیظ سا ڈیجی بھی)۔ دلی نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

روشنی کہہ رہی تھی۔ "یہ پرندہ ایک جگہ رک کر پرواز کر سکتا ہے۔ پیچھے کی جانب بھی اڑ سکتا ہے۔ پرواز کے دوران اپنے پروں کی پھر پھر ہٹ سے گنگٹانے کی آواز پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

دلی چشم تصور سے روشنی کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"کاش دلی بھائی! میں بھی ایک پرندہ ہوتی۔ جہاں مرضی پرواز کرتی۔" وہ حسرت سے کہہ رہی تھی۔

"نہ ویزے کی بھاگ دوڑ کا تاریقی نہ پاسپورٹ کے جھنجھٹ میں وقت اور پیسہ برباد کیا جاتا۔ نہ سرحدوں پر چیکنگ جیسی جھنجھٹا ہٹ کا شکار ہونا پڑتا۔" دلی نے اس کی رنجیدگی محسوس کر کے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا یہ بتاؤ کالج کیسا جا رہا ہے؟"

"پھر وہ کافی دور روشنی سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی طبیعت ایک دم فریش ہو گئی تھی۔

"تم نے میرا پرس چھینا ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھی بہت تیزی سے اس سے ٹکر لائی تھی۔ دلی نے مڑ کر اس لڑکی طرف دیکھا تھا۔ جو چھوٹی سانسوں سمیت چیخ رہی تھی۔

"تم نے میرا پرس چھینا ہے۔" وہ جو کوئی بھی تھی بہت تیزی سے اس سے ٹکر لائی تھی۔ دلی نے مڑ کر اس لڑکی طرف دیکھا تھا۔ جو چھوٹی سانسوں سمیت چیخ رہی تھی۔

"کیا کیسا ہے؟" دلی نے تنک کر غصیلے لمبے میں پوچھا۔ وہ ابھی ابھی بینک سے کرنسی بیچ کر واپس کے باہر نکلا تھا۔ جب یہ فضول انگریز لڑکی اس سے ٹکر لائی تھی۔

"تم نے میرا پرس چھینا ہے۔" وہ لڑکی ایک مرتبہ پھر چلائی۔

"نکو مت۔" دلی دھاڑا۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ لڑکی صرف پیسے حاصل کرنے کے لیے ڈراما کر رہی ہے۔ یورپ میں ایسے "فراڈ" معمول کی بات تھی۔

"تمہارا والٹ اس وقت "مارک" سے بھرا ہوا ہے۔ کہاں سے لیے تم نے اتنے نوٹ۔ ابھی فوراً" میری رقم لوٹاؤ ورنہ پولیس کو بلا لوں گی۔" وہ اس کام میں ماہر لگتی تھی۔ پولیس کی دھمکی تو ان لوگوں کی نوک زبان پر چلتی رہتی تھی۔

"بھئی میرے راستے سے۔" دلی نے ناگواری سے کہا۔

"میری رقم دو۔" وہ بھی کوئی ڈھیشوں کے خاندان سے تھی۔

"نہ ڈراما کسی اور کے سامنے کرنا۔ میں ان داؤ چھ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کسی اور کو لوٹناؤ۔" دلی تلخی سے کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا۔ وہ لڑکی بھی بھاگتی ہوئی اس کے برابر چلنے لگی۔

"پلیز مجھے تھوڑے سے پیسے دے دو۔" اب کے اس لڑکی کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اس نے "میری رقم" کہنے کے بجائے بھکاریوں کے انداز میں منمننا شروع کر دیا تھا۔

"میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ کسی اور کا راستہ روک لو۔" دلی نے بے مروتی سے کہا۔

"مجھے کچھ رقم دے دو۔ میں نے دوائی ہے۔" وہ منتوں پر اتر آئی تھی۔ "میں بیمار ہوں اور صبح سے بھوکھی ہوں۔"

"بھائی میں جاؤں تو تمہارے لڑکیوں کی "بھوک" مائی فٹ۔" دلی نے سخت تنفر سے کہا۔

"تمہارا والٹ اس وقت "مارک" سے بھرا ہوا ہے۔ کہاں سے لیے تم نے اتنے نوٹ۔ ابھی فوراً" میری رقم لوٹاؤ ورنہ پولیس کو بلا لوں گی۔" وہ اس کام میں ماہر لگتی تھی۔ پولیس کی دھمکی تو ان لوگوں کی نوک زبان پر چلتی رہتی تھی۔

"بھئی میرے راستے سے۔" دلی نے ناگواری سے کہا۔

"میری رقم دو۔" وہ بھی کوئی ڈھیشوں کے خاندان سے تھی۔

"نہ ڈراما کسی اور کے سامنے کرنا۔ میں ان داؤ چھ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کسی اور کو لوٹناؤ۔" دلی تلخی سے کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا۔ وہ لڑکی بھی بھاگتی ہوئی اس کے برابر چلنے لگی۔

"پلیز مجھے تھوڑے سے پیسے دے دو۔" اب کے اس لڑکی کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اس نے "میری رقم" کہنے کے بجائے بھکاریوں کے انداز میں منمننا شروع کر دیا تھا۔

"میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ کسی اور کا راستہ روک لو۔" دلی نے بے مروتی سے کہا۔

"مجھے کچھ رقم دے دو۔ میں نے دوائی ہے۔" وہ منتوں پر اتر آئی تھی۔ "میں بیمار ہوں اور صبح سے بھوکھی ہوں۔"

"بھائی میں جاؤں تو تمہارے لڑکیوں کی "بھوک" مائی فٹ۔" دلی نے سخت تنفر سے کہا۔

"تمہیں تمہارے اللہ کا واسطہ۔" اب وہ گڑگڑا رہی تھی۔ دلی نے کچھ چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ دلی نے پہلی مرتبہ اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ لڑکی شاید حاملہ تھی۔

"پلیز مجھے کچھ مارک دے دو۔ میں دوہ اور ڈبل روٹی خریدوں گی۔ میری ماں بھی بیمار ہے۔ اس کو شدید بھوک لگ رہی ہوگی۔" وہ ایک مرتبہ پھر گڑگڑائی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ مجموعی طور پر وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ اس کی رنگت بے انتہا سفید تھی۔ اس قدر سفید کہ دوسری مرتبہ دیکھ کر دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں یا سبز، ان میں موجود نمی، نیکم پر اس کی مانند لگ رہی تھی۔ بالوں کا رنگ زردی مائل تھا۔ انڈے کی زردی جیسا جو کہ بہت ہی برے لگ رہے تھے۔ وہ خوب صورت جسمات کی مالک تو عمر لڑکی تھی۔

وہ اس شدید سردی میں بغیر کسی گرم سویر کے ٹھنڈے رہی تھی۔ دلی نے دوپٹے میں ہی اس کی مالی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کے دل میں سامنے کھڑی اس لڑکی کے لیے ذرہ برابر ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اک رخ نگاہ اس پر اچھالتا آگے بڑھنے لگا تھا۔ جب وہ ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آئی۔ اوہ اوہ دیکھ کر وہ دھیمی آواز میں ہنسنے لگی۔

"میرا نام جھلنا ہے۔ سب مجھے جیلی کہتے ہیں۔ تم بھی جیلی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے تیار ہوں۔ بس مجھے رقم کے متعلق بتاؤ۔ کیا تم مجھے آج کے دن کا راشن خرید کر دے سکتے ہو۔"

"مائی گاؤ۔" دلی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ حالانکہ یورپ میں جگہ جگہ سڑکوں پر کچھ دینے والیاں مل جاتی تھیں۔

"نہم۔۔۔ دلی نے گویا دانت پیسے۔ "کوئی کام وام کرلو۔ کسی کے گھر برتن دھو لو، پتھر اٹھالیا کرو، کسی ہوٹل میں ڈش واشنگ کرلو۔" وہ دھاڑا۔

”یہ آسان نہیں ہے۔“ جیلہنا کے آنسو چھلک پڑے۔
 ”جہنم میں جاؤ تم!“ وہ غصے سے پھینکا تھا۔ جیلی تقریباً بھگتے ہوئے اس کے برابر چلنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”میں تمہارے برتن بھی دھو دوں۔ صفائی بھی کروں گی۔ اور جو تم چاہو گے کروں گی۔ ابھی فی الحال کمرس کی وجہ سے پٹھیاں ہیں۔ ان دنوں کام ملنا مشکل ہے۔“

”اؤ میرے ساتھ۔“ ولی نے چڑ کر قدم بڑھا دیے تھے۔ یونٹس آؤس میں اس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ یہاں چرنی میں اسے ایک اچھی کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی تھی۔ سو وہ چند دن بعد یہاں شفٹ ہو گیا تھا۔ فی الحال وہ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ وہ یہاں کچھ سال کام کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم اتنا سرمایہ اکٹھا کرنا چاہتا تھا کہ پاکستان میں ایک گھر اور ذاتی برنس شروع کر سکے۔

”یہ ساری صفائی کرو۔ برتن بھی دھو نہا۔ ویکیوم سامنے کینٹ میں موجود ہے۔“ ولی اسے ہدایات دے کر خود کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ صرف ایک گھنٹے میں فارغ ہو چکی تھی۔ اور اپنا معاوضہ چاہتی تھی۔ ولی نے کافی سارے نوٹ اسے تھما دیے تھے اور بچن میں سے کھانے پینے کی چیزیں لینے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ جیلہنا تم آنکھوں سے مسکرا دی۔ وہ جانے لگی تھی جب ولی نے ایک دم اسے آواز دے کر روکا۔

”تم شادی شدہ ہو؟“ کچھ سوچ کر ولی نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا تھا۔ وہ کچھ پل اسے دیکھتی رہی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اسے کیا بتائے۔ پھر جی سے بولی۔

”نہیں۔“
 ”جاؤ تم۔“ ولی نے ناگواری سے کہا تھا۔ اس پل ولی کو اس لڑکی پر شدید غصہ آیا تھا۔



وہ لیٹن ہیوٹ کے فارم میں لائن میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ لیٹن ایک شفرین تھا۔ اس کا کاروبار بہت بڑا تھا۔ یہاں سے ارد گرد کے دیہاتوں کے لوگ اور چھوٹے پیمانے پر مچھلی بیچنے والے کم رت پر مچھلی خریدتے تھے۔

اس کی بیوی سن مانی بھی آئی تھی۔ وہ بھی مچھلی بیچنے کا کام کرتی تھی۔ اس نے ہر قسم کی مچھلی خریدی تھی۔ اب وہ جھینگے خرید رہی تھی۔ مانی کے پاس اتنی رقم تھی کہ وہ اتنی مہنگی مچھلی خرید سکتی تھی۔

جیلی کا ارادہ صرف لائسنس خریدنے کا تھا۔ اس کے پاس صرف اتنی ہی رقم تھی کہ وہ کیکڑے کا گوشت خرید سکتی۔ یہ گوشت اس نے تین ہلاک گھوم کر بیچنا تھا اور صرف تین مارک منافع کے طور پر ملنا تھا۔ اس کی ابھی سے ٹانگیں مسلسل کھڑے ہونے کی وجہ سے شل ہو رہی تھیں اور ابھی اسے پیدل چل کر واپس بھی جانا تھا۔

کیکڑے کا گوشت مغرب میں بڑی لذیذ دُش سمجھی جاتی ہے۔ پہلے پہل وہ لائسنس اور راز کے سینڈویچ بنانا شروع کر گئی تھی۔ مگر ٹرل شرمپس ٹرلڈس بنانی تھی۔ مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے یہ کام بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اس نے مچھلی بیچنے کا کام شروع کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام بھی چند دن تک ہی چل سکے گا۔ زیادہ دیر تک چلنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کی کمر اور ٹانگیں درد کی وجہ سے اکڑنے لگتی تھیں۔ پیروں میں ورم آ جاتا تھا۔ وہ ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ یہ تجربہ کس قدر مشکل اور اذیت ناک تھا۔ یہ بچہ جو کہ اس کی مرضی کے خلاف دنیا میں آ رہا تھا، جسے ختم کرنے کے متعلق جیلی نے کئی مرتبہ سوچا تھا مگر ”عمل“ کا مرحلہ بہت مشکل تھا۔

آدھا گھنٹہ مزید انتظار کرنے کے بعد اس کی باری آ بی گئی تھی۔ لیٹن ہیوٹ نے ہیش کی طرح اسے لپٹائی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے گلیوں سے نوازنے لگی۔

والپس پر گوشت کا تھیلہ اٹھائے کمر درو بھلائے وہ تیز تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ تین ہلاک گھومنے کے بعد اور بھاؤ ناؤ کرنے میں اس کا دماغ پلپٹا ہونے لگا تھا اور جب نوٹ گھنٹے کی باری آئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ چند مارک کے نوٹ لے کر ایک چھوٹے پوٹھلی اسٹور میں گھس گئی۔ سرف، دالیں، چاول خریدنے کے بعد پیسے ختم ہو چکے تھے اور وہ مرے مرے قدم اٹھاتی بس کے ذریعے گھر چلی آئی۔

وہ جس علاقے میں رہائش پذیر تھی وہاں زیادہ تر سبزی فروش، خاکروب وغیرہ رہتے تھے۔ اس کی ماں بھی خاکروب تھی۔ مگر جیلی کو اس کام سے کراہیت آتی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو ماں اسے دیکھتے ساتھ چلانے لگی تھی۔

”کیا خرید کر لائی ہے؟ یہ دالیں، سرف اور چاول۔۔۔ میں کیا کھاؤں گی۔“ وہ جیلی کے ہاتھ میں موجود تھیلے کو دیکھ کر چلانے لگی۔
 ”ممی! اچھا دوست۔“ جیلی نے ناگواری سے کہا تھا۔
 پھر ایک چھوٹے شار کو ماں کی طرف اچھال کر بولی۔
 ”کھاؤ، مرنو، تم تو صرف کھانے کے لیے زندہ ہو۔“

”اؤ۔۔۔ پیر کے سینڈویچ، کیک، ٹکٹس۔“ ممی شارپ میں سے اپنی پسندیدہ چیزوں کو نکالتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ جیلی نے جی سے اس منظر کو دیکھا اور میٹرس پر راز ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کل کا دن کیسے گزرنے لگا۔ اس کے پاس پھولی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ساری رات سوچوں کے بھنور میں گزر چکی تھی۔ صبح وہ ایک فیصلہ کر کے نہانے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔

”وہ گھنٹے بعد ایک مرتبہ پھر وہ ولی کے فلیٹ کے سامنے تھی۔“
 ”تم!“ ولی کو اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔
 ”تمہیں پھر سے روپے چاہیے ہوں گے۔“
 ”نہیں، مجھے کا چاہیے۔“ جیلی نے پہلی مرتبہ اعتماد سے کہا۔

”آہم سوری! مجھے میڈ کی ضرورت نہیں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”مگر مجھے کام کرنا ہے۔“
 ”تو کیس بھی جا کر کرلو۔“

”اس کنڈیشن میں میں زیادہ مشقت میں نہیں کر سکتی۔“ وہ رسان سے کہنے لگی۔ گویا اسے ولی کے غصے کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

”تمہیں میڈ کی جاب کیس بھی مل سکتی ہے۔ نیوز پیپر بڑھا کر۔“ ولی نے ناگواری سے کہا۔

”میں یہاں اطمینان سے کام کر سکتی ہوں۔ کیس اور جاب کرنے میں میرے لیے دشواری ہے۔ تم مجھے اچھے لگے ہو، تم میں بہت سی اچھی عادتیں ہیں۔“

”مثلاً، کیا کیا؟“ ولی کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خوشامد کر رہی ہے۔

”تم اچھے انسان ہو۔“ جیلی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خوبیاں کیسے بیان کرے۔

”تمہیں کیریکٹر کیس نہیں۔“ وہ نگاہ چرائے دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی، جبکہ ولی ششدر سالہ دیکھنے لگا۔



”تم آج میرے ہاں کرنا۔“ مالکہ فون پر اس سے کہہ رہی تھیں۔

”میں بڑی ہوں۔ شاید آج نہ آسکوں۔“ ولی واقعی مصروف تھا۔ سارا دن اس کا سائٹ پر گزر جاتا تھا۔

”اپنی بھی کیا مصروفیت۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے آجانا۔“ مالکہ نے اصرار کیا۔

”بہت کام ہے آج!“
 ”کیا کارخانے، ٹیکسٹائل لگانے ہیں۔“ مالکہ نے ہنس کر کہا۔

”یہ ہی سمجھ لیں۔“ وہ ہنس رہی تھی۔
 ”بلند لوگ بلند خواب ہی دیکھتے ہیں۔“

”آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں بہت بلندی کے خواب دیکھتا ہوں۔“ اس کا لہجہ چمکتا ہوا تھا۔

”تمہارے چہرے پر لکھا ہے، تمہاری آنکھیں جلتی ہیں، ایسے ہی تو ایک ہاؤس کے چکر نہیں لگتے۔“ مائلہ نے لطیف انداز میں طنز کرتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔ ولی تو دم بخود رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جو راز اس کے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ ہے اس تک مائلہ کی رسائی ہو جائے گی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ چاہ کر بھی لہجے کو بے پروا نہیں بناسکا تھا۔

”ہم سے کیا رہہ داری۔“ مائلہ ہنس رہی تھیں۔ ولی نے عرصے کے عالم میں فون شیخ دیا تھا۔ ابھی وہ ان ہی سلتی سوچوں میں گم تھا، جب فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی۔ ولی نے سی ایل آئی کی اسکرین پر جگمگاتے نمبر کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔

ازبک ہاؤس کا نمبر تھا۔ اس کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ روشی اسے فون کرے گی۔

”ولی بھائی! ہیلو! ہیلو۔“ آپ سن رہے ہیں۔“ روشی کی آواز اسے سوچوں کے بھنورے سے کھینچ لائی۔

”ہاں روشی! بولو میں سن رہا ہوں۔“

”ولی بھائی! آپ نے واپس نہیں آنا۔“

”کیوں؟“ ولی کا دل دھڑکنے لگا۔

”آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔“ روشی اسے کچھ یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

”کون سا وعدہ؟“ وہ اک پل کے لیے سب کچھ بھول گیا۔

”آپ کو کچھ یاد نہیں۔“ روشی نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں۔“

”تو پھر یاد دلانے کا فائدہ بھی نہیں۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”مجھے سب یاد ہے روشی!“ ولی اسے زیادہ دیر خفا نہیں کر سکتا تھا۔

”اچھا۔“ وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔ اس کی بچوں جیسی مدھم مدھم ہنسی کی آواز نے ولی کے دل کو ہلکا کر دیا۔

”تو پھر آپ کب آئیں گے؟“

”میں بھی تو یہاں بہت کام ہے۔ اور میں بہت سے میسے جمع کرنا چاہتا ہوں روشی!“ نہ جانے کس رو میں ہنک کر وہ کہتا چلا گیا۔

”کیوں؟ اتنے ڈھیر سے پیسوں کا آپ کیا کریں گے۔ آپ کیا پلایا جیسا بننا چاہتے ہیں۔ پھر تو ہم ولی بھائی کو ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔“

”مجھے ایک گھر بنانا ہے۔ جس کا لائن بہت وسیع ہوگا۔ جس میں گارلینڈ ہو، ہوک، پوپلی، میری گولڈ اور یولپ کے بے شمار پودے ہوں گے۔ ان پر رنگارنگ پھول لگیں گے۔ لائن میں ایک طرف بہت بڑا Zoo ہوگا۔ سنہری ہرن کے بچے ہوں گے، بہت سے مور ہوں گے۔ چھوٹا سا تالاب بنائوں گا، جس میں بطخیں سونمٹگ کیا کریں گی۔“

”کتنا خوب صورت ہوگا آپ کا لائن؟“ روشی خواب کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ننھے ننھے سے دیے جگمگا رہے تھے۔ گویا وہ اس خوب صورت لائن کو چشم تصور سے دیکھ رہی تھی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ مگر ولی ایک خواب کی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ اس سنہری طلسم کو جیسی کی آمد نے توڑا تھا۔

”تم پھر آگئی ہو؟“ ولی غصے سے پھنکارا۔

”مجبوری ہے۔ مجھ سے مچھلی بیچنے کا کام نہیں ہوتا۔ ایک تو مچھلی کی بو۔“ ان دنوں ویسے بھی جیسی کا جی ہر وقت متلا تار رہتا تھا۔

”بھگایا یہاں سے۔ ایک دن نیکی کی تھی، تم تو گلے ہی پڑنے لگی ہو۔“

”گلے کہاں پڑی ہوں۔ سات فٹ دور تو کھڑی ہوں۔“ جیسی نے ناراضی سے جواب دیا۔

”تم آخر چاہتی کیا ہو۔“ ولی زنج ہوا تھا۔

”تمہاری ہاؤس کی پیر بن جاتی ہوں۔ مناسب سا معاوضہ دے دیتا۔ مجھ سے ملنے لگی گویا نہیں جانتا۔“ جیسی نے گویا التماس کی۔

”میں اپنے کام خود کر سکتا ہوں۔ ہاتھ سلامت ہیں میرے، اور اتنا امیر نہیں ہوں میں کہ ہاؤس کی پیر انورڈ کر سکوں۔“ وہ تنک کر بولا۔

”تم جتنا انورڈ کر سکتے ہو اتنے ہی روپے دے دیتا۔“

”میں کم سواری! تم کسی اور کا گھر دیکھ لو۔“ وہ قطعاً اس کی التجاؤں سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

”ہم جیسوں کو کام مشکل سے ملتا ہے۔“ جیسی رو دینے کو تھی۔

”کیا مطلب؟“ اس نے بھنوس اچکانیں۔

”میں اور میں ترکی سے آئے ہیں۔ دس سال پہلے میں نے ایک انگریز سے شادی کر لی تھی۔ پھر ہم لوگ برلن آ گئے۔“

”تو ابھی تک ال لیگل ہو۔ چوری چھپے کام کرتی ہو۔“ ولی گویا ساری بات سمجھ چکا تھا۔

”نہیں! ایسی بات نہیں۔ پیپرز کلیئر ہیں، ٹیکس۔“ وہ کچھ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

”مگر کیا؟“ ولی مشکوک نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

”میں غلط قسم کا کام کرتی تھی۔ یہ لوگ غیر ملکیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ پولیس آئے دن کے چھاپوں اور انکوائری کی وجہ سے میں کام ٹھپ ہو گیا تھا۔ پھر میں نے ایک بلڈنگ میں فلیٹ کر کے پر لیا اور اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا، مگر پھر اس کام میں بھی میں کو پرافٹ نظر نہیں آیا۔ میں شراب نوشی کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی، ابھی مجھے کام کرنا پڑا۔“ اس نے سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”تو میں کیا کروں۔“ پورا قصہ سن کر ولی کا دل کچھ اور بھی برا ہو گیا تھا۔ اس نے بازو سے پکڑ کر جیسی کو گھسیٹا اور دروازے سے باہر دھکا دے کر بولا۔ ”آئندہ مجھے تم دوبارہ نظر آؤ تو پولیس کو بلاؤں گا۔“

آخری کوشش کے طور پر وہ لیٹن ہیوٹ کے فارم میں چلی آئی۔ اس کی توقع کے برعکس لیٹن ہیوٹ نے ادھار چھلی دے کر جیسی کو سرشار کر دیا تھا۔ وہ خوشی خوشی ٹراوٹ کا بھاری بھر کم تھیلا اٹھائے واپسی کے لیے چل دی تھی۔

تین سیکڑے گھوم کر گھر گھر مچھلی کے خریداروں کے در کھٹکھٹائی جیسی بہت بڑھال ہو چکی تھی۔ اس کی سانس

پھولنے لگی تھی۔ چہرے پر سینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔ وہ کھنکھن سے چورہو لیے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

”کیا تھا جو وہ پاکستانی مجھے میڈی کی جاب دے دیتا۔“ وہ رنجیدگی سے سوچنے لگی۔

”تو کیا جیہلنا و لمر! تم ایک مرتبہ پھر کسی پاکستانی پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔“

جیسی نے شدت کے ساتھ اس بوجھ کو محسوس کیا تھا جو اس کے اندر سانس لے رہا تھا۔ جیسی کی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ بھگینے لگیں۔



پلایا معمول کے بزنس ٹور کی غرض سے برطانیہ گئے تھے۔ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک افریقین عورت تھی۔ کالی سیاہ بے حد بد صورت، بڑی بڑی آنکھوں والی۔ مونے مونے ہونٹ تھے۔ اور سفید ہموار موتیوں جیسے جگمگاتے دانت۔ اس کے دانتوں کی خوب صورتی کالی رنگت کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ بال بے حد ٹھنڈے لے تھے، بھورے سے سیاہی مائل، اتنے برے لگتے کہ دیکھ کر جی متلانے لگا۔ وہ قطعاً ”خوب صورت“ نہیں تھی، مگر پلایا کو نہ جانے اس میں کیسا حسن دکھائی دیا تھا کہ وہ ڈولن سے نکاح کر کے اسے گھر لے آئے تھے۔

گل بخت کی جگہ گاہیں ماند پڑنے لگی تھیں۔ اس کا نوخیز حسن اداسی کی لپیٹ میں چھپ گیا۔ وہ جو کتنی بھی کہ احمد صاحب اگر چہ تھی، پانچویں شادی کر لیں اسے قطعاً ”یروا نہیں ہوگی۔ اب اس عمر کی وجہ سے کملا کر رہ گئی تھی۔ دادا دادی، گل بخت کے اس صدمے کو کسی بھی طرح کم نہیں کر سکتے تھے۔

مگر پھر آہستہ آہستہ وہ انٹراور انٹراں کے وجود میں اپنے لیے سکھ اور مصروفیت ڈھونڈ چکی تھی۔ مگر احمد صاحب نے ایک مرتبہ پھر گل بخت کو عظیم صدمے سے دوچار کر دیا۔ انٹراور انٹراں کو کالونٹ میں بیچ دیا گیا تھا۔ گل بخت ایک مرتبہ پھر روٹی دھوتی رہ گئی تھی۔ وہ

بچوں کو خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر پاپا کو بیٹوں کا مستقبل عزیز تھا۔

ان دونوں شانی بھی نہ جانے کن خیالوں میں گم رہتی تھی۔ کبھی کبھی روشا نے سے بہت یاسیت بھرے لہجے میں کہتی۔

”روشی! تم کس قدر حسین ہو“ اور میں شانی خوب صورت نہیں تھی۔ اس کی رنگت بھی سادہ سی تھی۔ نقش بھی معمولی تھے۔ البتہ اس کا دل بہت پیارا تھا۔

وہ عمر میں شانی سے ایک سال بڑی تھی۔ مگر اس کی سوچ پر کسی بھی آدمی کی چھاپ نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک جانوروں کو دیکھ کر ہوش سی چمک اٹھنے لگتی تھی۔ وہ لڑکپن کی بھول بھلیوں میں گم تھی۔ ابھی تو کوئی خواب آنکھوں میں نہیں اترتا تھا۔ جب اسے کسی کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ یہ دوا، دوا، دوا نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ یہ کیا ان کا حکم تھا جسے پاپا نے خاموشی سے سن لیا۔ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اتنا بھی نہیں کہہ سکے تھے کہ اس کی تعلیم ادھوری ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکے گی۔ مگر ان کے خاندان میں عورت کے جذبات و احساسات کا خیال رکھا ہی کب جاتا تھا۔ عورت تو ان لوگوں کے نزدیک ربڑ کی گڑیا تھی جسے توڑ مروڑ کر اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

اے لیول کے فاسٹل ایگزامز کے بعد اس کی شادی طے کر دی گئی تھی۔ دوا تو اتنا پڑھانے کے حق میں نہیں تھی۔ انیس یہ ہی خوف بیشہ جکڑے رہا تھا کہ فر فر انگریزی بولنے والی ان کی یہ پوتی کان میں جا کر کوئی چن نہ چڑھالے۔

پھر وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ انہیں پوتیوں سے یہ ہی خدشہ رہا تھا اور وہ شکرانے پر دھنسی تھیں کہ گل بخت کے ہاں کسی لڑکی ولادت نہیں ہوئی۔

روشی نے ایک مرتبہ بھی پوچھا نہیں تھا کہ اسے کس کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ وہ پوچھ کر کرتی بھی کیا۔

دوا، دوا، دوا اور گل بخت کس قدر مسرور تھے سب۔ اور گل بخت کہہ رہی تھی۔

”میر زکاء حیات خان روشی کے سگے ماموں کا بیٹا ہے۔ اور گل بخت کا چھوٹا بھائی ہے۔“ درانی قبیلے کے نئے سردار میر زکاء حیات سے اس کا مقدر جڑنے والا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اپنے نھیال والوں کا نام سنا تھا۔ یہ کیسے خون کے رشتے تھے جنہوں نے کبھی پلٹ کر اپنی اولاد کی اولاد کو پوچھا تھا کہ میں نے کس کی گود میں نہیں کی تھی، اور اب وہی اس کے اصل حق دار ٹھہرے تھے۔

دو جنوری کی شام ہری پور سے ایک قافلہ آیا تھا۔ بزرگ مردوں کے سروں پر سفید برقع پکڑا ہوا تھے۔ نو جوان لڑکوں نے کندھوں پر اجرک رکھی تھی اور پہاڑی پارہہ عورتوں کی بچہ دیکھنے کے لائق تھی۔ گھیردار ریشمی ٹیئس اور قیمتی فراک پینس زیورات سے لدی پھندی عورتیں آج مسکرا رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں نے بھی اپنا روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے سروں پر بھی چھوٹی چھوٹی فراک کے ہم رنگ اوڑھنیاں تھیں۔

روشی ایک کمرے میں کسی پتھر کی صورت کی طرح جی سنوری خاموش بیٹھی تھی۔ اسے شکر کی بہترین پویشی نے تیار کیا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت قیمتی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا۔

یہ پہاڑی گاؤں تھا۔ اسے ایک سرخ پتھروں سے بنی وسیع و عریض عمارت میں لایا گیا تھا۔ نہ جانے کتنے برآمدے، کتنی راہ و دریاں اور کتنے ہی والان تھے۔ اس عمارت میں۔ اونچی چھتوں والی یہ عمارت اپنے وقت کے معماروں کی ذہانت اور حسن ذوق کا منہ بولتا ثبوت

تھی۔ لکڑی کے بھاری قدیم منقش دروازے، ہموادار کمرے، دیواروں میں نصب میکر کی لکڑی کی کھڑکیاں کھلے کھلے روشن دیاں۔ دیواروں پر بھی خوب صورت نقش نگاری کی گئی تھی۔ فرش دیز قالیں سے آراستہ تھا۔ اور روشا نے قالیں کے ڈیزائن میں کھوئی بدلتے وقت کی کروٹوں میں چھپی ان دیکھی آنکھوں کو محسوس کرنے کی کوشش میں تھی۔

یہاں سب چہرے روشی کے لیے انجان تھے۔ ان عورتوں میں کسی سے کوئی بھی بارات کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ حتیٰ کہ مہرا فزوں بھی نہیں۔ جو کہ اس کی سب سے چھوٹی مائی اور ساس کے عمدے پر فائز تھیں۔

روشی سر جھکائے لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ جب ایک مدھری آواز سن کر اس نے پلوں کی چلن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بالمقابل ایک بلا کی حسین اور نازک اندام عورت کھڑی تھی۔ اس قدر خوب صورت کہ پار بار دیکھنے کو جی ٹپکنے لگتا اور طبیعت پھر بھی سیر نہ ہوتی۔ مدیرے جیسی سفید اور سرخ گلاب کی طرح ترو ترو پوٹ لگتا تھا کہ وقت اس عورت کو چھوئے بغیر گزر رہا ہے۔ سیاہ آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ اس کے بال بھی یقیناً سیاہ تھے۔ گلابی دوپٹے کو اوڑھے وہ بہت باوقار، خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ مہرا فزوں نے شاید کسی ملازمہ کو آواز دی تھی۔

”جنجورا! گھنچو را!“

”جی کر اس، حکم لی!“ ایک درمیانی عمر کی خراشت سی عورت کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھل تھا۔ جس میں بے شمار سکے تھے۔ ”ادھر لے جی آ۔ میں میر زکاء کی بیوی کا صدقہ تو اتاروں۔ میری پہلی نو (سو) کا قدم پڑا ہے۔“

”زری خان کو بلاؤ۔“ مہرا فزوں نے اسی ملازمہ سے کہا۔ کچھ دیر بعد زروس خان جسے سب پیار سے زری خان بولتے تھے اندر چلا آیا تھا۔

”مما! کیا بات ہے؟“ وہ ناگواری سے بولا۔ ”ادھر بھرجانی گاؤں کا پکڑ کر ٹینگ مانگ۔“

”اچھا۔“ زروس خان کی ناگواری پل بھر میں زائل ہو گئی تھی۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے عین روشا نے کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں تو بھرجانی! اب بتاؤ کیا ہوگی؟ کتنا طرف ہے دینے کا؟ میں کیا انگوں تم سے؟“ اس کے لبوں پر شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ روشا نے کو نگاہ اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ اس کے سامنے خوش لباس اور ملا کا خوش شکل نو جوان بیٹھا تھا۔

”بھرجانی کو تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ انگریزی میں بات کرنا زری خان۔ ”اس شوخ آواز پر روشی نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ یہ آواز گیتی کی تھی۔

”ہو لو نا بھرجانی! کیا ہوگی؟“ زری خان اب بہت شکستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ روشی زری خان کے انگریزی بولنے پر حیران نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے قبیلے میں مردوں کو اعلا تعلیم دلوائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان ہی مردوں کے نام سے ان کے خاندان کی حشمت برقرار رہتی ہے۔ البتہ عورتوں کی اکثریت ان پڑھ ہوتی ہے۔

”تم میں تو پیسے دے جاتے ہیں۔ تم مانگو کیا مانگتے ہو؟“ روشی کی مدد کے لیے گل افشاں میدان میں کود پڑی تھی۔

”یہ میرا اور میری بھرجانی کے درمیان معاملہ ہے۔ تم لوگوں کو کچھ میں آنے کی ضرورت نہیں۔“ زری خان نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

”کیا دلی؟“ گھونگھٹ کی آڑ میں سے اس کی مدہم آواز ابھری تھی۔

”میں تم سے روپیہ نہیں مانگوں گا۔“ ”تو کیا لوگے؟“ روشی کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

”ایک عمد۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”کیسا عمد؟“ روشی پھر حیران ہوئی۔

”تم عمد کرو میر زکاء کے سامنے کبھی نہیں جھگوگی۔ تم نے میر زکاء حیات کے دل کو بد لیا ہے۔ سوچ کو بد لیا ہے۔ تم نے ہر دھمے لکھے جاہل نہیں دیکھے! میر زکاء کو دیکھ لینا۔ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کا پوزیشن ہولڈر ہے۔“

وہ اس بستی، اس قبیلے اور ہمارے علاقے کا سردار ہے اور ہم سب اس کے فیصلوں کے محتاج، بے بس ہیں۔ حتیٰ کہ بیابانی اس کے فیصلے کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے۔“ اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا۔ روشی ششدر میں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا تھا۔ پھر تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد روشی اس کمرے میں تھمتھی۔ اسے جینز میں احمد صاحب نے نئی مریخ زمینیں دی تھیں۔ سونا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ازبک ہاؤس سے کچھ نہیں ملا تھا۔ توجہ نہ پارانہ محبت۔

”روشی! تم احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ تم بیابانی سے پوچھو، وہ تمہیں اپنے قبیلے میں مت کھائیں۔ وہاں تم کیسے رہو گی۔ تم سبک سبک کر مر جاؤ گی روشی! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ کچھ کہتی کیوں نہیں ہو؟“

”گل بخت بولی تھی کیا؟ جب اسے جوان ہوتی لڑکیوں کے باپ سے بیاہ دیا گیا تھا۔ مالکہ مہی نے احتجاج کیا تھا؟ پھر میں کیسے بولوں؟“ وہ اطمینان سے کہتی اور قتل قتل بننے لگتی، وہ اپنی کھٹکاتی ہنسی میں تمام درد پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ شانی آزدوگی سے اسے دیکھتی رہ جاتی۔

”گل بخت کا تم سے کیا مقابلہ۔ وہ تو گوٹھ کی اذیت زندگی سے چھٹکارا پانے پر خوش ہے۔ جبکہ تم روشی! شانی کے حلق میں آنسوؤں کی چھین ہونے لگتی تو وہ لب بلبھنے خاموش ہو جاتی۔

”بیابانی کے سینے میں دل کی جگہ پتھر فٹ ہے۔ کیا تھا جو میر زکاء کی جگہ ولی حاکمان کے پر پول کو ایکسیڈنٹ کر لیا جاتا۔ کتنی خوبیاں ہیں ولی بھائی میں۔ کس قدر خوش اخلاق ہیں۔ کتنی خوب صورت باتیں کرتے ہیں۔ کتنا احترام ہوتا ہے ان کی آنکھوں میں، لہجے میں ہمارے ساتھ بات کرتے ہوئے۔“

”ولی بھائی... روشی کا دل دھک سے رہ گیا۔“ ولی بھائی کا پر پول میرے لیے یہ کب کی بات ہے؟“ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ روشی نے پوچھ ہی لیا

تھا۔

”مہی نے بات کی تھی بیابانی سے، علیحدگی سے کچھ عرصہ پہلے۔“

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ روشی نے احمقانہ سا سوال کیا۔

”مجھے سب بتا چل جاتا ہے۔ تمہیں اپنی خبر نہیں۔ دوسروں کی کیا رکھو گی۔ کبھی ولی بھائی کی آنکھوں میں غور سے دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“ روشی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے وہ تمہیں چاہتے ہیں بے حد حساب۔“ شانی پر سوچ انداز میں کہتی۔

”نہیں۔ نہیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔“ وہ دل کی بدلتی دھڑکنوں سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اور پھر جب نکاح نامے کے کاغذ اس کے سامنے آئے تو بغیر کچھ بھی سوچے اس نے دستخط کر دیے تھے۔

اور اب وہ اس کمرے میں بالکل تنہا خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔

بیکدم دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا، روشی چونک سی گئی۔ اس کا دل پیلو میں زور سے دھڑکا تھا، کمرے میں داخل ہونے والا اب اس کے مقابل کھڑا تھا وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ اگرچہ روشی نے میر زکاء کو دیکھا نہیں تھا۔ مگر اس کی وجاہت کے کافی قصے سن رکھے تھے۔ لاشعوری طور پر وہ میر زکاء کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ گل زیب تھی۔ اس کے سب سے بڑے ماموں کی بڑی بیٹی۔

”کس کا انتظار کر رہی ہو روشانی خان!“ وہ آنکھوں میں اترا پانی صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”ذکاء آج تو تمہیں آئے گا۔ آج تم دونوں ساس بھو کے سماگ شغل فرما رہے ہیں۔ مہراؤں کو کوئی پروا نہیں۔ تم بھی بے پروا ہو جاؤ۔ تب ہی تو یہاں زندگی بسر کرنا ہو گی۔“

وہ پھر سے ہنسنے لگی تھی۔ جب ہی دروازہ کھلا تھا اور شاید میر زکاء اندر داخل ہوا۔ گل زیب کو دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلودہ ہوتی چلی گئی تھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

”جی رہی ہوں۔“ وہ ہنستا ترک کر کے بوکھلا کر باہر نکل گئی تھی۔

”کیا بیابانی کی ہیں گل زیب نے؟“ اب وہ روشی کی طرف متوجہ ہوا۔

”کک، کچھ بھی نہیں۔“ وہ ایک دم گھبرا سی گئی۔ ”کہہ بھی دیں تو میری ہلا سے۔“ میر زکاء شفر سے بولا۔

پھر ایک دم ہی اس نے لہجہ بدل لیا تھا۔ آج تو اسے غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آج تو فتح کی جشن کی رات تھی۔ وہ مسرور تھا، شاد تھا۔ احمد خان ازبک کی بیٹی اس کی خواب گاہ میں موجود تھی۔ اس کی پھوپھی کو ازبکیتیں، تکلیفیں دینے والوں کا تمام عمر اس کے سامنے سر جھکا رہے گا۔ اس سے بڑی فتح کیا ہو سکتی ہے۔

اس نے اپنی دادی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی احمد خان ازبک کی بیٹی کو ایسے ہی زندانوں میں قید رکھے گا۔ وہ اپنی پھوپھی، شہرہ گل کے قاتلوں سے اسی طرح بدلہ لیتا چاہتا تھا اور اس کی دادی، بخت نور اس کے تمام فیصلوں کو سراہتی تھیں۔

”چھٹا تو تم احمد خان کی بیٹی ہو۔“ میر زکاء نے گویا بہت ہی لطف لیا تھا۔ روشی اس کے لب و لہجے کی کالت پر رنگ رہ گئی تھی۔

”کیا کوئی پہلی رات اپنی دلہن سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔“ وہ سوچتی رہ گئی تھی۔ اور بہت بہادر ہونے کے دعوے کرنے والی روشانی خان کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

”میری پھوپھی کے ساتھ تمہارے باپ نے پتا ہے کیا کیا تھا؟“ وہ دو قدم چل کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اتنا قریب کہ روشانی اس کی گرم سانسوں کو، بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

”اس کا گلا یوں گھونٹ کر مار دیا تھا۔“ میر زکاء نے اپنے دونوں ہاتھوں سے روشی کی گردن پر اتار دیا وڈالا تھا کہ گلے میں موجود نمکلس اس کی نازک گردن میں کھپ کر رہ گیا تھا۔ روشی کی بے ساختہ گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔

”میری پھوپھی بھی تمہارے باپ کے معیار پر پورا نہیں اتر سکی تھی۔ وہ بد صورت تھی۔ اس کے چہرے پر چپک کے داغ تھے۔ وہ اپنا بڑھ تھی۔ تو کیا ان باتوں کی وجہ سے ایک عورت کا قتل کرونا جائز ہے؟“ اس کے خون آشام لہجے میں بھوکے شیر کی غراہٹ تھی۔

”قتل، میری ماں کا قتل بیابانی نے کیا ہے؟“ روشی کا دماغ چکرانے لگا تھا۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

”میں نہیں مانتی۔“ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی بھی نہیں مانتا۔ اس ڈرامے کی پوری اسٹوری تمہاری دادی بدیہی جہاں نے ترتیب دی تھی۔ وہ ہی اس ڈرامے کی ڈائریکٹر تھیں۔“ وہ نفرت سے سر جھٹک کر بولا۔ ”تمہارا باپ ایک عیاش آدمی ہے۔“

”تم خود کیا ہو؟“ روشانی نے بھی اسی طرح شفر سے سر جھٹک کر کہنا چاہتی تھی۔ مگر لب بلبھنے کی صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔ ”اس گھر میں رہنا چاہتی ہو تو زبان سی کر اور سر جھٹکا کر رہنا ہو گا۔ بک بک کی تو کوئی سینے میں اتار دوں گا۔ ہماری عورتیں مردوں کے دبدو گفتگو نہیں کرتیں۔ تمہارا کام صرف خدمت کرنا ہے۔“

رفاقوں کی یہ سیاہ شب روشانی خان کے لیے نفرتوں اور دلتوں کا ایک نیاباں کھول گئی تھی۔

ساری رات روشانی سستی رہی تھی۔ اس کا انگ انگ جھٹکن سے چور تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں طبعی موت مری تھیں۔ البتہ اس کی دادی کی وہ ناپسندیدہ ہو تھیں۔

اس شادی کا اصل مقصد بہت جلد روشی پر واضح ہو گیا تھا۔ اس کے سردار کے ماموں میر اورنگ زیب نے احمد خان کی بیٹی سے اس لیے میر زکاء کی شادی کی تھی کہ اپنی بہن شہرہ گل کو جینز میں دی جانے والی لاکھوں ایکڑ اراضی کو واپس لیا جائے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ گل زیب نے اسے بتایا تھا کہ

اورنگ زیب کے اس کے پایا کے ساتھ بے شمار اختلافات تھے سیاسی سماجی ہر طرح کے اختلاف۔ ہر ایک کشمکش پر ان کا بھڑالا لازمی ہوتا تھا۔ روشی کے بڑے پایا مسلسل تیسری مرتبہ قومی اسمبلی کی اپنی خاندانی سیٹ جیت گئے تھے اس فتح کا جشن آٹھ دن منایا گیا تھا۔ پایا کا ہر طرح سے سپورٹ کرتے تھے میر اورنگ زیب کو اس بات پر بھی غصہ تھا۔ وہ ازبک قبیلے والوں کو ڈک پر بچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اور اب تمام عمران کا سر جھکانے کے لیے ایک کمزوری اورنگ زیب میر کے ہاتھ اٹھائی تھی۔ اور وہ اس کمزوری سے ہر صورت فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ جبکہ روشی بھی خود سے ایک عہد کر چکی تھی۔

کسی کے جھنجھوٹے پر روشی نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اتنے لوگوں کو دیکھ کر روشی ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔

یہ اس گھر میں روشی کی تیسری صبح تھی۔ ”میں تمہیں جگانا نہیں چاہتی تھی، مگر ان بچوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ یہ اپنی بھر جانی کو دیکھنا چاہتے تھے۔“ مہر افروز نے اپنے ارد گرد کھڑے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مما! پہلے تعارف تو کروائیں۔“ اک شرمیلی شرمیلی نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا۔

”میں بتاتی ہوں بھر جانی کو کہ ہم کون ہیں۔“ دوسری پر اعتمادی لڑکی پری پڑنے لگی۔ ”مہم مہر افروز کی بیٹیاں ہیں۔ بھائی ذکا سے چھوٹا زری خان ہے، پھر یہ فضا پتی ان کے بعد ماوی ہے، پھر میں ہوں، میرا نام جوہی ہے۔ پھر زنا اور پرمان ہیں۔ پری دخت پانچ سال کی ہے اور اس سے نو سال بڑا زخام ہے۔ اسے بی جاننا (دادی) نے بورڈنگ بھجوا دیا ہے۔ حالانکہ ممّا اسے بھیجنا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر وہ بہت ہی کالا ہے۔ سو بی جاننا کے جاری کردہ بیان کے تحت وہ خانوں کی

نسل میں کلنگ کاٹیا ہے۔ اسے بی جاننا اپنا پوتا سرے سے تسلیم نہیں کرتیں۔ ہم چھ جنمیں اور ہمارے تین بھائی ہیں۔ بھائی ہمیں جان سے پیارے ہیں اور بھایا ہماری جان لینے پر تلے رہتے ہیں۔ ہم زبائیں رکھنے والی بے زبان مخلوق ہیں۔“

”جوہی!“ مہر افروز نے ناگوار سی سے جوہی کو ٹوکا تھا۔ وہ ہونٹ بکلتے ہوئے خاموش ہو گئی۔ یہ چھ لڑکیاں اس کی مندریں تھیں اور مقام افسوس یہ تھا کہ ان میں سے کسی نے بھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں۔ اس گھر میں نیوی نہیں تھا۔ ٹیپ ٹاپ اور کمپیوٹر موجود تھے۔ مگر صرف ذکا کے کمرے میں۔ جوہی نے بتایا تھا نیوی وغیرہ گیسٹ ہاؤس میں ہے۔ سی ڈی پلیئر اور میوزک سسٹم بھی وہیں ہے۔ عورتوں کی اکثریت ان بڑھ تھی۔ اسی لیے کسی اخبار یا رسالے کا گھر میں آنا ناممکن سی بات تھی۔

”اب تم اٹھ چکی ہو تو میں تمہارا ناشتا بھجواتی ہوں۔“ مہر افروز نے پری ماوی اور پنا کے باہر جانے کے بعد کہا۔

”میں پہلے ہاتھ لوں گی۔“ اس نے تجھلنے ہوئے کہہ دیا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔ میں پانی گرم کروا دیتی ہوں۔“ انہوں نے عام عورتوں کی طرح جھلائی، ٹوٹتی نظر سے اسے دیکھ کر شرمندہ نہیں کیا تھا۔ ان کے لمبے میں با کی سادگی تھی۔

وہ ایک سادہ سافٹیس سوٹ اور اپنا تولیہ نکل کر باہر نکلنے لگی تھی، پھر کچھ سوچ کر پلٹ آئی۔ اس نے اپنے امپورٹڈ بیگ میں سے باڈی لوشنز، پاؤں اسپرے، ہیر اسپرے، کولڈ کریمز اور ایر فریشنگ بوتلیں نکال کر دیوار میں نصب آئینے کے نیچے بے ہمت ہی اسٹائلش نیسلف نما اسٹینڈ میں ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ اس کرٹل کے اسٹینڈ میں صرف ایک بھٹو برش اور مروانہ کلون رکھا تھا۔ پھر روشی نے اپنا سارا کاسمیٹکس کا سامان بھی اسی وسیع و عریض کرٹل کی شیٹ پر سجا دیا تھا۔

وہ اپنے وہیاں میں اس قدر مگن تھی کہ اسے کچھ بل کے لیے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ چونکی تو تب جب پھر شوق نظروں کی تپش محسوس ہوئی۔ اس کے قریب جوہی، پرمان اور پری کھڑی تھیں۔ وہ بہت ہی اشتیاق سے اس جی جی کرٹل کی شیٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایسی چیزیں بھلا کائنات کبھی نہیں۔

”بھر جانی! تم یہ سب لگاؤ گی۔“ پرمان نے جھگڑاتی آنکھوں سے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”پھر تم اور بھی حسین لگو گی۔“ پری خوش دلی سے بولی۔

”ہاں نہیں، یہ تم بتانا۔“ وہ فیس واش اور شیمپو کی بوتل اٹھا کر ہر نکل گئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے بچوں سے کہا۔ ”میں ابھی آتی ہوں، پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے بھر جانی!“ انہوں نے خوشی خوشی کہا۔

وہ طویل عریض راہ داریاں، برآمدے عبور کر کے والان میں آگئی تھی۔ دائیں جانب ایک ترتیب سے تین غسل خانے بنے تھے۔ اس نے تینوں میں جھانک کر دیکھا اور بد مزہ سی ہو کر وہیں کھڑی سوچ رہ گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو بھر جانی؟“ ماوی نے جانے کس کونے سے برآمدہ ہوئی تھی۔ ”چھا اچھا تم نے غسل کرنا ہے۔ یوں کرو اس ساتھ دالے ہاتھ روم میں چلی جاؤ۔“ ماوی نے ہاتھ کے اشارے سے ایک الگ

تھلک بیٹھک نما کمرے کے ساتھ بنے واش روم کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مردوں کے استعمال میں ہے۔“

وہ اس کے برابر چلتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ روشی نے جون ہی دروازہ کھولا تو وہ حیران ہی رہ گئی۔ سفید دودھیا جھگڑا تے نالوں سے چمکتا دیوار میں نصب صاف شفاف آئینہ، بڑے بڑے سفید رنگ کے چمکتے واش مین ترتیب سے لگے تھے۔ چمکتی نالوں سے سجی دیواریں۔ ٹونیاں، شاور، حتیٰ کہ میز بھی۔ نفیس شیشے کی شیٹ پر کئی طرح کے صابن، شیمپو، پاؤں

اسپرے، ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کی کھوٹی بھی تھی جس پر میز ذکا کا ساٹھ لٹکا ہوا تھا۔ ”اس لیے ہر طرح کا آرام اور سہولت میا کر رکھی ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ یہ کیسے حاکم ہیں؟ جو اپنی رعایا کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔ اور رعایا میں بھی تو ان کے خون کے رشتے تھے۔ مایا، ہمیں، بھابھیاں، بیٹیاں۔ پھر یہ ظلم کیوں؟ یہ زیادتی کیوں؟“ اتنی تقریق کیوں؟ روشی سوچے جا رہی تھی۔ اس نے بہت دلی لگا کر غسل کیا تھا۔

باہر آئی تو ماوی ابھی تک شاید اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

”اتنی دیر لگا دی تھی بھر جانی! اگر بھایا آجاتے تو۔۔“

”تو کیا کہہ لیتا تھا میر صاحب نے۔“ وہ بہت فریش تھی۔ کھلی کھلی تروتازہ۔ اس وقت اس پر کسی اذیت کسی تکلیف، کسی غم کا شائبہ نہیں تھا۔

”مشر کرونا تھا انہوں نے میرا بھی اور تمہارا بھی۔“ اس طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں۔

”چھاب بھایا کو بتانا نہیں۔ اور صبح والی بات بھی نہ بتانا۔“ ماوی نے تنبیہ کر دی۔

”کون سی بات؟“ روشی چونک سی گئی۔

”یہ کہ ہم نے تم کو صبح جگا دیا تھا۔“

”یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ میر صاحب کو بتائی جائے۔“ روشی ہنس پڑی۔

”یہ تو تم کہہ رہی ہو نا! اگر بھایا کو خبر ہوگی کہ ہم نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا ہے تو سمجھو ہم سب کی خیر نہیں۔ ان لوگوں کو اپنی بیویوں کے آرام کا برا خیال

رہتا ہے۔ بیویوں سے مشقت جوہی ہوتی ہے۔“

ماوی نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔ مگر روشی کے چوہہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ اتنی سی بچی کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر اس کا حیران ہونا فطری تھا۔ ماوی

ابھی پندرہ سال کی تھی۔ اس عمر میں روشی کو تو جانوروں کے لاڈ اٹھانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اور یہ لڑکی کس قدر باشعور تھی۔ وہ ماوی کو سمجھانا چاہتی تھی مگر

سامنے سے آتی جوہی کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”بھرجانی! ناشتا کرو۔“

دستر خوان گول کمرے میں لگتا تھا۔ مگر روشی کو کھانا اس کے کمرے میں دیا جاتا تھا۔ یہی جاننا کا حکم تھا۔ سو آج بھی روشی سوچ رہی تھی کہ تنہا ہی ناشتا کرنا پڑے گا۔ مگر اس کا خیال اپنے کمرے میں موجود ہر عمر اور ہر ساڑی مند کو دیکھ کر غلط ثابت ہو گیا۔

فیروزہ اور خفائے ناشتے کے لوازمات میز پر سجادیے تھے۔ ”بھرجانی! آج ہم تمہارے ساتھ ناشتا کریں گے۔“ پری دخت نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ پشتونہ لہجے میں اردو بولتی پری اور بھی پیاری لگتی تھی۔ سرخ انار جیسے دھتے پھولے پھولے گال اور سنہری آنکھوں میں معصومانہ چمک لیے وہ اپنی نئی تولی جی جی سی بھرجانی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے پاس بیٹھے، چھوٹے اور ڈھیر ساری باتیں کرنے کا ارمان پری کے دل میں تھا۔ بھرجانی کے قریب سے کس قدر بھینکی۔ یہی روح میں اتر جانے والی دلفریب معطر خوشبو آتی تھی۔ اسی لیے تو روشی جب بالوں کو برش کر کے خوب کسی بہترین ریووم کو اسپرے کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھنے لگی تھی تو پری جھٹ سے روشی کے دائیں طرف چپک کر بیٹھ گئی۔ اس کے بائیں طرف پنا اور برنار بھی بیٹھی تھیں۔ جب ہی مہرا فریوں بھی چائے کا ٹھرموس اٹھائے آئیں۔

”ان سب کی خواہش تھی تمہارے ساتھ ناشتا کرنے کی۔“ بھی تو دسترخوان پر صرف لی جاننا کو دکھانے کی غرض سے منہ چلاتی رہی ہیں۔“ انہوں نے کچھ شرمندہ سے انداز میں بتایا تو روشی بے اختیار بولی۔ ”مما! مجھے بھی تنہا کچھ بھی کھانے کی عادت نہیں۔“

”ہاں۔ ہاں! اس لیے میں نے میر کو کہا بھی تھا۔ دلہن کے ساتھ ناشتا کر لے۔ میں نے کہا شری کی بیٹی ہے۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جائے گی مگر یہاں کے مرد عورت کی بات کو بے قیمت سمجھتے ہیں۔ چاہے مقابل مال ہی کیوں نہ ہو۔ بولا زیادہ سرخڑھانے کی ضرورت نہیں۔“

وہ بہت آہستہ آواز میں گویا خود سے مخاطب تھیں۔ وہ اسی طرح دھیمادھیمائے اثر بولتی تھیں۔ یہاں پر سب عورتیں ہی آہستہ بولنے کی عادی تھیں۔ ”بھرجانی! کھاؤ نا۔“ خفیا تمام ڈشز سے ڈھکن اٹھاتے ہوئے بولی۔

شکر قدی کا طوطہ قیمہ بھرے پر اٹھے، اندرے گرما گرم تازہ روٹ فش، آم کا مرہ۔ روشی کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ حالانکہ وہ دیکھی قسم کے ناشتے کی عادی نہیں تھی۔

”بھرجانی! میں تو کھانا بھی تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔“ روایتی گھیر دار خراک اپنے سر پر دوپٹہ اوڑھے پری دخت معصومیت سے بولی تھی۔ ابھی وہ صرف پانچ سال کی تھی اور اسے بڑی بوڑھیوں کی طرح کس کر دوپٹہ اوڑھایا گیا تھا۔

”کیوں نہیں۔ میں تو خود پری کے ساتھ لہج اور ڈنر کروں گی۔“ اس نے پری کے گال کو نرمی سے تھپتھپایا۔

”لی لی! بڑے خان جی بلا رہے ہیں۔“ منجھو نے دو واڑہ کھول کر مہرا فریوں سے کہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ پیٹ میں رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

”مما! ناشتا تو کر لیں۔“ روشی بے ساختہ بولی۔ ”بڑے خان جی کروادیں گے۔“ جوبی اور ماوی ہنس رہی تھیں۔

”ابھی ایک منٹ بھی ممالیٹ ہو جائیں تو بیابا جان نے طوفان کھڑا کر دینا تھا۔“ خفیا دھیمی آواز میں روشی کو بتانے لگی تھی۔



ازبک ہاؤس سے اس کے لیے ایک بھی فون نہیں آیا تھا۔ اگر آیا بھی تھا تو روشی کو کسی نے بتانا گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی شانی بہت پریشان ہوگی۔ شانی سے ملنے کو وہ بھی بہت بے چین تھی۔ فون سیٹ لی جاننا کے کمرے میں تھا اور روشی اپنی سگی نانی کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان سے خائف رہتی تھی۔

اس نے سوچ رکھا تھا کہ رات کو میر جب آئے گا تو وہ اس کے سیل فون سے شانی کو فون کرے گی۔ جب پہلی مرتبہ روشی نے لی جاننا کو دیکھا تو حیران رہ گئی تھی۔ وہ لی پٹی بے حد سرخ و سفید سفید براق کپڑے پہنے سفید دووھیال بال۔ سخت پرتیکے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ یوں لگتا گویا کسی ریاست کی ملکہ ہیں۔ چہرے پر لاتعداد جھریاں۔ گہری گہری لکیروں میں چہرے کے نقش گم ہو چکے تھے۔ شاید کسی زمانے میں بہت خوب صورت تھیں۔ اس دہلے پتے سرایے میں بلا کا غنیش چھپا تھا۔ نہ جانے کون کون سی نفرتوں کا جوار بھانسا سلگ رہا تھا۔ روشی کو دیکھتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا۔

”اورنگ زیب کی ضد تھی، ورنہ احمد خان ازبک کی بیٹی کبھی یہاں دکھائی نہ دیتی۔“ انہوں نے نہ جانے کتنی دفعہ بتایا تھا۔ روشی حیران تھی کہ انہوں نے سگی نواسی کو پیار کرنا ایک نظر دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ مہرا فریوں اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر ہولے سے بدبدلی تھیں۔

”لی جاننا! نواسی ہے آپ کی۔ سر پر ہاتھ پھیر دیں۔“ بولایا نانی نے مہرا فریوں کو جھڑک کر خاموش کروادیا تھا۔ مہرا فریوں نے اسے اشارہ کیا تھا اور وہ اٹھ کر ان کے پیچھے آگئی۔ اس گھر میں بے شمار عورتیں تھیں۔ اس کی پانچ بڑی مہرائیاں، پانچوں سگی بہنیں تھیں اور لی جاننا کے بڑے پانچ بیٹوں سے بیانی تھیں۔

اس کے تین بڑے ماموں خاندانی دشمنی کی بھیجٹ چڑھ گئے تھے۔ چوتھے نمبر والے سیاست پر قربان ہو چکے تھے۔ کسی جلے میں تقریر کرتے ہوئے انہیں گولی مار دی گئی تھی۔ پانچویں نمبر والے ماموں سپینٹ کے ممبر تھے۔ علاقے میں بڑا نام تھا۔ پچپان تھی۔ وہ ایک شریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ سب سے چھوٹے اورنگ زیب تھے۔ ان کا بھی سیاست میں عمل دخل تھا۔ بیٹہ ازبک قبیلہ والوں کے مخالفین کے سپورٹر رہے تھے۔

سوئے ایک مہمانی کے باقی چاروں بہنیں بانیجہ تھیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ عشق النساء کی بھی صرف چار بیٹیاں تھیں۔ گل زینا، گل مالا، گیتی، گل افشاں۔ لی جاننا کو اس غم نے اوھ موا کر رکھا تھا کہ ان کی نسل کا نام اور پچپان ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے انہوں نے دور ان تعلیم ہی اور رنگ زیب کی شادی کر دی تھی۔ چودہ سالہ مہرا فریوں نے آتے ساتھ ہی انہیں پہلا پوتا دیا تھا۔ ایک سال بعد زوروس چلا آیا تھا۔ پھر دو دو سال کے وقفے سے چھ بیٹیاں تھیں۔

اگلی بار جب ان کی فیملی ڈاکٹر نے پھر سے پوتے کی خوش خبری دی تو لی جاننا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ مگر زخام کو دیکھ کر ان کے دل کو دھچکا لگا۔ انہوں نے گائی ڈاکٹر مسز کبیر الدین سے کہا۔ ”تمہیں یاد تو ہے کہ یہ ہمارا ہی بچہ ہے؟“ ”سو فیصد آب کا بچہ ہے، بہت بیکم۔“ انہوں نے یقین دلایا تھا مگر زخام ڈاڈی کی فطری محبت سے محروم رہا تھا۔



پھر اس صبح پہلی مرتبہ روشی کو ماموں جان کا پیغام ملا۔ وہ حیران سی ملازمہ کی ہمراہی میں طویل کوریڈور عبور کر کے دوسرے حصے میں داخل ہو گئی تھی۔ کوریڈور کے آٹے سامنے بے شمار کمرے تھے۔

”یہ میر صاحب کا کمرہ ہے۔“ ملازمہ نے مؤدب لہجے میں کہا اور واپس چلی گئی تھی۔ روشی نے دروازہ ناک کر کے ہینڈل کھمایا اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ یہ بیڈروم کسی سپر لکڑی ماسٹریڈ روم سے کم نہیں تھا۔ سفید چمکتی دیواروں والا۔ اس کے پیروں کے لمبے بہت ہی نفیس اور امپورٹڈ کارپٹ کو محسوس کر رہے تھے۔ اتنا نفیس اور شاندار فرنیچر تھا۔ گولڈن اور وائٹ کلر نمایاں تھا۔ بیڈر بہت نرم اور آرام دہ میٹرز بچھا تھا۔ جس کے اوپر بیڈ شیٹ بھی کسی کے اعلاذوق کی نشاندہی کرتی تھی۔ فلور کشنز کے کور بھی سفید تھے۔

صوفہ بھی وائٹ کمر میں تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سات آٹھ قسم کے پریوم رکھے تھے۔ دائیں دیوار پر ڈش کا امپلٹ لگا تھا۔

رائٹنگ ٹیبل بھی ایک کونے میں رکھی تھی۔ جس کے اوپر دو کمپیوٹر لپ ٹاپ اور بے شمار فائلیں پڑی تھیں۔ دائیں طرف دیوار میں بک ریک میں ڈیسکوں کے حساب سے کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ایکس اینج کالی وی اور میوزک سسٹم بھی موجود تھا۔ اور سب سے زیادہ روشنائی کو متاثر کرنے والی سفید ہی امپورٹڈ فریم میں موجود اعلیٰ نسل کے گھوٹوں کی تصویریں تھیں۔ سفید، سرخ اور سیاہ ریشمی بالوں والے گھوٹے۔ وہ ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لے چکی تھی۔

”بابا! اگر غور و فکر کر لیا ہے تو ادھر بیٹھو۔“ اس کی ساعتوں میں اورنگ زیب خان کی آواز اتری۔ وہ کچھ جھل سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھے ساتھ جوں ہی اس کی نگاہ اٹھی تو وہ گویا دنگ سی رہ گئی تھی۔ بیڈ سے کچھ فاصلے پر یو لوگ چیئر رکھی تھی۔ جس پر میر ذکاء بیٹھا بڑی فرصت سے آنکھیں سکڑے روشنائی کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے بلوایا تھا؟“ روشنائی اپنے ازلی براعتاد لہجے میں بولی تھی۔ میر ذکاء کو دیکھ کر تو اس کے لب و لہجے میں اور بھی ٹھہراؤ آیا تھا۔

”ہاں بابا! تم سے کچھ بات کرنا تھی۔“ وہ اخبار اور بائی فوکل گلاسز سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سیدھے ہو گئے تھے۔ روشنائی نے دیکھا وہ چھ فٹ کے اونچے اور صحت مند

سر لیا رہنے والے بے حد وجہ آدمی تھے۔ ان کی آنکھوں کا رنگ باواہی تھا۔ نقوش بھی کھڑے کھڑے تھے جن میں سختی نمایاں تھی۔ میر ذکاء اپنے باپ کی ہو ہو کاپی تھا۔ انہوں نے سفید کائن کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور وہ بہت ہی تروتازہ اور فریش لگ رہے تھے۔

ان کے ساتھ مہر افروں جیسی عورت ہی جتنی تھی ان ہی جیسی باوقار، برہمار اور بہت بلند۔

”کون سی بات؟“ روشنائی چونک سی گئی۔

”کتنی پڑھی لکھی ہو۔“ اس سوال پر روشنائی حیران ہوئی۔ تاہم اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اے لیول کیا ہے پھر؟“ اب کہ اورنگ زیب خان نے چونک کر پوچھا۔

”پھر شادی ہو گئی۔“

”لوہو۔ یہ تو بڑا سادہ روٹھا ہوا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟“ میر ذکاء نے بھی خاموشی تو ڈکری بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ جزبزی بولی۔ جی تو چاہ رہا تھا شاخ سے نہ کہہ دے مگر یہ سوچ کر خاموش رہی تھی کہ نہ جانے کب اس خان زاوے کا موڈ بدلے اور شائستگی کا چولہا اتر چکے۔

”تمہیں یہاں کوئی شکایت تو نہیں کسی سے۔“ وہ بہت بے ضرر سے سوال کر رہے تھے۔ روشنائی نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”مہر تمہارا خیال رکھتی ہے؟“

”جی!۔“ روشنائی آواز میں بولی۔

”جی جاناں کے رویے پر رنجیدہ مت ہونا۔ ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے تھے۔

”میں کسی کے رویے پر رنجیدہ نہیں ہوتی۔“ روشنائی کے لہجے میں عجیب سی چھین تھی۔ میر ذکاء نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”بابا جان! روشنائی کو مبارک دیں نا!“ اب وہ اٹھ کر باپ کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ عجیب سے طنز کی کاٹ تھی اس کے لہجے میں۔

”کیو اس مت کرو میرو!“ وہ ناراضی سے گویا ہوئے۔ ”روشنائی ہماری بیٹی ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ باقی جو بھی مخالفت، رنجش اور جھگڑے ہیں وہ سب ازبک قبیلے والوں کے ساتھ ہیں۔ ان کا روشنائی سے کوئی تعلق نہیں۔“

”اگر اتنی ہی بابا کے ساتھ دشمنی تھی تو ان کی بیٹی کو بیاہ کر کیوں لائے ہیں؟“ وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر لب بپٹے خاموش بیٹھی رہی۔

”رباحت خان سے ہمارے سیاسی جھگڑے ہیں۔ زمین کے معاملوں کی وجہ سے مخالفت اور مقدمے بازی چل رہی ہے۔ احمد خان اور رباح خان نے مجھ پر ناجائز قبضے کا کیس کیا تھا۔ اس کے فیصلے کی آخری تاریخ ختم نہیں ہے۔“

وہ گویا خود کلامی کر رہے تھے۔ ذکاء خان باہر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد واپس جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے شانی سے بات کرنا تھی اور وہ میر ذکاء کے کمرے میں فون دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میر ذکاء اس وقت اپنے کمرے میں موجود نہیں ہو گا۔ اسی لیے کھانا کھائے بغیر وہ قدموں سے چلتی ہوئی رابدار کی کے بیرونی دروازے کی چھتی گرا کر باہر نکلنے لگی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ یہ آواز گل زیب کی تھی۔ روشنائی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”مہم میں۔“ وہ ہٹکا کر رہ گئی تھی۔ اگر وہ گل زیب کو بتا دیتی کہ اپنی بہن سے بات کرنے جا رہی ہے تو گل زیب نے پورے عالم میں نشر کر دیتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے فون کرنے پر رابدار کی لگ جاتی۔ بی جاناں نے پہلے ہی حکم دے دیا تھا کہ روشنائی ازبک ہاؤس والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھے گی۔ اور ان کی دست راست عشق النساء بھی یہی چاہتی تھیں۔ انہیں بھی روشنائی کا وجود ٹھنکتا تھا۔

”مجھے میرے بلوایا ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے دیکھا گل زیب کے چہرے پر عجیب سی حسرت تھی۔

”جاؤ تم۔“ وہ کہہ کر ایک دم پلٹی اور اندھیری رابدار کی میں گم ہو گئی۔ روشنائی بے دھڑک ذکاء خان کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ مگر سامنے موجود زرد خان کو دیکھ کر گھبرا اٹھی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ خان کے کمرے میں کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔

”او، بھر جانی! ارک کیوں گئی ہو۔“ اس نے

”چاہیے۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اب بہت سہولت سے

☆ ☆ ☆

محسوس کیا تھا، زری خان کچھ گھبرا گیا ہے۔ حالانکہ گھبرانا تو روشنائی کو چاہیے تھا، مگر زری خان کی بوکھلاہٹ کی وجہ وہ جان نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ گلاس میں کوئی مشروب تھا۔ اور وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ روشنائی اس کے باہر جاتے ہی بے قراری سے فون کی طرف لگی۔ مگر دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ باہر سے ٹھٹھکی کی آواز آئی تھی۔ روشنائی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”زبے نصیب میں تو نہیں بلوانے والا تھا۔ مگر لگتا ہے تم مجھ سے بھی زیادہ بے تاب ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کتنی بھلی لگتی تھی۔ روشنائی نظریں جھکاتے شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ واش روم سے نما کر آیا تھا۔ اس کے بالوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ وہ گم صم سی میکا کی انداز میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ میر ذکاء کے لیے کھانا آیا تھا۔

”تم کھا چکی ہو؟“ وہ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”جی ہاں۔“ اس کی بھوک ایک دم ختم ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی شانی نے کال کیوں نہیں کی؟

”کیا سوچ رہی ہو؟“ ذکاء خان نے اسے گم صم دیکھ کر پوچھا۔

”آپ مجھے کس چیز کی مبارکباد دینا چاہتے تھے؟“

”بھلے وقت میں یاد کروا دیا ہے۔“ وہ فروٹ سلاڈ کھاتے ہوئے مزے سے بولا۔ ”تمہاری افریقن می سے ایک گفت ملا ہے تمہارے بابا کو۔“

”کیسا گفت؟“ روشنائی کا دل دھڑکنے لگا۔

”تمہاری ایک بہن ہوئی ہے۔“

”کب؟“ وہ چکر اکر رہ گئی تھی۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے متعلق بہت دھیان رتا تھا انہیں۔

”ابھی کچھ دن پہلے۔“ دے دے ایک بات ہے، پچہ افریقن امریکن عورت سے نہیں بلکہ خاندانی عورت سے ہونا چاہیے۔“ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اب بہت سہولت سے

روشی کے چہرے کے تاثرات پڑھنے میں مصروف تھا۔
”اوسمہ! ایسی خاندانی عورت جو تمام عمر آپ کی
باندی بن کر رہے۔ آپ کے بچے پیدا کرے۔ اطاعت
کرے اور بدلے میں صرف ذلت اور نفرت ہی ملے
اسے۔ آپ لوگ خاندانی عورتوں سے شادی اس لیے
کرتے ہو کہ وہ روایتوں اور خاندان کی نام نہاد رسموں
میں جکڑی ہوتی ہیں۔ تمام عمر زبان سے رکتی ہیں
جبکہ باہر کی عورتیں میری ممی کی طرح ذرا سی شرارت
بے وفائی کو دیکھتے ساتھ الگ ہو جاتی ہیں۔“

روشی نے زری خان کی سنہری باتوں کو ذہن میں
محفوظ کر رکھا تھا اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ نہ ڈرے
گی نہ جھکے گی۔ چاہے مقابل ذکا خان ہو یا بھجت
بیگم۔

”تم تو سمجھ داری کی باتیں بھی کرتی ہو۔“ ذکا خان
حیران ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی شرارت بتا
رہی تھی کہ یہ حیرانی مصنوعی ہے۔

اس کا موز خوش گوار تھا اور مہروں کے موڈ کس
وقت خوش گوار ہوتے ہیں۔ روشا نے جان چکی تھی۔
وہ اس گھر کے ہر فرد کو اچھی طرح سے جان چکی تھی۔
میر ذکا خان ذات کے غرور اور زعم میں مبتلا تھا۔
اورنگ زیب خان کو جاگیروں اور جائیدادوں کو
وسیع کرنے کا جذبہ تھا۔ اسی وجہ سے روشا نے یہاں
موجود تھی۔

بھجت بیگم کو دو سروں پر فضلے ٹونے اور حکمرانی کی
عادت تھی۔ عشق النساء کو بیٹیاں دیکھ کر ہول
اٹھتے تھے۔ وہ ان کی شادیوں اور بروہتی عمر کی وجہ سے
پریشان تھیں۔ بانی چاروں ممانیوں کی اپنی مصروفیات
تھیں۔ نمازیں پڑھنا۔ وظیفہ کرنا اور سلائی کڑھائی
کرنا۔ وہ دنیا سے اور دنیا کے جھمیلوں سے الگ ہو گئی
تھیں۔

پھر مہرا فزوں تھیں۔ خاموش، غمگین، تالبدار۔
عشق النساء کی بیٹیاں تھیں۔ ہر وقت شعلے اٹھتی
رہتیں۔ کبھی شبنم کی طرح برسنے لگتیں۔ گل افشاں
بھی پیشین سے اوپر کی ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھوں

میں ناکام خواہشوں کے نوکیلے کانچ چمکتے رہتے تھے۔
عشق النساء کو یہ غم تھا کہ گھر کا ایک لڑکا روشی کو لے آیا
ہے۔ دوسرے سے بھی کوئی امید نہیں تھی۔
انہوں نے اچھے رشتوں کے انتظار میں بیٹیوں کو ایب
نارمل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اور روشی کو لگتا تھا کہ وہ اتنے ایب نارمل لوگوں میں
کیسے نارمل رہ سکے گی۔ وہ شانی جتنی حیاں نہیں تھی
مگر وہ ان دنوں حد درجہ حساس ہو رہی تھی۔ شاید اس
لیے کہ وہ خود ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔
ایک ماں کے درد کو جاننا اب اس کے لیے مشکل نہیں
تھا۔ اسے مہرا فزوں اور عشق النساء کی آنکھوں کا درد
بے چین کر رکھا تھا۔

اگر اس کے ہاں بیٹی ہوئی تو کیا وہ بھی اتنی ہی بے بس
اور مجبور ہوگی۔ وہ شدت سے دعا کرتی تھی کہ اس کے
ہاں بیٹی نہ ہو۔

پورے آٹھ ماہ ہو گئے تھے مگر وہ ایک مرتبہ بھی
”ازبک ہاؤس“ جا نہیں سکی تھی۔ اسے جانے ہی
نہیں دیا گیا تھا۔ پھر ایک دن شانی کا فون آیا۔ وہ اس
وقت میر ذکا کے کمرے میں تھی۔ شانی کی آواز سن کر
وہ جج اٹھی۔

”کہاں ہو تم؟ تمہاری شادی کی تھی۔ بیچا نہیں
تھا۔“ جو اب شانی بھی کافی غصے سے بولی۔
”میں نے اتنی مرتبہ فون کیا مگر کوئی ریسیو نہیں
کرتا۔ جب بھی ذکا بھائی آتے ہیں۔ اتنا اصرار کرتی
ہوں کہ جنہیں بھی لے کر آئیں مگر بھال ہے جو انہوں
نے وعدہ ایفا کیا ہو۔“

”ذکا خان وہاں جاتے ہیں؟“ وہ حیران سی بولی۔
”تو اور کیا۔ کئی مرتبہ آئے ہیں۔ ویسے گل بخت کو
بتا رہے تھے کہ تمہیں ڈیپوری کے لیے اوھر چھوڑ کر
جاؤں گے۔ کب تک آؤ گی؟“
”پتا نہیں۔“ وہ تو حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ نہ جانے
اس بندے کے کتنے رنگ تھے۔

”روشی! سن رہی ہو۔“ شانی گھبرا کر بولی۔
”ہاں سن رہی ہوں۔“ اس نے گہرا سانس خارج
کیا۔

”وہ افیقن چلی گئی ہے۔“ شانی نے بتایا۔
”کیوں؟“ آج تو حیران ہونے کا دن تھا۔
”پتا نہیں۔ یہ تو کیا معلوم ہوگا۔ وادی نے اس
کے خلاف مجاہدوں رکھا تھا۔ شاید وہ اسی لیے دلیرانہ
ہو کر چلی گئی ہے۔“ شانی نے لا پرواہی سے بتایا۔
”اور اس کی بیٹی؟“

”میں ہے۔ اس کے لیے گورنس کا انتظام ہو چکا
ہے۔ اس کا نام علیز ہے رکھا گیا ہے اور وہ پتا ہے کیسی
ہے؟“
”کیسی ہے؟“ روشی نے حیرت سے کہا۔
”ڈولن جیسی۔“

”تو اپنی ماں پر ہی ہے نا!“ روشی ہنس پڑی۔
”وادی کو برا غم تھا۔ انہوں نے بڑی کوشش کی تھی
کہ ڈولن علیز کے کو لے جائے مگر کیا کو یہ گوارا نہیں
تھا۔“ مشافقات اسے حیران کر رہے تھے۔
”تیا جی بیمار ہیں۔“ اب اس نے ماحوت خان کی
بیماری کے متعلق بتایا۔ وہ ایک دم ہی سب سے ملنے کو
بے قرار ہو گئی تھی۔ تیا جی پاپا وادی دادا۔ گل بخت
اشمر اور اشان۔ اس کی بیماری۔ بن علیز۔
”مئی کا فون آتا ہے؟“ روشی نے پوچھا۔
”نہیں۔ اور اب وہ ہماری ممی نہیں ہیں۔“ شانی
نے کافی کھیلے لہجے میں کہا تھا۔ اور روشی اس کی آواز
سن کر کس قدر مسرور تھی۔ کوئی اس کے دل سے
پوچھتا۔

میر ذکا نے اسے ایبٹ آباد جانے کا شدید سنا کر
خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ خوش تھی اور اس
کی ساری ننڈیں اداس۔

”ازبک ہاؤس“ ڈیبا ہی تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گئی
تھی۔ ہاں وہ خوب دل چکی تھی۔ اب وہ خواب بھی دیکھنے

لگی تھی۔ سنہری خوشنما خواب اپنے ہونے والے
بچے کے متعلق۔ شانی اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔
”کتنی مونی اور خوب صورت ہو رہی ہو روشی!“
”کہاں اتنی عجیب تو لگتی ہوں۔“ وہ شربانی شربانی
سی بولی۔ گل بخت اس کی بہت خاطر تواضع کر رہی
تھی۔ اشمر اور اشان کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ کتنے
بڑے ہو گئے تھے۔ احمد صاحب نے اسے دیکھ کر خوش
کا اظہار کیا تھا۔ اس کا حال انوار پوچھا۔

وہ علیز کے کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ واقعی
ڈولن جیسی تھی۔ سیاہ رنگت، چھٹی سی ناک، سفید
بے بی بیڈر لٹھی وہ اور بھی کالی لگ رہی تھی مگر جب وہ روشی
کو دیکھ کر مسکرائی تو روشی کو اس پر ٹوٹ کے ہار آگیا۔
اس نے بے اختیار علیز کے گود میں اٹھا کر گدگدایا۔
احمد صاحب نے علیز کے کو بھی ایک نظر دیکھا
تک نہیں تھا۔ روشی اور شانی کا احوال تو وہ پوچھ ہی لیتے
تھے۔ جب وہ دونوں چھوٹی تھیں تب بلیا انہیں بلا کر پیار
بھی کر لیتے تھے۔ باہر سے آتے تو ان کے لیے ڈھیروں
کھانوں لاتے۔ کبھی بھی اسکول بھی ملے جاتے۔

مگر علیز کے بے چاری کیسی بد قسمت تھی جسے
باپ نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ جو اسے دنیا میں
لانے کا سب سے بڑا بھائی تھے اب ایسے ہی بے خبر تھے گویا کوئی
علیز نے ان کی بیٹی تھی ہی نہیں۔ وہ گورنس کے رحم و
کرم پر تھی۔ البتہ گل بخت بچی کی عمر لگاتی تھی۔
اس کی دیکھ بھال کی طرف دھیان دیتی۔ وہ بلاشبہ اچھی
لڑکی تھی۔ اور احمد صاحب بیویوں کے معاملے میں کافی
خوش قسمت تھے۔

وادی، روشی کی آمد سن کر گونجے سے آگئی تھیں۔ وہ
اس کے صدفے واری چارہ تھیں۔ وہ اسے اولاد
نرینہ کی دعائیں دے رہی تھیں۔

”وادی! ایک بات پوچھوں؟“ وادی رات کو اس
کے پاس سوئے کی غرض سے آگئی تھیں۔ وادی کا خیال
تھا روشی کو اس حالت میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔
”پوچھ۔“ اجازت کیوں لیتی ہے۔“ وہ ان دنوں کچھ
زیادہ ہی روشی پر مہربان تھیں۔

”داوی! بہجت بیگم میری سگی ٹائی ہیں؟“
 ”تو اور کیا۔“ داوی چمک کر بولیں۔ ”میں اس نے
 تیرے خلاف حماز تو نہیں کھول لیا۔ اگر ایسی بات ہے
 تو بتانا مجھے۔ کھال اوپر ڈھونڈ لیا۔“ داوی اپنے
 بھاری سرے کے ساتھ جلاہی معلوم ہوتی تھیں۔
 ”داوی! آپ نے میری شادی ذکاء خان سے کیوں
 کی تھی؟“
 ”کیا تو خوش نہیں ہے؟“ داوی الٹا فکر مندی سے
 بولیں۔

”ایسی بات نہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔“ اس
 نے جھنجھلا کر انہیں یقین دلانا چاہا۔ ”میرے سوال کا
 جواب دیں۔“

”تیری ماں مشیرہ کو میں بھونانا نہیں چاہتی تھی۔ ہر
 ماں کی طرح میرا بھی دل کرتا تھا کہ بوجہ چندیے آفتاب
 ہو۔ جس طرح میں مشیرہ کو ناپسند کرتی تھی اسی طرح
 بہجت بھی بیٹی سے خار کھاتی تھی۔ کوئی ماں اپنی اولاد
 سے اور بھی اکلوتی بیٹی سے ایسا سلوک نہیں کر سکتی
 تھی مگر بہجت اسے بہت مارا کرتی تھی۔ ہر وقت اسے
 بد صورتی کے طعنے دیتی۔ مشیرہ سے کہتی کہ تو باپ کی
 دلہنیز بوڑھی ہو جائے گی مگر مجھے کوئی پتا نہیں
 آئے گا۔ ایسے حالات دیکھ کر مشیرہ نفسیاتی مریضہ بنی
 جا رہی تھی۔“

پھر ایک دن بہجت نے مشیرہ کو بہت مارا۔ صرف
 اس وجہ سے کہ اس کا بھانجا کسی طوا کف کو بیاہ لایا تھا۔
 اس کا خیال تھا کہ وہ مشیرہ کو اپنے بھانجے کے لیے باندھ
 دے گی۔ اسی رات مشیرہ اپنی ملازمہ کے ساتھ گھر سے
 بھاگ گئی۔ وہ سیدھی اپنے بابا کے گھر یعنی ہمارے
 پاس آئی تھی۔ بہجت بیگم کو خبر ہوئی تو اس نے اس
 بات کو انا اور اپنی ضد بنالیا۔ اس نے بیٹی کی شکل نہ
 دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ بدنامی ہو جوتی وہ تو الگ بات
 تھی۔ تمہارے دادا نے زبردستی احمد کا نکاح پرہا دیا
 تھا۔ پھر تم دونوں ہو گئیں۔ ایک رات مشیرہ سوئی تو پھر
 اٹھ ہی نہ سکی۔ بہجت بیگم نے ہم پر الزام لگایا کہ اس
 کی بیٹی کو قتل کیا گیا ہے۔“

داوی کے انکشاف نے اسے سن کر دیا تھا۔ یہ کیسے
 رشتے تھے کیسے لوگ تھے؟
 ”مگر ذکاء خان تو کہتا ہے کہ ماما کو پاپا نے قتل کیا
 ہے۔“
 ”غلط کہتا ہے۔ اور یہ سارا خناس بھی بہجت نے
 اس کے دماغ میں بھرا ہو گا۔ بڑی چال باز عورت ہے۔
 خرائٹ اور منکار۔ مگر وہ عورت نہیں پتھر ہے۔ تب ہی
 تو نفسیاتی مریضہ بن چکی ہے۔“ داوی نے تنفر سے
 کہا۔

”آپ نے ایسے لوگوں میں میری شادی کیوں کی؟“
 وہ شکوہ کتنا ہوئی۔

”یہ فیصلہ فیملی والوں کا تھا۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکا اٹھی۔

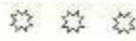
”مشیرہ کے مرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس
 وقت ذکاء کے دادا کی بڑی بات تھی۔ مشیرہ کے بھاگ
 آنے کے بعد ورائی فیملی والوں کے ساتھ سب کی
 ہمدردیاں تھیں۔ سو یہ فیصلہ ہوا کہ احمد خان نے ان کی
 بیٹی کو ورغلائیا ہے سو اسے بدلے میں بیٹی ضرور دینی
 ہوگی۔“

”ہوں۔“ روشی نے بیکار پھر۔ ”تب ہی تو اس کی
 حیثیت وہاں کھولنے سکے گئی تھی۔“

ولیمہ کی دوسری شب اگرچہ میر ذکاء نے اپنے گزشتہ
 رویے کی روشی سے معذرت کی تھی۔ شاید وہ اس کے
 حسن جہاں سوز اور معصومیت کے سامنے سرنگوں
 ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی پھوپھی کے متعلق
 کوئی بات نہیں کی تھی۔ روشی نے پوچھا تو وہ لا پرواہی
 سے بولا تھا۔

”انیس سال پہلے جو کچھ ہوا اس سے ہمارا کیا تعلق
 ہے۔ پھر جس نے جو پوچھا وہ ہی کاٹا ہے۔ اس قصے پر گرد
 پڑ چکی ہے اور محض بوکس کمانی ہے۔ یہ سب جھوٹی
 داستانیں ہیں۔ بی جانیں غلط کہتی ہیں۔“

اپنے دھیان میں مگن اس نے اعتراف کر لیا تھا کہ
 بہجت بیگم نے ہی اسے پرانے قصے سنانا کر آگ بگولا
 کیا تھا۔



اسی شام روشی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ
 اپنی بیٹی کو دیکھ کر آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی مگر نہ
 جانے کیوں اس کا دل کس گہری کھائی میں گر رہا
 تھا۔ گل بخت بہت خوش تھی۔ اور اس کے لیے اولاد
 نرینہ کی دعائیں مانگتی، داوی بھی خوش تھیں۔

”بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں۔ دل چھوٹا رحمت کرو۔
 اگلی بار سہی۔“ داوی کے دلاسوں سے وہ بہل گئی تھی۔
 گل بخت نے دھڑول مٹھائی تقسیم کی تھی۔ خیرات کی
 تھی اور گاؤں سے مراغروں، میر ذکاء کے ساتھ آئی
 تھیں۔ روشی نے دیکھا ان کی آنکھیں نم تھیں۔ اور
 انہوں نے گلابی کبیل میں لپیٹ پی کو سینے سے لگا کر کہا۔
 ”مولا! ایک اور بد قسمت بیٹی کو ان پرہاڑی لوگوں
 کے گھر میں بیچ دیا ہے۔“

ذکاء خان کچھ دیر کے لیے رکا تھا پھر چلا گیا۔ البتہ ماما
 اس کے پاس رک گئی تھیں۔ وہ روشی سے خفا اور
 مامی کی طرح چار کرتی تھیں۔ جب وہ اپنی بیٹی کے ہمراہ
 گاؤں جا رہی تھی تب بہت اداس تھی۔ اسے لگ رہا
 تھا کہ اس کی بیٹی جب بھی خفا اور مامی کے برابر کھڑی
 ہونے والی ہے۔



ذکاء خان نے جب کہ آمد پر روشی کا اظہار کیا تھا نہ غم
 کا۔ وہ ان دنوں بس روشی کے وجود میں کھویا ہوا تھا۔ وہ
 ماں بننے کے بعد اور بھی خوب صورت ہو گئی تھی۔ کئی
 مرتبہ روشی نے ذکاء خان سے خلوت کے لمحات میں
 پوچھا تھا

”آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟“
 ”محبت۔“ ذکاء خان نے گویا ہنسی اڑائی تھی۔

”محبت کیا ہوتی ہے؟“ وہ الٹا اس سے پوچھ رہا تھا اور
 روشی کے سینے میں ایک چھتا کے سے کچھ ٹوٹ گیا۔

اور زری خان کہتا تھا۔ اس آدمی کے سامنے جھکنا
 مت۔ وہ اسے کیا بتاتی عورت معتبر مرد کی محبت اور
 اعتماد سے ہوتی ہے۔

زری خان اسے اپنے بھائی کی سرگرمیوں کے
 بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

ذکاء خان کی خواب گاہ اب بھی الگ تھی۔ حسب
 ضرورت اسے بلوایا جاتا تھا۔ یہاں پر مردوں اور
 عورتوں کے الگ الگ بستر رومز کاروبار تھا۔ جب بھی وہ
 میر ذکاء خان کے کمرے کی طرف جانے لگتی تو گویا وائس
 من من بھر کے ہو جاتے تھے۔

جب ابھی صرف دو ماہ کی تھی جب وہ پھر سے حاملہ
 ہو گئی۔ ماما بہت خوش تھیں۔ چاروں ممانوں نے بھی
 مبارک باد دی تھی۔ وہ ان کی مبارک بادیں وصول
 کرتی جھینپ رہی تھی۔

”بھلا ابھی سے مبارک کا یہ سلسلہ کیوں؟“ وہ
 حیران تھی۔ ماما اس کی حیرت دور کی۔

”ہمارے خاندان میں زیادہ عورتیں بھانجھ ہیں۔
 صاحب اولاد ہونا بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔ تم دعا کیا
 کرو اللہ صحت مند اولاد سے نوازے۔ عورت بال
 بچوں کے ساتھ بھری بھری اور آباد رہتی ہے۔“

”چاہے اندر سے ٹوٹی پھوٹی اور ریزہ ریزہ کیوں نہ
 ہو۔“ زری خان نے اسے بتایا تحارات کو میر ذکاء پھر
 سے کسی چاہنے والی کے ہمراہ تھا۔

روشی اس سے نفرت کرنا چاہتی تھی مگر اس کے کسی
 گوشے میں اس سے محبت بھی تھی۔



جبلی اپنے گیارہ ماہ کے بچے کو اٹھائے تیز تیز چل
 رہی تھی۔ موسم کے تیز بہت خطرناک تھے۔ اور وہ
 پارش برنس سے پہلے پہلے اپنے فلیٹ میں پہنچنا چاہتی
 تھی۔

اس کا بچہ ایک معمولی سے کلینک میں پیدا ہوا تھا۔
 ماما نے بچے کو فیضان کا نام دیا تھا۔ اب وہ ان دنوں
 کے لیے فیٹی تھا۔

جبلی ان دنوں پھر سے فارغ تھی۔ اور کام کی تلاش
 میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ آج وہ بچے کو ڈاکٹر سے
 چیک آپ کروانے لائی تھی۔ فیٹی شاید دانت نکال رہا

تھا۔ وہ بہت چڑچڑا اور بد مزاج ہو رہا تھا۔

روڈ کراس کرتے ہوئے یکدم اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ روڈ تک پھسلتی چلی گئی۔ اسی اثنا میں ایک گاڑی کے بونٹ سے اس کا سر ٹکرایا تھا۔ فنی اچھل کر فٹ پاتھ پر جا گر اور جیلی کا ذہن تاریکی میں گم ہو گیا تھا۔ وہی اس افتاد پر بوٹھا کر گاڑی سے باہر نکلا تھا۔ وہ ان دنوں جس ذہنی ٹوڑ پھوڑ کا شکار تھا۔ اس سے کسی بھی حادثے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

لمحے کے ہزاروں حصے میں اس نے جیلی اور اس کے بچے کو گاڑی میں اٹھا کر ڈالا اور دوسرے ہی پل تیز رفتاری سے گاڑی اڑاتا اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ اس کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ سو وہ با آسانی جیلی اور بچے کو اٹھا کر اندر لے آیا تھا۔

جیلی کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا جبکہ بچے نے پورے راستے حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور رونے کا فریضہ بہ خوبی نبھایا تھا۔ وہی نے پہلے بچے کا بغور جائزہ لیا تھا کہ شاید اسے چوٹ لگی ہو مگر بچہ خوف کی وجہ سے رو رہا تھا۔ جیلی کے مینڈج کے دوران بھی بچہ مسلسل روتا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہی قریبی اسٹور سے فیڈل خرید لیا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے دودھ ڈال کر فیڈر بچے کے منہ میں ٹھونسای تھا کہ بچہ پرسکون ہو کر دودھ پینے لگا۔ گویا وہ تکلیف سے نہیں بلکہ بھوک کی وجہ سے بلبل رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بچہ گہری نیند سو گیا تھا۔

پھر اس نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر جیلی کو انجکشن لگانے کے بعد دوائیوں کا نسخہ لکھ کر دے گیا تھا۔

جیلی ہوش میں آنے کے بعد وہی کو سامنے پا کر ششدر رہ گئی تھی۔ وہی نے مختصراً اسے اس حادثے کے متعلق بتایا تھا۔

پھر وہ اسے اپنی گاڑی میں گھر تک چھوڑ کر آیا۔ راستے میں ایک اسٹور سے اس نے بہت سے جوس کے ڈبے، دودھ، بسکٹ، جیم، جیلی اور بھتی کے چار خریدے، بچے کی ضرورت کی دیگر چیزیں بھی تھیں اور جیلی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

راستے میں وہی نے جیلی سے پوچھا۔

”جواب مل گئی ہے تمہیں؟“ وہ محض اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“

”کیا کرتی ہو اب؟“ وہ سر جھٹکتے ہوئے کہنے لگا۔

”گویا کسی تکلیف سے سوچ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔“

”فارغ ہوں۔“ جیلی مختصر بولی۔

”بچے کا خرچ کہاں سے پورا کرتی ہو؟“

”میں نے اپنے علاقے میں سوپر کی جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ اپنا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔

”انتانتا کا کام۔“

”تو کیا کروں۔ کہاں سے اخراجات پورے کروں؟“

”مئی کی دوا میں بچے کے لیے دودھ اور فلیٹ کا کرایہ۔“

جیلی گویا پھٹ پڑی۔

”اس سے بہتر کوئی کام نہیں؟“

”کسی گورنر کے گھر میں میڈ کی جاب مل سکتی ہے۔“

مگر اس کے لیے بھی سفارش کی ضرورت ہوگی۔“ وہ سختی سے کہنے لگی۔

”گو گورنر تو نہیں میں ایک معمولی سا آرکیٹیکٹ ہوں۔ تم میرے ہاں کام کر سکتی ہو مگر ٹانگہ میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ تم چاہو تو بچے کو ساتھ لے کر آ سکتی ہو۔“

وہ اپنے فلیٹ کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی، جب وہی نے اپنی بات مکمل کر کے بغیر جواب سے پلٹ کر گاڑی اشارت کر لی تھی۔ جبکہ جیلی کو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ وہ خوشی سے چلاتے ہوئے مئی می یکاری اندر داخل ہوئی۔ مئی کو اس نے فرش پر اتار دیا تھا اور خود وہاں کے قریب چلی آئی۔

”کیا ہوا ہے؟ کیوں چلا رہی ہو۔“ مئی کی نیند ڈسرب ہو چکی تھی۔

”مئی! مجھے کام مل گیا۔“ وہ خوشی سے چکی۔

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دوسرے دن پھر سے فارغ بیٹھی ہوگی۔“ مئی نے گویا مذاق اڑایا۔

”اب ایسا نہیں ہوگا۔“

”کیوں یو این میں کام مل گیا ہے۔“ مئی کا لہجہ استغاثہ تھا۔

”مئی کی نظریں اب بڑے بڑے لفافوں پر تھیں۔

”یہ کہاں سے لائی ہو؟“ مئی کا تجسس عروج پر تھا۔

”وہی لے کر دیا ہے۔“

”او۔ وہی نے۔“ مئی کی ناچھیں کھل اٹھیں تھیں۔

”جیلی! کہاں کھو گئی ہو؟ کیا اس پاکستانی کو سوچ رہی ہو؟ بڑے ایک بات کموں، یہ پائی سارے بڑے ہی کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے ہیں۔ وہ پہلے والا بھی بڑے کھلے دل کا مالک تھا اور اب یہ وہی۔“ مئی اب بسکٹ کا پیکٹ کھول کر مزے سے کھانے لگی۔

”یہ سب سے مختلف ہے۔“ وہ کھوٹی کھوٹی سی بولی۔

”اچھا ہے، واقعی اچھا ہے۔ تم اس کے بارے میں ضرور سوچو۔“ مئی سرد دھن رہی تھی۔ جیلی ماں کی بات کو سمجھتی جلتی کلستی اٹھ گئی۔

دوسرے دن وہی کے بتائے وقت کے مطابق آگئی تھی۔ فنی کو اس نے مئی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ وہی نے اسے کام بتا دیا جو کہ جیلی کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا۔ جیلی نے محسوس کیا تھا وہی بہت الجھا الجھا اور اداس ہے۔ اس کی آنکھیں رنجشوں کے سرخی لیے ہوتی تھیں۔ تو کیا اس کا حسن رات بھر روتا ہے؟

جیلی اس کی شکایتی اور اچھا سا درد اپنے دل میں محسوس کرنے لگی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔ اور وہی کی موجودگی میں ہی کھڑا آ جاتی تھی۔ وہی اس سے زیادہ مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہتا تھا۔ ایک دن کچھ ڈرتے ڈرتے جیلی نے پوچھ ہی لیا۔

”تم کب جاؤ گے اپنے وطن؟“

”شاید کبھی نہیں۔“ وہی نے چونک کر جواب دیا تھا۔ اس کے لمحے میں کون سے دکھ بول رہے تھے جیلی سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”کبھی بھی نہیں؟“ جیلی نے نہ جانے کون سی یقین دہانی چاہی تھی۔

”ہاں، کبھی نہیں۔ تم فکر مت کرو۔“ وہ شاید مسکرایا تھا۔ کسی زخمی سی مسکراہٹ تھی۔ جیلی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

اسے یہاں آتے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے کام سے مطمئن تھی۔ یہاں کسی کی حریفانہ نظروں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ ساری فکریں بھلائے پہلی مرتبہ وہی سکون محسوس کر رہی تھی۔ اور ان ہی دنوں وہی کا بھائی مصیم پاکستان سے آ گیا تھا۔ وہ بھی وہی کی طرح تھا۔ بے حد خاموش اور کسی الجھن میں مبتلا۔ وہ سارا سارا دن اپنی مقامی زبان میں وہی کونہ جانے کیا کیا سمجھا رہا تھا تھا۔

مصیم پورے تین ہفتے رہا تھا۔ اس دوران جیلی کو دینا کام کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ وہی کے لیے کھانا بھی بناتی تھی۔ وہ بہت اچھی کوکنگ کرتی تھی۔ وہی کو اس کی کوکنگ پسند تھی۔ اور اس کا بھائی مصیم بھی کھانے کی تعریف کرتا تھا۔ اور اکثر اس کے نام کے حوالے سے چھیڑتا۔

”تمہارا نام لیتے ہوئے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔“ وہی کے گھورنے پر بھی وہ باز نہیں آتا تھا۔

”کیوں؟“

”میں محسوس ہوتا ہے کہ اسٹرییری، چیری یا بنانا جیلی کا نام لیا گیا ہے اور اب میں اسے ٹرانزل کے ساتھ کھانے والا ہوں۔“

مصیم مزے سے کہتا تو جیلی ہنس پڑتی۔ وہ بہت فریڈلی نیچر کا تھا۔ اس لیے اس نے جلد ہی جیلی کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔ وہی آفس چلا جاتا تھا اور جانے سے پہلے ڈھیروں آفس درک صائی کے حوالے کر جاتا۔ اس کے جانے کے بعد صائی جلتا کلستافا مکوں میں سرکھپانے لگتا۔

ان ہی دنوں جیلی موسمی بخار نے گھیر لیا تھا۔ وہ بغیر بتائے تین دن کام پر نہیں آسکی تھی۔ چوتھے دن وہ شرمندہ شرمندہ سی وہی کے سامنے تھی۔

”تم اتنے دن کہاں غائب رہی ہو؟“

”مجھے فور تھا۔“

”اب ٹھیک ہو؟“

”ہاں سے بہتر ہوں۔“ وہ لاؤنج میں بکھرا پھیلاوا سینے لگی۔

”تمہارا بچہ بھی ٹھیک ہے؟“

”ہوں۔“

”کس کے پاس جھوڑ آتی ہو؟“

”مئی کے پاس؟“

وہی کے فکسل سوالوں پر وہ حیران ہو رہی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ اس سے اتنی طویل گفتگو کر رہا تھا۔

”تم اسے ساتھ لے آیا کرو۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔ وہ فطرتاً ”نرم مزاج تھا۔“

”وہ اب چلنے لگا ہے۔ ہر چیز کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”یہ تجس کی عمر ہے۔ وہ دیکھنے اور سمجھنے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اسے باہر لے کر آیا کرو۔“

ایک جگہ قید رکھو تو بچے پر ہمدردی ہو جائے گی۔ وہ ہنگامے اور شور سے گھبرائے گا۔ اسے نفرت کے لیے پارک لے جایا کرو۔ تاکہ اسے ہم عمر بچوں کو دیکھ کر اسے زندگی کا احساس ہو۔“ وہ غلطی پر اثر گفتگو کرتا تھا۔

کتنا نرم اس کا لہجہ تھا۔ کتنی خوب صورت آواز تھی۔

”تم اسے کھلی چھوٹ دے کر کہاں چلی گئی ہو بھرجانی؟“ زری خان کی آواز میں افسردگی تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھٹکاتا جا رہا تھا۔ اور روشنی جانتی تھی کہ ایسے کون کون سے صدمے لاحق تھے۔ کس کس کا دکھ اسے اندر سے کھوکھلا کر رہا تھا۔ باپ کی لاپرواہی، ماں کی۔

بے بسی بہنوں کے غم، اور اب اس بھرجانی کی زندگی کے اندھیرے۔

اسی شام روشنی نے اپنے دوسرے بچے کو جنم دیا تھا۔ ممائی، دادی اور اس کی اپنی پچھلے پسر میں مانگی گئی دعائیں قبولیت کا درجہ پائی تھیں۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا

تھا۔ سرخ و سفید گول گوتھنا سا بچہ جس کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ صحت مند اور خوب صورت۔

گاؤں سے گاڑی بھر کر تئی تھی۔ اتنے دھیر سارے فروٹس، مٹھائی کے ٹوکڑوں سمیت۔ ”مما“ ساری مہانیاں، گل زینا، گل مالا، گیتی بھی خرید کر کے آگئی تھی۔ جب اپنی دادی کی گود میں چڑھی تھی۔ بچہ باری باری سب کی گود میں منتقل ہو رہا تھا۔

روشنی کو گیتی نے بتایا تھا کہ ذکاء خان بہت خوش ہے۔ بیٹے کی خوشی میں تین دن تک فائرنگ ہوتی رہی تھی۔ دعوتیں ہو رہی تھیں۔ کیٹ ہاؤس مہمانوں سے بھر رہا تھا۔

احمد صاحب بھی بہت خوش تھے۔ انہوں نے بچے کی شاپنگ کے لیے روشنی کو خطیر رقم کا چیک دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو اس گھٹے گھٹے ماحول میں ہر آسائش فراہم کرنا چاہتی تھی۔ انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے خواب زندگی میں کچھ نئے پن کا احساس دلا رہے تھے۔ نئے جذبے اور امنگ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی جو جمود کا شکار ہوتی جا رہی تھی اب یہ جمود ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ بچوں کے لیے جینا چاہتی تھی۔

یہاں کو نہ جانے کیسے اس کی خواہشات کی خبر ہو گئی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لیے گاڑی بھر کر سامان بھجوا دیا تھا۔ اور روشنی نے سارا سامان اپنے کمرے میں سیٹ کر لیا تھا۔

مگر وہ اپنے اس بچے جہالت کے کمرے میں ایک رات بھی نہیں سو پائی تھی۔ بچوں کو آیا کے حوالے کر کے اسے روزانہ ہی میز ذکاء کی بات سننے جانا پڑتا تھا۔ بات کا تو صرف بہانہ ہوا کرتا تھا۔ اسے میز ذکاء کا دل بھلانے کے لیے ہی تو لایا گیا تھا۔ ورنہ روشنائی خان کا یہاں آنے کا مقصد ہی کیا تھا؟ اور پھر کچھ ہی میزینوں بعد وہ میر ذکاء حیات خان کے تیسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

زری خان نہ جانے کہاں گیا تھا۔ اس نے جیتھے کو

دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو ایک اور بچہ روشنی کی گود میں تھا۔ وہ ننان کو بغیر دیکھے بولا۔

”تم بھی ان عورتوں جیسی ہوئی جا رہی ہو۔ میں سوچ رہا تھا تم کوئی انقلاب لاؤ گی، مگر تم بھی...“ وہ لب جھپٹے خاموش رہ گیا۔

”کیسا انقلاب لا سکتی ہوں۔ میرے اختیار کی حدیں کیا ہیں۔“ وہ سلگ کر بولی۔

”کیا کرے گا یہ سردار میر ذکاء؟ طلاق وہ تمہیں کبھی نہیں دے گا۔ ورنہ سرداری سے ہاتھ دھونے پر نہیں گے اور یہ جاہ جلال، یہ رعب و دبدبہ، یہ حشمت اور عزت چھین جائے یہ سردار صاحب کو گوارا نہیں۔“

ہمارے ہاں خاندانی عورت کو کبھی طلاق نہیں دی جاتی۔ پھر تمہیں کیا خوف ہے؟“

آج نہ جانے کیوں وہ اس قدر تپ رہا تھا۔

”یہاں کے زنداں سے نکل کر جاؤں گی کہاں؟ اور میرے یہ بچے؟ سب سے بڑی بات تمہاری ”مما“ بابا جان کو کیوں نہیں چھوڑ کر گئیں۔ کیا میں نہیں جانتی اس عورت کے دل پر کیسے کیسے عذاب اترے ہیں۔“

مختلف ادوار میں۔ تم چاہتے ہو بیٹے والوں کی ملامت میرے باپ کی جھولی میں آ پڑے۔ اور میرا آن بان والا باپ جو غور سے سرتانے چلتا ہے اس کے کندھے جھک جائیں۔“ وہ سسکا اٹھی۔

”ان زمینوں کو توڑ کیوں نہیں دیتیں۔ کسی ایک کو تو بلا قدم اٹھانا چاہیے۔“

”بھلاؤ۔“ تو کیا بغاوت کروں۔ میری ماں کے گھر سے بھاگ جانے کو ابھی تک معاف نہیں کیا گیا۔ کیا وہ کسی مرد کے ساتھ بھاگی تھی؟ وہ تو اپنی سگی ماں کے ظلم و ستم کی آخری حد دیکھ کر زندگی بچانے کی غرض سے اپنے سگے تایا کے گھر پناہ لینے گئی تھی اور اس پر اور کسی نے نہیں اس کے سگے رشتہوں نے الزام اور بہتان لگائے تھے۔ تو کیا روشنائی خان کو معاف کر دیا جائے گا؟“ وہ اذیت سے لب کچل کر بولی۔ ”میرا باپ جس کی معاشرے میں عزت ہے، وہ مطلقہ بیٹی کا باپ کہلائے گا۔“

”مگر ایسی باتیں سوچو گی تو فیصلہ نہیں کر پاؤ گی۔“

”اور میں کب کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ تھک کر بولی۔ اور زری خان نہ جانے کیوں بے حد غصے میں چلا گیا تھا۔

”گل زینا، گل مالا، گیتی اور گل افشاں جن کی عمر عزیز کے قیمتی سال ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل رہے ہیں۔ اور تمہاری پیاری بہنیں جو آجھے پکڑوں اور اچھی چیزوں کے لیے ترستی ہیں۔ جنہیں بی جاں ہار سکھار تو دور کی بات منہ دی تک لگانے نہیں دیتیں۔“

جنہیں روشنی کا گھر اور شہر دیکھنے کا شوق ہے۔ جنہوں نے آج تک کسی گاڑی میں سفر نہیں کیا۔ جنہیں اپنی زمینوں تک جانے کی اجازت نہیں۔ میں جب کے لیے اور تمہاری ان معصوم بہنوں کے لیے زندگی کے دروازے اور بند کروں؟ میرا ایک بھی انتہائی قدم ان سرداروں کی سوئی و حشائن جس کو بیدار کر دے گا اور جس کا سارا عذاب تمہاری بہنوں اور میری بیٹی کے دل پر اترے گا۔“

اور یہ صرف میر ذکاء، ورائی کی بات نہیں۔ میرا بابا بھی تو اسی کینچڑی میں آتا ہے۔“ وہ ڈولن کے پارے میں سوچ رہی تھی۔ اس میں کون سی ایسی خولی تھی جسے دیکھ کر اچھ صاحب یہ ہوئے تھے اور جو گل بخت میں نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ ذہین، بہت تھی، شاید اس کی ذہانت نے لایا کو اسیر کیا تھا۔

روشنی کو ڈولن کے آنے اور واپس چلے جانے پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ مگر اب وہ ایک عورت اور یہاں ہونے کے ناطے ڈولن کے درد کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ جو ایک اور روشنائی کو اذیت کا ہاؤس چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اگر وہ علیزے کو ساتھ لے جاتی تو علیزے شاید روشنی اور شائلی کی طرح زندان میں قید نہ ہوتی۔ منان اور حنان کے بعد ماں اور ماں کو نور نو تنزید اہوئی تھیں۔ روشنی کو اب خسارے گننے کی بھی فرصت نہیں رہی تھی۔

بی جاں چھتر سال سب پر حکومت کرنے کے بعد

اب خاموش ہو چکی تھیں۔ فالج کے ایک نے ان کی تمام ہمتوں کو گویا چوس لیا تھا۔ سات بچوں کے ساتھ روشانے خود کو سوچتی اور حیران ہو جاتی۔ کیا یہ وہی روشانے تھی کتبوں کی دیوانی، اسپورٹس کی شوقین۔ پرندوں اور جانوروں کے متعلق دھواں دھار بولنے والی۔

اور وہی بھائی، صائی بھائی اتنے سالوں میں کہاں تھے؟ شانی بتاتی تھی کہ وہی بھائی نے اس کی شادی کے بعد سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

”کیا وہ جج میرے اسیر تھے؟“ وہ حیران ہو کر سوچتی۔

میرزا کے وہی شب و روز تھے۔ آج سات یا آٹھ مہینے بعد میرزا کے طرف سے بلاوا آیا تھا۔ وہ بچوں کو سلا رہی تھی۔ چاروں بچے میسر پر سوئے تھے۔ جبکہ بچیاں تینوں اس کے برابر بیڑ پر سوئی تھیں۔

بچوں کو اچھی طرح کبل اوڑھا کر باہر نکل آئی۔ اس کا رخ لی جانان کے کمرے کی طرف تھا۔ اب وہ بے دھڑک لی جانان کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ گھنٹوں شانی سے فون پر انگریزی میں بات کرتی۔ بے بسی اور غصے کی وجہ سے لی جانان یقیناً ”پیچ و تاب کھاتی ہوں گی، مگر روشی کو اب کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔

لی جانان بیشک کی طرح جاگ رہی تھیں۔ ساری ساری رات تکلیف کی وجہ سے جاگنا بھی کسی سزا سے کم نہیں تھا۔ ایک نرس ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اب وہ صرف اپنے کمرے تک محدود ہو چکی تھیں۔ اور ان کی گدی عشق النما نے سنبھال لی تھی۔ بیٹیوں کے نہ بیاہے جانے کا سارا غصہ ان لوگوں پر اتارا جاتا تھا جو کہ قطعاً ”بے حد قصور تھے۔

وہ ان ہی سوچوں میں ابھی ابھی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اسے ذکا خان کے ساتھ فیصلہ کن بات کرنی تھی۔ سارے علاقے کے مسائل حل کرنے والوں کے اپنے گھر میں مسکوں اور بریشیوں کے انبار گئے تھے اور انہیں کوئی ہوش نہیں تھا۔

”اس کا فیصلہ جرگہ کرے گا۔ دیکھتے ہیں وہ خبیث کا پتر کہاں تک بھاگتا ہے۔ میں نے اتوار کا دن مقرر کر لیا ہے۔ تم سب کو لے کر وہیں آ جاؤ۔“ اودا اعلیٰ کلمات کے بغیر فون آف کر کے غصے کے ساتھ اچھال دیا گیا تھا۔

”اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟“ اب نہ جانے کس کس کا غصہ اس پر اترنے والا تھا۔

”بچوں کو فیزکروار ہی تھی۔“ روشی نے تحمل سے کہا۔ ”ہست دونوں بعد آئے ہیں۔“

وہ زیادہ گیسٹ ہاؤس میں قیام کرتا تھا۔ سننے میں تو یہ ہی آیا تھا اور اتنے سالوں میں روشی بھی یہ ہی معمول دیکھ رہی تھی اب وہ گیسٹ ہاؤس کے بہانے نہ جانے کہاں کہاں جاتا تھا۔ روشی کو کوئی خبر نہیں تھی۔ ”گھر خانے میں آگ لگ گئی تھی۔ شنگھلا پور کی زمینوں پر مزارعوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا تھا۔ دو خاندانوں کے تین تین بندے قتل ہو چکے تھے۔ اس مسئلے کو غنایت دو مہینوں سے خواہ ہو رہا تھا۔ جرگہ بلاوا گیا۔ پھر فیصلہ ہوا۔ واپس آنے لگا تو ہینگو سے آتے دو اپنے ٹرک اٹنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ کیوں کے دو ٹرک لوڈو تھے۔ اتنا نقصان اوپر سے ڈرائیور بھی ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے گھر والوں کے لیے انتظام کرتے مزید تین چار ہفتے رکنارہ۔“

نہ جانے کس رو میں وہ اپنی مصروفیت کی تفصیل بتانے لگا تھا۔

”دوسروں کے معاملے پٹناتے رہتے۔“ ابھی اپنے گھر کی طرف بھی دھیان دے لیجیے۔

”بات صاف صاف کیا کرو۔ گھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ناگوار سی بولا۔

”صاف اور کھری باتیں بھی آپ کو کھلتی ہیں۔“ ”میں پہلے ہی سخت تھا کا ہوا ہوں۔ فضول بک بک نہ کرو۔ اوجھر آکر سرد ہاؤ۔ درد سے بھٹ رہا ہے۔“ وہ تحکم سے بولا تھا۔ روشی جھکے جھکے قدم اٹھاتی بیڈ پر آگریڈ گئی۔

”بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔“ وہ خاموشی سے اس کا سر

دباری تھی، اس لیے میرزا کے اس کی طویل خاموشی سے اٹک گیا۔

”آپ نے مجھے کیوں بلوایا ہے؟“ ”بیوی کو کیوں بلوایا جاتا ہے؟“ وہ الٹا کچھ نرمی سے پوچھنے لگا۔

”شکر ہے آپ بیوی تو سمجھتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ برا مان گیا۔ پھر اسی طرح ناراض لہجے میں بولا۔ ”بچے تھیک ہیں؟ منان اور مانی کا بخار اتر گیا؟“ وہ اتنا بھی بے خبر نہیں تھا جتنا روشی سمجھتی تھی۔

”آپ نے کبھی ان کو بیمار کیا ہے؟ انہیں دنیا میں لانے کا سبب بنے ہیں تو کیا تھی ان بچوں کی ضروریات، خواہشات کی طرف، دھیان دیا ہے۔“ وہ آج سالوں کا غبار نکال دینا چاہتی تھی۔

”کیا چاہتی ہو؟ کھل کر بتاؤ۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ گھر کا خیال بھی دل میں مت لانا۔“

ساتھ ہی وارننگ بھی دے دی گئی تھی۔ ”نی اٹال تو یہ جانا چاہتی ہوں کہ بچوں کی اسکول جانے کی عمر ہے۔ کیا سوچا ہے آپ نے ان کے بارے میں۔“ وہ بات بدل کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”اس دراز میں سے پرائیکٹس نکال کر لاؤ۔ اسلام آباد اور مری کے اسکولوں کے متعلق تفصیل درج ہے۔“ ذکا خان نے اسے شرمہ جاں فراشنا یا تھا۔

”گفٹوں یا کیڈٹ اسکول میں سے ایک سلیکٹ کرلو۔“

”گفٹوں بہتر رہے گا۔ جب اور منان کے لیے۔“ وہ وفور مسرت سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

”جب کے لیے نہیں صرف منان کے لیے۔“ میرزا کے لہجے میں پتھوں جیسی سختی تھی۔

”مگر کیوں؟“ روشی کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ ”جب اور منان میں کیا فرق ہے؟ صرف یہ ہی کہ جب بچی ہے۔“

”بحث کی ضرورت نہیں۔ منان کا ایڈمیشن کل ہی

ہو جائے گا۔ اب بتی بجاؤ۔“ وہ فیصلہ کرچکا تھا۔ ”مگر حس نہیں پڑھ سکے گی تو پھر مانی اور مہ نور بھی ان پڑھ رہیں گی۔“ وہ میلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی۔

”ہر کوئی تمہارے باپ جیسا بے غیرت نہیں ہوتا۔ لڑکیوں کو جس نے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ گھوڑے دوڑانا، آوارہ گھومنا کالجوں میں بھیجنا اور بیوی کے بھائیوں کے ساتھ ٹھنڈے لگوانا۔“

”ذکا خان! ذرا آپے میں رہ کر بات کریں۔ میرے باپ سے آپ کا خون کا رشتہ ہے۔“

روشانے کے روم روم سے پہنچنے پھوٹ پڑا۔ اتنی تو پہن، اس قدر ذلت، وہ بھڑ بھڑا جانے لگی۔ ”اور آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ اتنے عرصے میں تمہاری مانی صورت، تمہارا رویہ جج جج کرتا رہا ہے۔“ وہ تنفر سے بولا۔

”آپ سے ایسی ہی سلی بیات کی امید تھی مجھے۔ بہر حال میں اس فضول جھگڑے کی نذر بنی کا مستقبل نہیں کر سکتی۔ کل جب کا بھی ایڈمیشن ہو گا۔“

”بھی نہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں۔“ ”کیوں ممکن نہیں۔“ وہ سختی۔

”ہمارے ہاں عورتوں کو پڑھانے کا رواج نہیں۔“ ”یہ رسمیں یہ رواج آپ نے خود بنائے ہیں۔ ان رسومات کو صرف عورت پر ہی لاگو کیا جاتا ہے۔ اسے قید کر کے بنیادی ضروریات سے محروم کر کے، اس کی خواہشات کو دبا کر۔ کوئی ایسا رواج مردوں کے لیے بھی بنا دیتا تھا۔“

”کون سی ایسی خواہشات ہیں جو پوری نہیں کی گئیں۔“ اس کی پیشانی پر سلو میں نمودار ہونے لگیں۔

”بھی گل زبا اور گل مالا کی طرف غور سے دیکھا ہے؟“ وہ کھری کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہنیں ہیں وہ ہماری۔“ وہ جڑ بڑسا ہو گیا۔ ”ان بہنوں کے کوئی حقوق نہیں۔“

”تو کیا کروں میں۔“ میر کو سخت تاؤ آیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا وہ جھانپ کر لگا کر اس کی بوتلی بند کر دے۔
”ان کی شادیاں کر دیں۔“ روشی بڑے اطمینان سے بولی۔

”شادی۔“ وہ حیران ہوا۔ ”اب کیا ممکن ہے؟“
”کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ آج سے سترہ سال پہلے گل زیا کے لیے ڈاکٹر مسز کبیر الدین اپنے بھائی کا رشتہ لالی تھیں۔ آپ لوگوں نے کس بنا پر ڈاکٹر زکریا کو زبیکٹ کیا تھا۔“

”وہ غیر خاندان سے تھا۔“ وہ تلخی سے بولا۔
”تو پھر کسی خاندانی سے کیوں نہیں کیا۔ جاسید اوکی خاطر کہیں انہیں زمینوں میں سے حصہ نہ دیتا پڑ جائے۔“

”جسٹ شٹ آپ روشانے!“ وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ ”مائی کو اپنی بیٹیوں کے معیار کے مطابق جو آدمی چاہیے تھا وہ اس دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ اور تمہیں دوسروں کے غم میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔“
”آئی اپنی مرضی سے بیٹیوں کو نہیں بیاہ رہی تھیں۔ بھانجوں کو زمینوں کا وارث بنانا تھا، ان ہی کے انتظار میں لڑکیوں کو بوڑھا کر دیا ہے۔ اور وہ طواغلوں کو گھر میں بسا چکے تھے۔“

”بہر حال، جب کا ایڈمیشن ہو جانا چاہیے۔“ وہ اسے موضوع سے ہٹو دیکر گریا دہانی کی غرض سے بولی۔
”جاؤ کام کرو اپنا۔“ میر ذکاء کا بھی موڈ بگڑ چکا تھا۔
”آپ کا مزاج بہتر کرنے سے بھی بڑا کوئی کام ہے۔“ اب وہ ہنس رہی تھی۔ اور ہنسنے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی اور شاید ان ہی ہتھیاریوں سے اسے رام کرنا چاہتی تھی۔

اور صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اسے بچوں کے پاس بھانگنے کی جلد نہیں تھی۔ اس نے بہت اطمینان سے غسل کیا تھا۔ اپنا سب سے اچھا ریشمی سوٹ زیب تن کیا۔ ہاف سیلو کی وجہ سے وہ اس سوٹ کو یہاں پہننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی مگر آج گویا اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ آج وہ بہت دل لگا کر تیار ہو رہی

تھی۔ اس نے ہونٹوں پر نیچل سی لپ اسٹک لگا کر لمبے ریشمی بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ بہترین پرفیوم خود پر اسپرے کر کے اس نے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھا اور بچوں کی آیا کو ناشتے کی ہدایت دے کر ذکاء خان کا ناشتہ ٹرائی میں لگا کر ادھر آئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق ذکاء خان چونک گیا تھا۔

”یہ خاص اہتمام کس سلسلے کی کڑی ہے۔“
”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“
”جو تم چاہتی ہو ایسا ممکن نہیں۔“

”تو ایک خاتون یوٹر کا بندوبست کر دیں، جو حبہ کو گھر میں آکر رہا جایا کرے۔“ وہ رات سے ہی سوچ چکی تھی۔ جانتی تھی کہ حبہ کو اسکول بھیجنا کوئی اتنا آسان نہیں۔

”سوچوں گا۔“
”پلیز مان جائیے نا۔“ وہ اصرار سے بولی۔ انداز میں بڑی محبوبیت تھی۔

”خند مت کرو روشانے!“ وہ ناشتے کی طرف متوجہ تھا۔
”آپ کو اپنی سب سے محبوب چیز کا واسطہ۔“

روشی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے بھیک مانگی تھی۔ آج روشانے خان پر یہ بھی وقت آنا تھا۔

”جہنم میں جاؤ تم، اور تمہاری بیٹی۔“
وہ ٹرائی کو زوردار تھوکر مارتا تن قن کر تپا چلا گیا تھا۔
روشی اپنی کم مائیگی کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ صرف مٹی کا ڈھیر ہے۔

منان کا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ وہ زخام کے پاس بورڈنگ چلا گیا۔ زخام اب گھر آنے لگا تھا اور اسے دیکھ کر ماما کھل اٹھتی تھیں۔
اور پھر ایک حیرت انگیز واقعہ یہ ہوا کہ چند دن بعد ایک سانولی سلونی دہلی پتلی سی تک سب سے سچی عورت

آئی۔ وہ حبہ کی بیوہ تھی۔ حبہ کو پھانے آئی تھی۔ جس نے سنا گویا رنگ رہ گیا۔ اور جگ زب خان تک بھی خبر پہنچ چکی تھی۔ اور وہ بھی سخت مشتعل تھے۔
عشق النساء نے سارا گھر سر اٹھا رکھا تھا۔ البتہ پھونکی ممانی نے مبارک باد دی تھی۔

”مہر افروں! شکر اے پڑھو۔ ہمارے مرووں کی سوچ بدل رہی ہے۔“

روشانے اس پہلی کامیابی پر مسرور تھی۔ یہ پہلا قدم مبارک ثابت ہوا تھا۔ حبہ کی بیوہ مس ٹینا سے روشی نے بات کر لی تھی۔ اور پنپان اور پری دخت کے لیے بھی اس نے کورس کی کتابیں منگوائی تھیں۔ اور پنپا بھی پڑھنے کی خواہش مند تھی۔ ان تینوں کو مس ٹینا کے پاس بٹھانے کا روشی نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ حبہ گھبراتی ہے۔ پری پنپان اور پنپانوں کو مس ٹینا سے پڑھتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اور فی الحال راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔
شاید اس لیے کہ میر ذکاء کے حکم کے مطابق مس ٹینا کی آمد ہوئی تھی۔

اور پھر مخالفت اس وجود کی طرف سے ہوئی تھی جس کی طرف سے کم از کم روشی کو امید نہیں تھی۔
زری خان نے ایک طوفان اٹھا دیا تھا۔ وہ جو انقلاب کی باتیں کرتا تھا جاہلوں کی طرح چلاتا رہ گیا۔
”تیری بیٹی کو سرخاب کے پر لگے ہیں۔ یہ پڑھے گی؟ کبھی نہیں، میں اسے پڑھنے نہیں دوں گا۔“ زری خان غضب ناک ہو رہا تھا۔

”تینے بات کرو زری خان! حبہ، میر ذکاء کی بیٹی ہے۔“ ذکاء خان نکل سے بولا۔

”اس عورت سے کہہ دو، آج کے بعد یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“

”بچی کو پڑھانے وہ عورت یہاں آتی رہے گی۔ تم اس معاملے میں مت بولو۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر ایک ذیل کرلو۔ تم نے سرداری

کے اصول توڑے ہیں۔ اس وجہ سے تم اب ہماری اسٹیٹ کے اہل نہیں رہے۔ خاموشی سے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ زری خان سنجیدگی سے بولا۔

”میری بچی اس عورت مس ٹینا سے اب نہیں پڑھے گی۔“ ذکاء خان نے گویا سر تسلیم خم کر لیا تھا۔
روشی کا دل یکدم کمرپی کمرپی ہو اٹھا۔

”تم نے سرداری پر بیٹی کو قربان کر دیا میر ذکاء خان! تم نے اچھا نہیں کیا، وہ زریاب بڑبڑاتی ہوئی کسکتے لگی تھی جب میر ذکاء کی شکلوں کی لپک لیے آواز اس کی سماعتوں سے غلرائی۔

”جب اب اسکول جائے گی۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرے گی میں دیکھتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔“

”ذکاء خان! باز آجاؤ، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔“
”میر ذکاء کسی اور کو دینا۔“ میر ذکاء تن قن کرنا باہر نکل گیا۔

”ذکاء کو بھرجائی! اس قدر انا پرست اور ضدی انسان ہے۔ کس طرح منویا ہے میں نے اس سے۔ اب جب کہ اسکول بھیجنا ہاں پری اور پنپا کو اسکول بھیجنے کی غلطی نہ کرنا۔ ان کے متعلق فیصلوں کا اختیار بابا جان کے پاس ہے۔“

زری خان مسکرا رہا تھا اور روشانے کا دل اس کی عظمت کو سراہ رہا تھا۔ وہ زری خان کی احسان مند تھی۔ اس کی بیٹی اچھے اسکول میں جانے لگی تھی۔ حنان، ریمان اور سبحان کے ایڈمیشن بھی ہو گئے تھے۔ پنپا اور پری کو ابھی تک مس ٹینا پڑھانے آتی تھیں۔

ان ہی دنوں بابا جان نے خنیا اور ماویٰ کے رشتے طے کر دیے۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

روشی نے دیکھا ان دنوں ماما کے آنسو ہر وقت آنکھوں میں ٹھہرے رہتے تھے۔ وہ بہت رنجیدہ تھیں۔ ایک دن روشی کے پوجنے پر کہنے لگیں۔
”بیٹی! بہت پیاری ہوئی ہیں اور ان کے درد مار ڈالتے ہیں۔“ وہ اتنا تو جانتی تھی ماما بہت پریشان ہیں۔

شاید غیا اور ماوی کی متوقع جدائی کے خیال سے نگران کی غم اور دکھ کی وجہ جان کر روشی کا دل دہل گیا تھا۔ یہاں تو قدم قدم پر عذاب تھے۔

نکاح ہو گیا۔ چھوڑے بٹ گئے۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ آج اس کی رچ و بچ ہی نرالی تھی۔ ازبک ہاؤس سے داوی بپا، گل بخت اور شانی آئے تھے۔ گل بخت اور شانی کے اصرار پر اس نے سرخ شیفون کی ساڑھی زیب تن کی تھی۔ یہ ساڑھی شانی اس کے لیے بطور خاص خرید کر لائی تھی اور اس نے تمام خوف بالائے طاق رکھ کر ساڑھی پہن لی تھی۔ آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ آئندہ گواہ تھا۔ اس کی منڈیں ندا ہو رہی تھیں۔ حتیٰ کہ دس بنی ماوی اور غیا بھی بار بار بھر جاتی کو سراہ رہی تھیں۔ مہرا فوں نے اس کی نظر اتاری تھی۔ اور عشق النساء اور گل زیبا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا تھا۔ ان کی آنکھوں میں شعلوں کی سی لپک تھی۔

اور ولیمہ سے اگلے دن روشی کے سر پر گویا ہار ٹوٹ پڑے تھے۔ پورچ میں ایک بی اور بے حد چمکتی گاڑی رکھی تھی۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو گاڑی میں سے ایک بھاری تن توش والا مرد برآمد ہوا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مگر بڑھی تو ند چہرے پر عجیب سی واڑھی اور مقامی لباس کی وجہ سے وہ بہت آجڑ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شکل بھی عام سی تھی۔ اور وہ ماوی جیسی معصوم حسین اور نازک اندام سی گزریا کا شوہر تھا۔ روشی اس کی سوچی سوچی آنکھوں کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

غیا کا شوہر اس سے عمر میں اتنا بڑا نہیں تھا۔ مگر اس کی یہ دوسری شادی تھی۔ یہ شادی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کی گئی تھی۔ خان دلاور بھی غیا کے پاسنگ نہیں تھا۔ دونوں ان پر بڑھ تھے۔ دونوں ہی وسیع و عریض جائیداد کے تھادار تھے۔

بابا جان نے ان میں آخر دیکھا ہی کیا تھا؟ کیا ان کی اتنی خوب صورت بیٹیاں اس قدر ارزاں تھیں کہ ایک بوجھ کی طرح انہیں اتار دیا گیا تھا؟

کیا کل جب بھی اپنی پھوپھیوں کی جگہ پر کھڑی ہوگی؟

اس نے ماما سے بات کی تو انہوں نے کہا تھا۔ ”تو کیا اچھے رشتوں کے انتظار میں انہیں دبلیز رہنا کے بوڑھا کر دیتے۔ انہوں نے بہتر فیصلہ کیا ہے۔ سورن گل زیبا اور گل ہالا کا انجام دیکھ رہی ہونا! بھابھی صاحبہ کا خیال تھا کہ ان کی بیٹیاں اس قدر حسین ہیں تو لڑکے بھی ان کی فکر کے ہونے چاہئیں۔ اور پھر اسی انتظار میں انہوں نے گل زیبا کے بالوں میں سفیدی اتار دی۔ اس لیے مجھے خان صاحب کے فیصلے پر سر جھکانا پڑا۔“

”مما! خاندان کے علاوہ بھی تو رشتے ہو سکتے ہیں۔“

”پگلی! آئندہ یہ بات زبان پر مت لانا ورنہ جان نکال دیں گے یہ لوگ۔ جاؤ انھو پریشان مت ہو بچوں کو دیکھو، انہوں نے کھانا پانا نہیں کھایا ہے یا نہیں۔“

روشی مرے مرے قدم اٹھاتی کو ریڈر سے باہر نکلی تو غنچور نے کہا۔

”بی بی امیر صاحبہ بلارہے ہیں۔“

”آف! اب میر صاحبہ کی بات بھی سنو۔“ وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی اور اس میں میر صاحبہ کی بات سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ مگر حکم کی بجا آوری بھی ضروری تھی۔ وہ ماہ نور کو گود میں اٹھا کر سیدھی ذکاء خان کے کمرے میں چلی آئی۔

”اسے کیوں لائی ہو؟“ اس نے بچی کو دیکھ کر ناگواری سے پوچھا۔

”آپ کے پاس سونے کی ضد کر رہی تھی۔“ روشی نے جلدی سے بات بنائی۔ حالانکہ اس کے بچے ضدی نہیں تھے۔ ویسے بھی ماہ نور تو سو چکی تھی۔ روشی نے احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”کیسی بات؟“ وہ چونکی۔

”تمہیں شانی کے متعلق ایک بات بتانا ہے پہلے ماہ نور کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ۔ دیکھو روشی کی وجہ سے اس کی نیند ٹھہر رہی ہے۔“

”اوکے۔“ دوسرے ہی لمحے وہ احتیاط سے ماہ نور کو اٹھا کر کمرے میں چھوڑ کر واپس آگئی۔

”بتائیے بھی۔“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”سہلے بہ بتاؤ۔ تم نے ساڑھی کیوں پہنی تھی۔“

”کیوں؟ کیا اچھی نہیں لگی۔ سب نے تو تعریف کی تھی۔ غیا کی منہ کہہ رہی تھی میں سات بچوں کی ماں تو لگتی ہی نہیں۔“ روشی نے قدرے فخر سے کہا۔

”عورتیں تعریف کی بھوک کیوں ہوتی ہیں؟“ ذکاء خان نے تاسف سے کہا۔

”جب اپنے مرد نہ سراہیں تو تعریف تو رہتی ہے۔“

اس کا انداز بھی جتنا لے والا تھا۔

”اے مرد کے لیے بھی کبھی اتنا سنجے سنور نے میں وقت برباد کیا ہے؟“ ذکاء کے لہجے میں ہلائی کاٹ تھی۔

”آپ نے کبھی نظر بھر کر دیکھا ہے؟“ وہ کہنا چاہتی تھی مگر اپنا پیچ میں آگئی۔

”کام کی بات کریں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“

”مجھے دیکھ کر تو ہمیں نیند کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”میں تھک چکی ہوں خان! سارا دن آپ کے بچے گھن چکر بنائے رکھتے ہیں۔“

”شکر ہے میرے بچے کہا ہے تم نے ورنہ بچوں پر تو یوں قبضہ جمائے ہوتے ہو کہ شاید میں کہیں تم سے چھین نہ لوں۔“

”آپ کا بھلا کیا بھروسہ۔“

”بس اتنا سمجھتی ہو مجھے؟“ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ ”میں یہ کہنا مناسب ہو گا کہ تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔“

”ایسی بات نہیں۔“ وہ جبریزی ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ دونوں شادی کے آٹھ سال بعد بھی اجنبی تھے۔

”آپ شانی کے متعلق کوئی بات کہنا چاہ رہے تھے۔“ روشی نے اسے یاد دلانا چاہا۔

”شانی کا رشتہ تمہارے پاپا کی ایکس وائف کے بھائی ولی حاقان نے اپنے چھوٹے بھائی معصیم حاقان

کے لیے مانگا ہے۔“ میں نے بھی اپنے دوست سبطین خان کا پروپونل پیش کر رکھا ہے۔ اپنے پاپا سے کہنا۔ صامی کا پروپونل ایکسیپٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ! اس کے لہجے میں عجیب سی دھمکی پوشیدہ تھی۔ اور روشی تو گویا ساکت رہ گئی۔

”صامی بھائی، جیسا نفیس، اتنا اخلا خویوں کا مالک شانی کا طلب گار تھا۔ اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔ اور میں کیا اگل ہوں جو پاپا کو مجبور کروں گی۔ میری بہن ایک اچھے ماحول میں جائے یہ ہی تو میری آرزو تھی۔ تمنا تھی۔ آپ کا دوست آپ جیسا ہی ہو گا۔“ اس کا دل خدا کے حضور سجدہ رہا تھا اور وہ اپنی بہن کی خوشیوں کی بقا اور سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔



بہت سی کامیابیاں سمیٹتے ہوئے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے جب بہت سے ماہ و سال وقت کے تھال میں گرتے چلے گئے تھے تو تب کہیں ولی حاقان کو جھلپا سے ایک ایسا سوال پوچھنے کا خیال آیا تھا جس نے جیلی کے زخموں سے تھنڈا تار کر اسے پھر سے لولہاں کر دیا۔

اتنے سال گزر گئے تھے اسے ولی حاقان کے فلیٹ میں مستقل رہتے ہوئے اس دوران کتنے ہی موسم آئے۔ ممی گئیں، فنی اس کے قد کے برابر آگیا تھا۔ اس کی شخصیت میں ولی حاقان کی ذات کی گہری چھاپ تھی۔ اسی کی طرح دھیمہ بولتا، آہستہ روی سے چلتا، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا۔ فنی نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔ وہ ولی حاقان کی اولاد نہیں تھا۔ مگر ولی حاقان نے اسے اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا۔ توجہ دی تھی، محبت دی تھی۔

بہت سال پہلے ایک مرد نے بہت کم سنی میں اس کے دل پر حکومت کی تھی۔ آج بھی جیلی اس ہرجائی کے عشق میں گرفتار تھی۔ آج بھی وہ اس کی یادوں میں اول روز کی طرح زندہ تھا۔ آج بھی وہ اسے پہروں

سوچا کرتی تھی۔

وہ بے وفا آدمی جو کسی کی نفرت میں اس کے قریب آیا تھا۔ اس نے جیلی سے نکاح کیا تو صرف اپنے کسی رقیب کو زک پہنچانے کے لیے۔ جیلی آج تک اس ڈرامے کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نکاح کا مقصد کیا تھا؟ اور اس نے جیلی کو ہی کیوں استعمال کیا؟ اور اس آخری وصل کی رات نہ جانے کس سے وہ فون پر مخاطب تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ رخ اور کامیابی کے احساس سے اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

”مئی! جہاں سے آپ کو نکالا گیا تھا اس اسٹیٹ پر صرف میری حکومت ہوگی، دیکھیے گا میں کرتا کیا ہوں۔“

جیلی ششدر تھی، اور وہ اس کی تصویریں اور نکاح نامہ گئی۔

”آخر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟“ وہ سوچتی اور روتی رہ گئی تھی۔ اور آج اتنے سالوں بعد اس کے حسن نے یہ سوال کیا تھا۔ اسے تو بہت سال پہلے جیلی سے پوچھ لیا تھا۔

”تمہارا شوہر کون تھا جیلی؟“ ولی حاکم پوچھ رہا تھا۔

”اس کا تعلق ہری پور سے تھا، اور اس نے مجھے اپنا نام ڈاکا خان بتایا تھا۔“ ولی کے سر پر اٹھانے لگا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو جیلی؟“ وہ حق سارہ لیا۔

”یہ ہی سچ ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

”ڈاکا خان۔ ہری پور۔“ ولی کا دماغ چکرانے لگا۔

”تو کیا یہ روشا نے ڈاکا خان ہے۔“ اس کا دل کہیں دور گری گھاٹی میں گر رہا تھا۔

”تمہارے پاس ڈاکا خان کی کوئی تصویر ہے؟“

”نہیں۔“

”تو کیوں؟“

”وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ البتہ میری تصویریں اس کے پاس تھیں۔“

”وہ تمہیں کہاں ملا تھا؟“

”میں برلن میں۔“

”اور تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔“

”وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے پاس پیسہ تھا۔ وہ مضبوط شخصیت کا مالک تھا۔ مئی اس کی دولت پر رنجیدہ تھیں۔“

”جیلی نے آزدگی سے تپا۔“

”تم نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟ تمہیں پاکستان جانا چاہیے تھا۔ تمہیں اس کے خاندان کے پاس جانا چاہیے تھا۔“

”میں بزدل ہوں بہت بزدل۔ اتنی ہمت نہیں تھی مجھ میں اور نہ ہی میرے پاس روپیہ تھا۔“ وہ اذیت سے لب چلنے لگی۔

”اب تم کیا چاہتی ہو؟ کیا زندگی یوں ہی گزار دو تھی۔“

”میں کیا چاہوں گی۔“ وہ اپنی بزدلی کے ہاتھوں مجبور تھی۔

”دلیا میں ڈکاء خان سے ملوں۔ اس سے بات کروں۔ اگر وہ نہ ملتا تو تمہاری طرف سے اس پر کیس دائر کروں گا۔ ایسے شریف لوگوں کے ساتھ یہ ہی کچھ کرنا چاہیے۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

”تمہیں تمہا پاکستان جاوے؟“ جیلی حیران پریشان سی پوچھ رہی تھی۔

”ہاں۔“ ولی کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔



سبطین خان درانی قبیلے سے تھا۔ اس کا باپ بھی اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ سیاست میں بھی ان کا ایک نام تھا اور ادھر شائی کو بھی یہ ہی غم کھایا تھا کہ اس کا باپ روشا نے کی طرح اسے بھی کسی قبیلے میں ہی کھپا دے گا۔

شام کو بیٹھتا تھا اور دلاور خان بھی آگئے تھے۔ اور ماما کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے شمالی میں بیٹی کو ڈنڈا۔

”تمہیں بتا کر آنا چاہیے تھا۔ کم از کم میں دلاور خان کے لیے شہرے انگریزی کھانے منوا لیتی۔“

دلاور خان سی فوڈ کا شوقین تھا۔ ایک دنیا اس نے دیکھ رکھی تھی۔ نہ جانے کس کس ملک کی خاک چھانی تھی۔ اس نے اگرچہ رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، مگر وہ کسی تعلیم یافتہ انسان سے کم نہیں لگتا تھا۔ اس کی گفتگو میں ہنساؤ تھا۔ سنجیدگی تھی، اور موڈ میں ہوتا تو اس جیسا حاضر جواب کوئی نہیں تھا۔

دلاور خان نے فضا کو ایٹ آباد میں کوٹھی لے کر دی تھی۔ اس کی پہلی بیوی گاؤں میں ہوتی تھی۔ فضا کی ساس اس کی شمالی کے خیال سے شہر میں آئی جاتی رہتی تھیں۔

البتہ ماویٰ کے حالات فضا سے بہت مختلف تھے۔ روشی کے خیال میں ماویٰ کو روایتی سماجوں ملا تھا۔ مگر اس کا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوا جب ماویٰ کی بیماری کی وجہ سے بالکل اچانک اسے اور میر ذکاء کو گاؤں جانا پڑا تھا۔

انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ ماویٰ کس وجہ سے بیمار ہے۔ پچھلے پانچ مہینوں سے وہ یہاں نہیں آئی تھی۔

روشی تو اس سچی دیواریوں والے مکان کو دیکھ کر ہی ساکت رہ گئی۔ مہمان خانہ جس قدر عالی شان تھا رہائشی حصہ اسی قدر پسماندگی کا شکار۔ حتیٰ کہ بجلی کی سولت بھی نہیں تھی۔ تین چار نوکریاں ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ تین کمرے تھے ایک برآمدے اور باورچی خانہ۔ ایک طرف ہاتھ روم بھی موجود ہی مگر اس قدر غلیظ کہ ابکائی آنے لگتی۔

پلنگ پر بیٹھی ماویٰ کو دیکھ کر روشی کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ ماویٰ کا مس کیرج ہو گیا تھا اور انہیں کسی نے بھی بتانا گوارا نہیں کیا۔

”سب کیسے ہوا ہے؟“ روشی تو ابھی تک شاک میں تھی۔

”بارش ہو رہی تھی۔ کچے صحن میں سے چڑس سمیٹے ہوئے پیر پھول گیا تھا۔“ وہ بھر جاتی کو اپنے کھر

میں اچانک دیکھ کر کتنی مسرور ہوئی تھی اور اواس بھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی بھر جاتی اور بھایا کس خاطر مدد رت کیسے کرے گی۔ باورچی خانے میں صرف والیں اور چاول کا ڈبا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا حتیٰ کہ دودھ بھی نہیں۔

”تم کچھ نہ رہی ہو۔“ روشی کو قطعاً یقین نہ آیا۔

”سچ کہہ رہی ہوں بھر جاتی!“ ماویٰ کا دل بھر بھر اربا تھا۔ کیسی بے بسی تھی یہ کسے دکھ تھے جو صرف اسے تنہا سننے تھے۔ زبان بندی کا حکم تھا۔ پھر کیسے یوں سے شکوہ صدا بن کر ابھرتا۔

روشی نے ایک خادمہ کو مردان خانے بھیج کر میر ذکاء کو اندر بلایا۔ میر ذکاء کے اندر آتے ہی خان شمت نہ جانے کس کونے سے برآمد ہوا تھا۔ پھر اس کی ماں اور بہنیں بھی نکل آئیں۔ میر شمت تابعداری سے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کی ماں اور بہنیں گویا کچھ جاری تھیں۔ ”انا“ ”فانا“ ”فروٹ“ ”دودھ“ ”جوس“ اور مٹھائیاں آکھیں۔ باورچی خانے سے اشتہا انگیز خوشبو میں اٹھنے لگیں۔

میر ذکاء نے ایک کٹیلی نفرت بھری نظر شمت خان کی طرف پھینکی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ روشی نے محسوس کیا تھا میر ذکاء کو بھی شمت خان پائیند ہے۔ روشی اسے ماویٰ کے کمرے میں لے آئی تھی۔ کمرے میں بے تحاشا ٹخن اور جس تھا۔ ذکاء خان کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے روشی سے کہا۔

”میں صحن میں بیٹھتا ہوں۔ تم ماویٰ کو لے کرو یہیں آجاؤ۔“

”خان! ماویٰ بیمار ہے۔ یہ چل پھر نہیں سکتی۔“ روشی کو بتانا پڑا۔

”تم ماویٰ کو تیار کرو۔ اسے ہسپتال لے چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس کا بخار بگڑ گیا ہے۔“

یقیناً ڈکاء خان کو یہی بتایا گیا تھا۔ ماویٰ کی ساس بندیں بھی موجود تھیں۔ وہ ماویٰ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں اس خوف سے کہ وہ اپنے میکے والوں کو کچھ بتانے دے۔ روشی کچھ سوچتی رہی تھی پھر انگریزی میں

بولی۔ ”ماوی کو بخار نہیں“ اس کا مس کیرج ہوا ہے۔ اسے کسی گانا کا لوجسٹ کی ضرورت ہے۔“
”ہوں۔ ماوی کو مس کیر الدین کے کلینک لے چلتے ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

ماوی کی ساس اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جانے سے روکنا چاہتی تھی۔ اگر میرزہ کا ساتھ نہ ہو تا تو انہوں نے ماوی کو شہر نہیں بھیجا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی ڈوائف کی تعریف کر رہی تھی جسے سنتا بھی روشنی نے گوارا نہیں کیا۔

حشمت خان ابھی تک مڈوب بنا بیٹھا تھا۔ روشنی کو وہ اول درجے کا کافر آیا اور ایکٹرو کھائی دے رہا تھا۔

”میر سائیں! میں خود ماوی کو ہسپتال لے جاتا ہوں۔“ وہ بڑے ادب سے کہہ رہا تھا۔

”اتنے دنوں سے بیمار ہے ماوی۔ پہلے کیوں نہیں خیال آیا اسے ڈاکٹر کو دکھانے کا۔“ روشنی کا لہجہ کٹھن تھا۔

”ٹھو ماوی!“ روشنی نے زبردستی ماوی کو چادر اوڑھا دی تھی۔ پھر اسے سہارا دے کر گاڑی تک لائی۔

”خان! میں کو ایک طرف سے پکڑو۔“ روشنی اسے سوچوں میں غم دیکھ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ وہ کچھ جھجک کر رو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں۔“ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا قریب آئی گیا تھا۔ پھر اس نے سہارا دے کر ماوی کو گاڑی میں بٹھایا۔ ماوی خود حیران تھی اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔

”بہنوں! بیٹیوں اور بیویوں کو ہمیشہ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ بہت کچھ جھکا رہا تھا۔ میرزہ کا خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

مس کیر الدین نے ماوی کو ایڈمٹ کر لیا تھا۔ وہ بہت تجربہ کار اور بزرگ ڈاکٹر تھیں۔ انہوں نے ماوی کا معائنہ کر کے بتایا۔

”اس کا مس کیرج پھسلنے کی وجہ سے نہیں تشدد کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”نہیں۔“ ماوی گہرا کر ہٹلانے لگی تھی۔

روشنی کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے میرزہ کا کوجوش کے عالم میں بتایا۔

”حشمت خان نے ماوی کو مارا ہے۔ آپ اس سے باز پرس کیوں نہیں کرتے؟“

”کیا باز پرس کروں؟ یہ کہ اس نے اپنی بیوی کو کیوں مارا ہے؟ ہمارے ہاں رواج نہیں بیٹیوں کے گھروں میں مداخلت کرنے کا۔“

”اے ان نام نہاد رواجوں پر بیٹیوں کو قربان کر کے کون سا وقار بلند کر رہے ہیں۔ عورت کی زندگی سے زیادہ قیمتی یہ رسم و رواج ہیں۔“ وہ یکدم مشتعل ہو گئی۔

”جکو مست۔“ وہ دبی آواز میں غرلا تھا۔

ماوی کو جھپٹے بعد ڈیو سٹار ج کر دیا گیا تھا۔ ایسی پر میرزہ کا نے ڈرائیور سے کہا۔

”عدی کوٹ چلو۔“

”ہم عدی کوٹ نہیں، ہری پور جائیں گے۔“ روشنی کا انداز اٹل تھا۔

”ہری پور کیوں؟“

”ماوی کو بیز ریسٹ کی ضرورت ہے۔ جبکہ وہاں تو نہ آرام ہو سکتا ہے نہ مناسب خوراک مل سکتی ہے اسے۔“

”مگر حشمت خان۔۔۔ وہ کچھ سوچ کر لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

”بھاڑ میں گیا حشمت خان۔“ روشنی نے جل بھن کر زریب کہا۔

”بھڑ جائی! مجھے عدی کوٹ جانے دو۔“ ماوی دھیرے سے منمنائی۔

”کیوں جانے دوں؟ پھر سے اس کی درندگی کا شکار ہونا چاہتی ہو۔ تم لوگوں کی خاموشی نے ان مردوں کو شیر کر رکھا ہے۔ تم نے ہاتھ کیوں نہیں روکا اس کا۔“ وہ غصے سے دبی آواز میں اسے جھڑکنے لگی۔

”بھڑ جائی! تم نہیں سمجھو گی۔“ ماوی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ گاڑی ہری پور کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ یعنی میرزہ کا نے اس کی بات مان لی تھی۔

”اماں کو اس کی بیماری کے متعلق نہ بتانا۔“ گاڑی سے نکلنے کے بعد میر نے روشنی سے تاکید کیا۔

”میں کیوں ممکو پریشان کروں گی۔ اتنی تو سمجھ ہے مجھ میں۔“ وہ ماوی کو سہارا دے کر اندر بڑھ گئی تھی۔

ان ہی دنوں روشنی کو شمالی اور صابی حاقان کے رشتہ طے ہو جانے کی خبر ملی تھی۔ میرزہ کا ملک سے باہر تھا لہذا اس خوش خبری پر روشنی اطمینان سے خوشی کا اظہار کر سکتی تھی۔

پاپائے سبطین خان کے پرنسز پر مصمم کو فوٹت کیوں دی تھی؟ یہ سچی بھی جلد ہی منکھ گئی۔ پاپا اور مالک کی خند اور انکی جنگ میں شمالی کا مستقبل سنور گیا تھا۔

پاپا اور مالک ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے شوق میں شمالی کی تیاریاں لگا گئے تھے۔ سننے میں آیا تھا۔ مالک نے اس رشتے کی شدید مخالفت کی تھی جبکہ دلی کی ذاتی کوششوں کی بنا پر یہ رشتہ طے ہوا تھا۔

مصمم کا پرنسز ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ اس کے والد وروگ خاندان سے تھے۔ پسند کی شادی کے جسم میں انہیں جائیداد سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ قبیلے والوں نے ان سے تمام تعلقات توڑ لیے تھے۔ خاندان، جائیداد اور نسب کے بغیر وہ گناہ ہو کر رہ گئے تھے۔

اسے یقین تھا کہ میرزہ کا نے سبطین خان کے پرنسز کو نہ منظور کیے جانے پر بے انتہا غصہ کرنا تھا۔ وہ اسے اپنا کام مسئلہ بھی بنا سکتا تھا۔

مگر خلاف توقع جب اسی شام میرزہ کا واپس گھر آیا اور رات کو اسے بلوایا گیا تو روشنی سے سب سے دل کے ساتھ میرزہ کا کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ مگر اس نے روشنی سے کسی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

اور پھر ان ہی دنوں ایسی آندھی چلی تھی سب کچھ تھس تھس ہو گیا۔

گل افشاں گھر کے ملازم گلریز خان کے ساتھ کوٹھری میں سے برآمد کی گئی تھی۔ شرمندگی کے

مارے عشق النساء گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل مالا اور گل زبا کو گہری چپ نے آن بوجھا تھا۔ لی جاناں بول نہیں سکتی تھیں مگر سن تو سکتی تھیں۔ اس قیامت کی خبر کو سن کر وہ وحشانہ انداز میں رونے لگیں۔ اپنا سر تکیے پر پختی رہ گئیں۔

”نہیں۔ میری۔ میری۔ بیٹی۔“ شاید بیٹی کو یاد کیا جا رہا تھا۔ اس بیٹی کو جسے وہ بہت سال پہلے اپنے تئیں رو چکی تھیں۔ بار چکی تھیں۔ آج کیسے زندہ ہو کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”بناؤ اماں! تم ہاں ہو میری۔ تم کیسی ماں ہو؟ ماؤں کے دل پتھر تو نہیں ہوتے۔ کیا ناز تھا تمہیں پوتیوں کے حسن پر اور کتنی نفرت تھی میرے وجود سے۔ اپنی کوکھ سے میرا اس کی بیٹی کی بد صورتی سے نفرت تھی نا تمہیں۔ دیکھو تو آج تمہاری حسین و جمیل پوتی نے تمہاری اجلی ردا کو کیسا داغدار کیا ہے۔ مجھ پر چھوٹے بہتان باندھے تھے تا تم نے لوگوں سے کہتی تھیں تم کہ مشیرہ گل کو تیا زاد احمد خان بھگا کر لے گیا اب دیکھو تو گل افشاں نے کیا کیا ہے؟ اب بولتی کیوں نہیں ہو؟ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاؤ تمہاری پوتی کیسی گندی دلدل میں جا گری ہے۔“

لی جاناں کو لگ رہا تھا کہ مشیرہ کے سامنے کھڑی ہے وہ اس سے غائبانہ معافی مانگتی رہ گئیں۔

جرم کہ بلوایا گیا تھا مگر میرزہ کا نے جرمے والوں کو اٹھو ادیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا مگر رات کے پچھلے پھر گل افشاں اور گلریز خان بھاگ گئے تھے اور انہیں گل زبا نے یہاں سے نکلوا دیا تھا۔ وہ دونوں کہاں گئے تھے حال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

گل افشاں تو چلی گئی تھی مگر پیچھے رہ جانے والوں کی زندگیوں میں اب کوئی روزانہ نہیں رہا تھا۔ کوئی درپچہ اب خانوں کی بیٹیوں کے لیے نہیں چل سکتا تھا۔ مشیرہ گل ماں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر تیا کے پاس پناہ لینے چلی گئی تھی۔

اور گل افشاں ان روایتوں کی زنجیروں اور ان

مارے عشق النساء گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل مالا اور گل زبا کو گہری چپ نے آن بوجھا تھا۔ لی جاناں بول نہیں سکتی تھیں مگر سن تو سکتی تھیں۔ اس قیامت کی خبر کو سن کر وہ وحشانہ انداز میں رونے لگیں۔ اپنا سر تکیے پر پختی رہ گئیں۔

”نہیں۔ میری۔ میری۔ بیٹی۔“ شاید بیٹی کو یاد کیا جا رہا تھا۔ اس بیٹی کو جسے وہ بہت سال پہلے اپنے تئیں رو چکی تھیں۔ بار چکی تھیں۔ آج کیسے زندہ ہو کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”بناؤ اماں! تم ہاں ہو میری۔ تم کیسی ماں ہو؟ ماؤں کے دل پتھر تو نہیں ہوتے۔ کیا ناز تھا تمہیں پوتیوں کے حسن پر اور کتنی نفرت تھی میرے وجود سے۔ اپنی کوکھ سے میرا اس کی بیٹی کی بد صورتی سے نفرت تھی نا تمہیں۔ دیکھو تو آج تمہاری حسین و جمیل پوتی نے تمہاری اجلی ردا کو کیسا داغدار کیا ہے۔ مجھ پر چھوٹے بہتان باندھے تھے تا تم نے لوگوں سے کہتی تھیں تم کہ مشیرہ گل کو تیا زاد احمد خان بھگا کر لے گیا اب دیکھو تو گل افشاں نے کیا کیا ہے؟ اب بولتی کیوں نہیں ہو؟ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاؤ تمہاری پوتی کیسی گندی دلدل میں جا گری ہے۔“

لی جاناں کو لگ رہا تھا کہ مشیرہ کے سامنے کھڑی ہے وہ اس سے غائبانہ معافی مانگتی رہ گئیں۔

جرم کہ بلوایا گیا تھا مگر میرزہ کا نے جرمے والوں کو اٹھو ادیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا مگر رات کے پچھلے پھر گل افشاں اور گلریز خان بھاگ گئے تھے اور انہیں گل زبا نے یہاں سے نکلوا دیا تھا۔ وہ دونوں کہاں گئے تھے حال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

گل افشاں تو چلی گئی تھی مگر پیچھے رہ جانے والوں کی زندگیوں میں اب کوئی روزانہ نہیں رہا تھا۔ کوئی درپچہ اب خانوں کی بیٹیوں کے لیے نہیں چل سکتا تھا۔ مشیرہ گل ماں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر تیا کے پاس پناہ لینے چلی گئی تھی۔

اور گل افشاں ان روایتوں کی زنجیروں اور ان

مارے عشق النساء گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل مالا اور گل زبا کو گہری چپ نے آن بوجھا تھا۔ لی جاناں بول نہیں سکتی تھیں مگر سن تو سکتی تھیں۔ اس قیامت کی خبر کو سن کر وہ وحشانہ انداز میں رونے لگیں۔ اپنا سر تکیے پر پختی رہ گئیں۔

”نہیں۔ میری۔ میری۔ بیٹی۔“ شاید بیٹی کو یاد کیا جا رہا تھا۔ اس بیٹی کو جسے وہ بہت سال پہلے اپنے تئیں رو چکی تھیں۔ بار چکی تھیں۔ آج کیسے زندہ ہو کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”بناؤ اماں! تم ہاں ہو میری۔ تم کیسی ماں ہو؟ ماؤں کے دل پتھر تو نہیں ہوتے۔ کیا ناز تھا تمہیں پوتیوں کے حسن پر اور کتنی نفرت تھی میرے وجود سے۔ اپنی کوکھ سے میرا اس کی بیٹی کی بد صورتی سے نفرت تھی نا تمہیں۔ دیکھو تو آج تمہاری حسین و جمیل پوتی نے تمہاری اجلی ردا کو کیسا داغدار کیا ہے۔ مجھ پر چھوٹے بہتان باندھے تھے تا تم نے لوگوں سے کہتی تھیں تم کہ مشیرہ گل کو تیا زاد احمد خان بھگا کر لے گیا اب دیکھو تو گل افشاں نے کیا کیا ہے؟ اب بولتی کیوں نہیں ہو؟ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاؤ تمہاری پوتی کیسی گندی دلدل میں جا گری ہے۔“

لی جاناں کو لگ رہا تھا کہ مشیرہ کے سامنے کھڑی ہے وہ اس سے غائبانہ معافی مانگتی رہ گئیں۔

جرم کہ بلوایا گیا تھا مگر میرزہ کا نے جرمے والوں کو اٹھو ادیا۔ وہ ان کے بارے میں کچھ اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا مگر رات کے پچھلے پھر گل افشاں اور گلریز خان بھاگ گئے تھے اور انہیں گل زبا نے یہاں سے نکلوا دیا تھا۔ وہ دونوں کہاں گئے تھے حال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

گل افشاں تو چلی گئی تھی مگر پیچھے رہ جانے والوں کی زندگیوں میں اب کوئی روزانہ نہیں رہا تھا۔ کوئی درپچہ اب خانوں کی بیٹیوں کے لیے نہیں چل سکتا تھا۔ مشیرہ گل ماں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر تیا کے پاس پناہ لینے چلی گئی تھی۔

اور گل افشاں ان روایتوں کی زنجیروں اور ان

مارے عشق النساء گوشہ نشین ہو کر رہ گئی تھیں۔ گل مالا اور گل زبا کو گہری چپ نے آن بوجھا تھا۔ لی جاناں بول نہیں سکتی تھیں مگر سن تو سکتی تھیں۔ اس قیامت کی خبر کو سن کر وہ وحشانہ انداز میں رونے لگیں۔ اپنا سر تکیے پر پختی رہ گئیں۔

”نہیں۔ میری۔ میری۔ بیٹی۔“ شاید بیٹی کو یاد کیا جا رہا تھا۔ اس بیٹی کو جسے وہ بہت سال پہلے اپنے تئیں رو چکی تھیں۔ بار چکی تھیں۔ آج کیسے زندہ ہو کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

پتھروں کی دیواروں کی گھٹن سے گھبرا کر بھاگ گئی تھی۔ اب روشی کو یقین تھا کہ کوئی بھی انقلاب اس گھر کی دیواروں کو ہلانا نہیں سکے گا۔ کل افشاں کی بے صبری نے آنے والی نئی نسل کی راہ میں اندھیرے ہی اندھیرے رقم کسے تھے۔

مس ٹینا کی چھٹی کروادی گئی۔ جب کہ اسکول سے اٹھوا لیا گیا۔ اب وہ گیارہ سال کی ہو رہی تھی۔ ان کے خیال میں وہ جوان ہو چکی تھی سو جب کہ گھر میں قید کر دیا گیا۔ اس کا ننھا سا ذہن اس افتاد کو قبول نہیں کر سکا تھا۔ پڑھائی کا اسے جنون تھا۔ کتابوں سے اسے عشق تھا۔ اور صبح معنوں میں جب نے ماں اور باپ سے ذہانت وراثت میں پائی تھی۔

اس نے رو رو کر سارا گھر سربرا اٹھا لیا۔ بھوک ہڑتال کر دی۔ اور کمرہ بند کر کے سارا دن سستی رہتی۔ تیسرے دن میر ذکاء تک خبر پہنچ چکی تھی سو ان ماں بیٹی دونوں کو طلب کر لیا گیا۔

”اگر میں پڑھوں گی نہیں تو مر جاؤں گی۔“ باپ کے پوچھنے پر وہ گویا پھٹ پڑی۔

”تو شوق سے مری جاؤ۔“ میر ذکاء نے سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ بیٹی سے نظریہ آ کر بات کر رہا تھا۔ وہ جو گیارہ سال کی عمر میں بہت بڑی بڑی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کے بال کمر سے بھی نیچے تک تھے اور وہ روشی کی طرح بلیا کی حسین تھی۔ اور پہلی مرتبہ میر ذکاء کو بیٹی کے حسن سے خوف محسوس ہوا۔

”روشانے! اسے سمجھا دو۔“

”مما مجھے کچھ نہیں سمجھا سکتیں۔ اگر آپ نے مجھے اسکول نہ بھیجا تو میں خود کو ختم کر لوں گی یا پھر خود بھی کہیں کم ہو جاؤں گی۔ آپ مجھے ڈھونڈتے رہیے گا۔ کل افشاں چھپو کی طرح۔“

”بکو اس بند کر۔“ میر ذکاء نے جب کہ گل پر ایک زنا نے وار پھینک دیا۔

”یہ تربیت کی ہے تم نے اس کی۔“ وہ روشی پر الٹ پڑا۔

”یہ عمل کا رد عمل ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ آپ

بچی کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گے میر صاحب! آپ لوگ ان ”حادثوں“ سے بھی سبق نہیں سیکھتے۔ انہیں ”قید“ ثنائی“ کے عذاب سے دوچار کر دیتے ہیں۔ یہ پھول یہ آپ کے گلشن کی کلیاں مگر جھاکر رہ گئی ہیں۔ اور جب یہ کوئی چور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی ہیں تو پھر آپ جیسے انا پرست انہیں زندگی کے پوچھنے سے آزاد کر دیتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں جب بھی کل افشاں کی جگہ پر کھڑی ہو جائے؟“

وہ اس کا گریبان پکڑ کر چیخ اٹھی تھی۔ میر ذکاء نے جب کہ کمرے سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا تھا تو وہ روشی ہوئی بھاگ گئی تھی۔

روشی رو رو کر بے حال ہو گئی تھی۔

”بارہ سال ہو گئے ہیں۔ ان بارہ سالوں میں تم سے کیا مانگا ہے میں نے۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو تو سہی۔“

”کیا مجھے ان سے محبت نہیں ہے احساس نہیں ان کا؟“ اسکول سے ہی اٹھوا لیا ہے نا اہم سمجھاؤ کی تو سمجھ جائے گی۔ ویسے بھی دو تین سال تک میں اس کی شادی کر دوں گا۔“

اس نے گویا بات ختم کر دی تھی مگر بات ختم کہاں ہوئی تھی۔ دوسری صبح انوکھے رنگ لیے طلوع ہوئی تھی۔ جب صبح صبح نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ روشی نے ملازمہ کو اس کے پیچھے دوڑایا۔ جب اونچے نیچے راستوں پر اندھا دھند بھاگتے ہوئے کسی گہری کھائی میں گر گئی تھی۔ ”آنا“ ”فانا“ مردان خانے میں اطلاع پہنچ گئی تھی۔ جب کہ کھائی سے نکال لیا گیا تھا۔ مگر اس کا پورا وجود زخمی تھا۔

دو گھنٹے بعد جب گھر آچکی تھی۔ اور سفید پیوں میں جکڑی بیڈ پر نیم دراز تھی۔ روشی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اور وہ غم سے بو بھل دل لیے اس کی روٹی روٹی آواز سن رہی تھی۔

”مما! مجھے کیوں پچایا ہے؟ جب جب پڑھے گی نہیں تو پھر زندہ رہ کر کیا کرے گی۔“

”خیر! میری بیٹی! ابھی کچھ مت بولو۔ کچھ مت سوچو

یہ جنگ اپنی ماں کو لڑنے دو۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے بے ساختہ جب کہ پیشانی چوم کر کہا تھا۔

”مما! بابا ہم سے پیار نہیں کرتے نا؟“

”جب!“ وہ لرز کر رہ گئی تھی۔ ”یسا نہیں سوچتے بیٹا!“ وہ بابا سے بدگمان ہو رہی تھی۔ اور روشی بھی بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔

”مما!“ جب کہ کراہی۔

”پلیز خیر! خاموش ہو جاؤ۔ بولنا تمہارے لیے بہتر نہیں۔“ وہ فرمانبردار بیٹی تھی ماں کی بات مان کر خاموش ہو گئی۔



”جو ہی! کیا کر رہی ہو؟“ وہ جو بالکونی سے دور بہت دور کھڑے خان کے دوست کو خان سے باتیں کرتا بغور دیکھ رہی تھی روشی کی آواز سن کر پوری جان سے کانپ کر رہ گئی۔

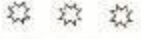
”بھرجانی! اتم۔“ روشی بہت کم اس حصے کی طرف آتی تھی۔ اور بالکونی میں تو فرصت سے کھڑے ہونے کا وقت ہی کہاں ملتا تھا۔

روشی ذکاء خان کے دوست سبطین خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

”جو بی! اسے جانتی ہو؟“

”نہیں۔ نہیں بھرجانی!“ وہ ہکھلانے لگی۔

انہوں نے ہنکارا بھرا اور پھر نیچے چلی آئیں۔



دن کتنے بو جھل اور اداس تھے ان ہی دنوں شانی کی شادی کا بلایا گیا۔ وہ بچوں سمیت ”ازبک باؤس“ چلی آئی۔ پاپائے شانی کی شادی بہت دھوم دھام سے کی گئی۔ شانی دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اور صامی بھی بہت وجیہ اور خوش باش دکھائی دے رہا تھا۔ ان دنوں کو خوش اور مطمئن دیکھ کر روشی خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

شان کی شادی میں ہی روشی نے اتنے بے شمار

سلاوں بعد ولی بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ مگر بس فل دکھائی دیے رہے تھے۔ ان کے لبوں پر آج بھی مسکراہٹ تھی۔ اور وہ روشی سے بے حد تپاک سے ملے تھے۔

پھر صامی اور وہ بیٹی مولن منانے ورلڈ نوپر نکل گئے تھے۔ پاپائے کم از کم ایک بیٹی کے لیے بہترین فیصلہ کیا تھا۔ چاہے انا اور کسی سے خد کی جنگ میں ہی سہی۔

روشی نے کئی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ ولی بھائی اسے دیکھتے ہوئے نہ جانے کن سوچوں کے بھنور میں الجھ جاتے ہیں۔

اوہ ولی بھی ایک اذیت ناک کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ اس اداس اداس پیاری سی روشی کو کیسے اتنی بڑی حقیقت بتانے کا حوصلہ لاتا۔ وہ کیسے ان دکھوں کے انبار اور پریشانیوں کے بوجھ تلے ولی روشی کے غموں میں اضافہ کرتا۔ وہ کیسے روشانے ذکاء خان کو بتا کر اس کا شوہر برلن میں ایک اور عورت کا شوہر بھی رہ چکا ہے۔ وہ ایک نیچے کا باپ بھی ہے۔

ولی نے بہت کوششوں کے بعد اس تلخ حقیقت کو جان لیا تھا کہ ہری پور کا سارا میر ذکاء خان جو روشانے کا شوہر ہے وہی جیلینا کا بھی شوہر ہے۔

اسی شام لینڈ کروزر پر میر ذکاء اپنے بچوں اور بیوی کو لینے آیا تھا۔ اس نے شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ ولی نے دیکھا جیسی بے زاری اور نفرت کی لہر اسے دباتا وہ میر ذکاء خان سے بمشکل مصافحہ کر رہا تھا کم و بیش ایسی ہی ناگواری کی واضح جھلک ولی کو میر کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔

ولی کو اپنی نفرت کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی۔ مگر اسے میر ذکاء کی آنکھوں میں ابھرتی سرخی اور لپکتے شعلوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کس وجہ سے اس سے کبدہ خاطر ہو رہا ہے۔

ولی کا جی تو چاہ رہا تھا ابھی وہ ولی میں اس گھمنڈی انسان کے گھمنڈ کو ریزہ ریزہ کر دے مگر اس نے اپنی اس شدید خواہش کو دبایا تھا صرف اور صرف روشانے کی خاطر۔ ہاں روشانے خان کی خاطر ولی خاتون جیلینا

سے کیے گئے عہد سے پھر گیا تھا۔

صرف اس لیے کہ جو روشنی روشانی کی آنکھوں میں اجالک میر ذکاء کو دکھ کر پھوٹ پڑی تھی اس روشنی کی چمک و ہلاکت کو بہت عزیز تھی۔ عزیز تر تھی یہ روشنی یہ اجالا سا جو روشانی کے چہرے پر کچھ لمحوں کے لیے بکھرا تھا اسی اجالے اور تابانی نے اسی ایک لمحے میں دلی کے دل پر نہ جانے کیسے کیسے انکشاف کیے تھے۔

”روشانی خان میر ذکاء کی محبت میں مبتلا ہے۔“ دلی نے صرف ایک بل میں گویا روشنی کے چہرے کا حرف حرف پڑھ لیا تھا۔ یہ ایسا انکشاف تھا جس سے روشانی اور میر ذکاء دونوں ہی ناواقف تھے اور یہ کیسی عجیب بات تھی کہ دلی حاکم اس ”بھید“ کو جان چکا تھا۔ جوتے برسوں میں میر ذکاء نہیں جان پیا تھا۔ ”میں روشنی کو کسی عذاب مسلسل سے دوچار نہیں کر سکتا جی! میں روشنی کو اس کے شوہر کی اصلیت نہیں بتا سکتا۔ میں تمہارے بچے کا حق میر ذکاء سے نہیں لے سکتا۔ اگر ایسا کروں تو روشنی کے دل پر عذاب اتر آئیں گے۔ وہ اپنے شوہر کی بے وفائی کا دکھ شاید برداشت نہ کر سکے۔ مجھے معاف کرنا جی! میں بد عہد ہوں۔“

وہ متحسوسوں کے زیر اثر تھا۔ روشنی جاچکی تھی۔ اسے جانا ہی تھا۔ وہ تو صرف دلی حاکم ہی ایک موڑ پر ایک مرکز پر ٹھہر چکا تھا۔ اور کسی راستے کی تلاش میں اچھی دیکھ کے چور ہوں پر ٹھک رہا تھا۔

”ہری پور میں کیسا سانحہ وقوع پذیر ہو گیا ہے۔“ شانی بے حد پریشانی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ ”میر ذکاء خان کو چوری اور عروس نامی ریکس زاوی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور اس قدر اثر رسوخ کے باوجود بات دہنے کے بجائے اخباروں کی نینت بن گئی ہے۔“ دلی نے صائی کے ہاتھ سے اخبار پکڑ کر

کھولا۔ ”سرور میر ذکاء خان اپنی سرداری کی آڑ میں چوری جیسے جرم میں ملوث تھے۔ پورے علاقے میں امن و امان کی صورت حال تشویش ناک تھی۔ آئے دن ڈکیتی چوری کی وارداتیں عام ہو رہی تھیں۔ ان کا اصطبل اعلا نسل کے قیمتی گھوڑوں سے بھرا ہوا ہے جو کہ ان کے خادم خاص مختلف اوقات میں نہ جانے کس کس علاقے سے چوری کر کے لائے تھے۔ علاوہ ازیں اپنی دوست کے ساتھ کوئٹہ سے واپسی پر ڈرائیور تک گوران کسی جھگڑے کی بنا پر شدید اشتعال کے عالم میں انہوں نے عروس نامی عورت پر گولی چلا دی تھی۔ تفصیل کچھ یوں ہے۔“ دلی اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ اخبار والے مبالغہ آمیزی کی حد کر دیتے ہیں۔ چاہے ذکاء بھائی میں بے شمار برائیاں موجود ہیں مگر یہ چوری کا الزام سراسر جھوٹا ہے۔“ شانی نے سر جھٹک کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مگر غور طلب بات تو یہ ہے کہ ان کے علاقے میں موجود تھاں میں کوئی ایسا سوہا ہے جس نے ایف آئی آر درج کروائی ہے۔“ صائی پر سوچ انداز میں بولا۔ ”کسی میں اتنی جرأت نہیں۔ یہ کوئی گھر کا بھیدی معلوم ہوتا ہے یا پھر کوئی قریبی دوست جو کہ دوستی کی آڑ میں دشمنی دکھا گیا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے!“ دلی بھائی نے شانی کو مخاطب کیا تو وہ پر سوچ انداز میں بولی۔

”ذکاء بھائی کے یقیناً دوست تو بے شمار ہوں گے البتہ سبطین خان ان کا بہت قریبی دوست ہے کیونکہ اگر وہ اتنا خاص نہ ہوتا تو اسے ذکاء بھائی کبھی بھی ازبک ہاؤس لے کر نہ آیا کرتے۔“

”سبطین خان یہ یہ کہاٹ کا رہنے والا ہے نا!“ دلی کچھ سوچ کر حیرانی سے بولا۔

”ہوں۔ شاید۔“ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”آپ سبطین خان کو جانتے ہیں؟“ ”ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ جس کمپنی سے میں پہلے منسلک تھا وہیں سے مجھے ایک بہت بڑے

پراجیکٹ کی آفر ملی ہے۔ پہلے میں نے اس آفر پر غور کرنا مناسب نہیں کیا تھا کیونکہ پراجیکٹ کا تعلق ہری پور کے علاقے سے تھا۔ وہاں ایک فروٹ فارم کی بلڈنگ بنائی جانی تھی۔ اور اس فروٹ فارم کو میر ذکاء اور سبطین خان بنوانا چاہ رہے تھے۔ مگر اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے پاکستان میں رہنے کے عرصے میں مصروف رہنا چاہیے۔“

”تو دلی بھائی! کیا آپ ہری پور جائیں گے۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ آپ وہاں جا کر دیکھیے گا کہ روشنی کس مشکل دور سے گزر رہی ہے اور اب جو یہ ایک اور قیامت منتظر ہے نہ جانے روشنی کیسے ان حالات کا سامنا کر پائے گی۔“ شانی ایک مرتبہ پھر رونے لگی تھی۔ ”نہ جانے میری اتنی پیاری بہن کے نصیب میں کیسے کیسے امتحان لکھے گئے ہیں۔“

”تم کیوں اس قدر فکر مند ہو رہی ہو۔ بس روشنی کے لیے دعا کرو۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔“ ”میں ہوں۔ اگر روشنی اتنی مضبوط نہ ہوتی تو اب تک ٹوٹ پھوٹ کر مٹی میں مل جاتی۔“ شانی رنجیدگی سے کہا۔

دلی حاکم کا دل اور بھی بو جھل ہو گیا تھا۔

میر ذکاء خان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس خبر نے پورے علاقے پر مہیب سناٹا طاری کر دیا تھا۔ ابھی تک ایف آئی آر درج کروانے والے گنام آدمی کے نام کے علاوہ کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اورنگ زیب خان غصے اور اہانت کے احساس کے زیر اثر بھڑبھڑا رہے تھے۔

زنان خانے میں گویا صف با تم بچھی تھی۔ ذکاء خان کی گرفتاری کی خبر نے روشنی کو بیک وقت ”غم“ اور نفرت کے احساس سے روشناس کروایا تھا۔ وہ دونوں ہی بھیا تک جرائم کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے تھا۔

اور روشانی خان نے اس کی گرفتاری کے اول روز ہی ذکاء خان کی پچاسی کی خبر سننے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ وہ کسی بے رحم انسان کے لیے اللہ سے رحم کی دعا نہیں مانگے گی۔

وہ اپنی سوچ کو مضبوطی بخش رہی تھی۔ اورنگ زیب خان کے اڑی چوٹی کے زور کے باوجود ضمانت تک نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا خاندانی وقار مٹی میں مل گیا تھا۔

اسے پشاور جیل میں رکھا گیا تھا۔ کیونکہ عروس کے وارثوں کا تعلق پشاور سے تھا اور انہوں نے وہیں مقدمہ درج کروایا تھا۔ عروس کے خاندان والے کسی صلہ کسی معافی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اور پھر اسی چوٹ نے اورنگ زیب خان کو خدا کے حضور سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ غرگزار ہے تھے۔ رو رہے تھے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہے تھے۔

قیلے کی سرداری کا مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ اصولاً زور خان کے سرپرستار رکھنی چاہیے تھی۔ مگر اورنگ زیب خان نے زری خان کو اس سعادت سے محروم کر کے زخام خان کا نام لے لیا تھا۔

زخام خان بہت قابل اور ذہین تھا۔ مگر اس نے سردار بننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ اعلا تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے تمام انتظامات مکمل تھے۔

حیرانی کی بات یہ تھی زخام خان کو ناپسند کرنے والی بی جانان اور دیگر خواتین بھی زری خان کے بجائے زخام خان کو سردار بنانا چاہتی تھیں۔ کوئی بھی زری خان کو پسند نہیں کرتا تھا۔

سب کے نزدیک وہ سرکش، خود غرض اور نافرمان تھا۔ جبکہ بلاؤٹی حیران تھی۔ وہ ان لوگوں کی پرکھ پر حیران تھی۔

ذکاء خان کی گرفتاری کے بعد جب پھر اسکول جانے لگی تھی۔ ماہی اور ماہ نور دونوں انہی بہت چھوٹی تھیں۔ دلی بھائی کی آمد کے ساتھ اس کے بہت سے

مسائل حل ہو گئے تھے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ملازم نے اسے ایک خط لاکر دیا تھا۔

”میر سائیں کا خط ہے۔“

”اللہ خیر۔“ روشی نے دھڑکتے دل کے ساتھ خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

”غیر دہن، سیمیں بدن اسے جان من! بڑا اونچا اڑنے لگی ہو۔ کیا مجھ پر فاتحہ بڑھ لی ہے کہ لوٹ کر نہیں آؤں گا؟ جیل ہے اور جیل سے آزادی ناممکن نہیں۔ تم زرا متنبہ کر رہو۔ اور یہ تمہاری ایس ممی کا بھائی ہری پور میں گھاس چرنے آیا ہے۔ اور میرے گھر کے معاملات اس کے ساتھ ڈسکس ہونے لگے ہیں۔ مہمان خانے میں رہ کر وہ وصول جھوٹک رہا ہے سب کی آنکھوں میں۔ سبطین خان کے تو میں نے ہوش ٹھکانے لگا دیے ہیں۔ آیا تھا ملاقات کے لیے۔ ہمیں کسی ولی حاکم سے فروٹ فارم والا پروجیکٹ مکمل نہیں کروانا۔ وہ واپس کیوں نہیں گیا۔ جب دوبارہ اسکول جانے لگی ہے۔ تم ہٹ و ہرم خندی اور ڈھیٹ ہو۔ میں تمہارے سارے بل نکال دوں گا۔ ذرا ہر تو آ لینے دو۔“

”یہ مجھے کون؟ جو اسے ساری خبریں پہنچا رہا ہے۔“

ولی حاکم ایک ہفتہ پہلے ہی تو آیا تھا۔ ممانے ان کا استقبال بہت اچھا کیا تھا۔ انہیں روشی کا رشتہ دار سمجھ کر خوش آمدید کہا گیا تھا۔ وہ اتنا نفیس مزاج، اعلا اخلاق کا مالک تھا کہ مہمانوں نے کئی مرتبہ حسرت سے اسے دیکھا تھا۔ شاید ان کے دل میں یہ خواہش اٹھ آئی تھی کہ یہ شاندار سا باندھ ان کا داماد ہو گا۔

روشی کو ولی بھائی سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ بغیر کہے ہی واپس جا رہے تھے۔ جانے سے ایک دن پہلے انہوں نے روشی سے کہا۔

”روشانے! تمہیں ان حالات کا سامنا بہت بہادری سے کرنا ہو گا۔ ذکا خان کو باہر آتے نہ جانے کتنے سال لگ جائیں۔ بہر حال اس پر بہت مضبوط کیس ہے۔ مقابلہ پارٹی بھی کم نہیں۔ تم اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دو۔ ان کی بہترین تربیت کرو۔ انہیں اس جاگیر واری نظام کا حصہ نہ بننے دینا۔ انہیں کامیاب انسان بنانا۔ میں نے ان چند دنوں میں یہاں کے پورے سسٹم کا جائزہ لے لیا ہے۔ یہ کیسی دیمک ہے جو یہاں کی نسلوں کو چاٹ رہی ہے۔ عورت جو ہر روپ میں قابل احترام ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنی بہنوں، بیٹیوں کے لیے ایک ایک قبر کھود رکھی ہے جس میں وہ گھٹ گھٹ کر مر رہی ہیں۔ میں خود بھی آزادی نمافاشی کے حق میں نہیں ہوں، مگر اس طرح ایک عورت کو ایک بچی کو بنیادی حقوق سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہے۔“

دیکھو روشی! ہمارے درمیان نہ کل کچھ تھا نہ آج کچھ ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میری آمد کے ساتھ ذکا کی مایا زاونہوں نے کچھ داستانیں بنائی ہیں۔ کوئی بھی طوفان روشانے کی ہستی کو کسی شمس کر کے اس سے پہلے مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

اور یہاں روشانے! اشانی کی شادی میں تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک۔ بہر حال مصروفیت میں شادی کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اب سوچ رہا ہوں۔ کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرتا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لیے مجھے تمہارا تعاون چاہیے، اور روشی! میں تم سے ایک عہد لے رہا ہوں۔ اس عہد کا پاس رکھنا۔ کسی اور کو کل زبا اور گل مالا بننے مت دینا۔ گل افشاں کی طرح کسی اور کے دامن میں زلت اکٹھی نہ ہو۔ کوئی اور گل افشاں گھر کے ملازم کے ساتھ نہ بھاگے۔“

وہ اتنا درد بھرا دل رکھنے والا ولی حاکم اسی شام واپس لوٹ گیا تھا۔ اور ایک عہد کی دُور اس نے روشی کے ہاتھ میں تمنا دی تھی۔ اور روشی نے دل سے اس

عہد کی پاس داری کا عہد کیا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں غم تھی جب ملازمہ نے روشی کو چند چیزیں تھماتے ہوئے کہا۔

”یہ مہمان سائیں یہاں بھول کر چلے گئے ہیں۔ ان کی ایک قمیص بھی ادھر رہ گئی ہے۔ وہ بہت جلدی میں تھے اور انہوں نے شفاہی (ملازمہ) سے سلمان بیگ میں رکھنے کے لیے کہا تھا، مگر شفاہی نے شاید دھیان نہیں دیا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں ان کی چیزیں ایسٹ آباد شانی کو بھیجا دوں گی۔“ روشی نے لاروائی سے شاپر پلنگ پر رکھ دیا۔ پھر مہمانوں کے پکارنے پر باہر نکل گئی۔

واپس آئی تو مانی اور ماہ نور دونوں شاپر کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔ ایک مردانہ قمیص، ہیر پریش اور پرنیوم کی بول قلین پر بیڑی تھی۔ اب وہ دونوں اس چھوٹے سے سیاہ رنگ کے مردانہ پرس کو ایک دوسرے سے چھین جھٹ رہی تھیں۔ پرس کی شاید زپ بھی ان دونوں نے کھول لی تھی، بھی تو بلی کے کئی کاغذات بھی قلین پر پڑے دکھائی دے رہے تھے۔

روشی انہیں دیکھتے ہوئے چیزیں سمجھنے لگی۔ کاغذات میں سے ایک تصویر نکل کر بیچے گر گئی۔ روشی نے تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ کسی انگریز لڑکی کی تصویر تھی۔

”اوہ تو یہ ولی بھائی کی پسند ہے۔“

نہ جانے کیوں ایک پل کے لیے دل میں کسک سی ہوئی تھی۔ مگر دوسرے ہی بل وہ خود کو ملامت کرنے لگی۔ ”کیا میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ اتنا پارا شخص میرے جوگ میں تمام عمر تنہا رہے۔ زندگی کے سفر میں ایک ساتھی کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے جسے آپ کا ساتھ ملے گا۔“

وہ تصویر پرس میں رکھتے لگی تو تصویر کی پشت پر لکھے نام کو دیکھ کر زبان و مہکان اس کی نظروں میں چھوٹنے لگے تھے۔

”جیلینا ذکا خان۔“ روشی نے پاگوں کی طرح ان کاغذات کو کھول کر دیکھا۔ اس کے بدترین خدشات

کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کاغذات میں نکاح نامہ بھی موجود تھا۔ نکاح نامے پر تفصیلات اور پتا ہری پور کے اسی سردار کے گھر کا تھا۔ روشی کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ میر ذکا سے نفرت کے دعوے کرنے والی اس کی ایک اور منکوحہ کا نام دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

وہ تو آج تک یہ ہی سمجھتی رہی تھی کہ میر ذکا باہر جتنی بھی عورتوں سے ملتا ہے کوئی بھی ان میں سے اس کی برابری نہیں کر سکتی، مگر ایک فرنگ اسے اپنے برابر میں کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔ آج روشی کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ باہر کی ان تمام عورتوں سے بھی بدتر ہے جن سے ذکا خان کے روابط تھے۔

وہ کیسے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھری تھی کہ خود کو سیٹھا محال تھا۔ تمام رات روتے روتے تڑپتے زلزلے تھی۔ زخام باہر جا چکا تھا۔ زردس خان کو قہقہے کا سردار بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے سردار بننے ہی زندگی نے ایک اور بھیا تک رخ دیکھ لیا۔

زردس خان نے گل افشاں اور گلریز خان کو بھونڈ کر قتل کروا دیا تھا۔ پھر اس نے منان، حنان، سجان اور ربان کو کانٹوں سے اٹھوا کر علاقے کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیا۔ جب کے اسکول جانے پر پھر سے پابندی لگ گئی۔ اس کے آٹھویں کے امتحان ہونے والے تھے۔

روشی غم و غصے سے پاگل ہو گئی تھی۔ اور اسی اشتعال کے عالم میں وہ زردس خان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ گویا روشانے کا ہی منظر تھا۔

”غصہ مت کرو بھرجانی! اسکول سے بات سنو میری۔“ وہ بہت قہقہے سے مٹھاس بھرے انداز میں اسے سمجھانے لگا تھا۔

”میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں، مگر اپنے بچوں کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتی۔“ وہ گویا پھٹ پڑی۔

”بھرجانی! قہقہے سے بات سنو۔ حالات بہتر نہیں ہیں۔ عروس کے گھر والے ہمارے خون کے پیاسے

ہیں اور میرزہ کاؤ کے بچوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جب کو قطعاً اسکول مت بھیجنا ورنہ ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا ہمیں۔“ وہ رسائیٹ سے گویا ہوا۔

”اونہ! اتنے ہی وہ لوگ غیرت مند ہیں تو معصوم بچوں کے بجائے میرزہ کاؤ کے گریبان پر ہاتھ رکھیں۔ بزدلوں کی طرح کے ہیل مجھے کسی خوف میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ میرے بچے ضرور پڑھیں گے۔“ اس کا انداز اہل تھا۔

”ٹھیک ہے بھرجائی! میں تو اپنے بھائی کی بچی کبھی عزت و ناموس بچانے کی غرض سے کہہ رہا تھا۔ جیل جا کر اس نے ہمارے حسب نسب کو مٹی میں رول دیا ہے۔ اب اگر کوئی نقصان ہو گیا تو شرم سے کہیں منہ چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔“

وہ اتنے آرام سے مان جائے گا۔ روشی کو قطعاً امید نہ تھی مگر اب۔۔۔

روشی مطمئن ہو گئی تھی۔ جب پھر سے اسکول جانے لگی تھی۔ اس کے آنکھوں کے فاصل امتحان ہو گئے تو روشی نے سکون کا سانس لیا۔

ماوی کے ہاں بیٹی کی ولادت ہوئی تھی۔ خنیا بھی تین بیٹوں کی ماں بن چکی تھی۔

روشی نے ولی حاقان کا سامان واپس بھجولایا تو اس کی کال آگئی۔ بہت عرصے بعد وہ ان کی آواز سن رہی تھی۔

”روشی! تم نے میرے سامان کو کھول کر دیکھ لیا ہے نا؟ وہ بڑے وقت سے کہہ رہا تھا۔“

”نہیں ولی بھائی!“ اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

”مجھے یقین ہے روشی کہ تم نے اس حقیقت کو جان لیا ہے جو میں تم سے چھپانا چاہتا تھا۔“ وہ اپنی افسردگی چھپا نہیں پایا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں جانا۔ سب کچھ جان کر بھی۔“

اس کی آواز میں بہت مضبوطی تھی اور ولی حاقان اس ہماڑوں جیسی بلند روشانے کے حوصلوں کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

”روشی! اگر اب بات کھل چکی ہے تو مجھ پر اور جھیلنا پر ایک احسان کرو۔“

”کیسا احسان؟“ اس نے خیرانی سے پوچھا۔

”اپنے عزت و ناموس پر شوہر سے جیلی کو قانوناً طلاق دلوا دو۔ میرا مطلب ہے کہ ذکاؤ خان سے کہو جیلی کو طلاق تحریرا دے۔“

”طلاق۔۔۔ تو کیا جیلی طلاق لینا چاہتی ہے؟“

”ہاں! وہ کسی منافع اور دوٹو انسان کے نام پر زندگی کیوں گزارے۔ اس کے باوجود کہ جیلی کا ایک بیٹا بھی ہے۔“

”بیٹا۔۔۔ تو کیا ذکاؤ خان کی اور اولاد بھی موجود ہے۔“

روشی کا دل کسی پال میں گر رہا تھا۔

”پہلے میں نے یہ سوچا تھا کہ جیلی سے جھوٹ بول دوں گا کہ مجھے ذکاؤ خان کا اتنا پیار نہیں مل سکا مگر میں اس معصوم کو مزید دھوکے میں نہیں رکھ سکا۔ میں اسے سب کچھ بتا چکا ہوں اور بحیثیت مسلمان کے جیلی طلاق کے بعد میرے ساتھ نکاح پر رضامند ہے۔ مجھے یہ معاملہ تمہارے علم میں لانا پڑا تھا۔ میں جیلی کی تصویر اور نکاح نامہ جان بوجھ کر ہاں پھوڑ کر آیا تھا۔ میں نے تمہیں دکھ دیا ہے روشی! مجھے معاف کر دینا۔ کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔“ وہ شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

”احسان تو آپ نے مجھ پر کیا ہے ولی بھائی! ورنہ میں تمام عمر خوش فہمی میں ہی مبتلا رہتی۔ سر حال آپ جانتے تو ہیں ذکاؤ خان جیل میں ہے۔ اور عفریہ شاید شہادت ہو جائے۔“

”اوکے روشی! اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا! اللہ حافظ۔“

”اللہ سائے۔“ اس نے منقطع ہو چکی تھی۔ اور روشی کسی شمع کی مانند لمحہ۔۔۔ لمحہ کھلنے لگی تھی۔

چند دن بعد جبہ کار زلٹ حسب معمول شان دار آیا تھا۔ وہ اب پھر سے اسکول جانے لگی تھی۔ ایک دن صبح سبطین خان آگیا۔ اس نے روشی سے شمالی میں ملنے کی بات کی۔ ممانے زنان خانے کا ڈرائنگ روم کھلوایا تھا۔ سبطین خان، میرزہ کاؤ کا پیغام لایا تھا۔ روشی بڑی سی چادر میں خود اپنے اندر آئی تو سبطین خان احترازا کہہ اٹھا۔

”اسلام علیکم بھرجائی!“

”وعلیکم السلام۔“ وہ نشست پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بھرجائی! یہ میرا کا خط ہے۔“ اس نے جیب میں سے ایک سفید لفافہ نکل کر روشی کی طرف بٹھادیا۔

”آپ یہیں بیٹھ لیں اور مجھے جواب دیں۔“

”میں کھنڈہ لقمہ منگوالوں۔“

”نہیں آپ نے جو کچھ کہنا ہے مجھے بتادیں۔ میں فون پر ذکاؤ سے بات کروں گا۔“

روشی نے اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اس دفعہ کی تحریر پہلے سے مختلف تھی۔

”روشانہ! ان تارخوں میں جب کہ اسکول میں مت بھیجنا۔ کچھ دنوں کے لیے اسے گھر بٹھاؤ۔ اسے میری درخواست سمجھ لینا ضدی عورت! میرا دشمن عفریہ بہت گمراہ وار کرنے والا ہے۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ اپنا خیال تو تم بہت اچھی طرح رکھتی ہو۔ کہنے کی ضرورت نہیں، آخر لوگوں سے تعریفیں جو وصول کرنی ہوتی ہیں۔ لوگوں کی ستائش بہت عزیز ہے تمہیں کہ سات بچوں کی ماں تو نہیں لگتی روشانہ۔ ماہی اور ماہ نور کو کیا روٹنا۔ چھوٹی دونوں جیل میں بہت یاد آتی ہیں۔ سبطین خان کو جواب دے دو۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ خان کو بتادیں جب اسکول نہیں جائے گی۔“

”شکر ہے بھرجائی! اب چلتا ہوں۔“

”آپ کچھ دیر ٹرک سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔“ کچھ سوچ کر روشی آہستگی سے بولی۔

”کیوں نہیں، آپ کہیے۔“

”خانیہ پر جو الزام ہیں کیا وہ سچ ہیں۔“

”کمال سے بھرجائی! آپ بھی مشکوک ہیں۔“ وہ بڑے ساف کے عالم میں بولا۔

”سوال کی امید نہیں تھی۔“

”مگر یہ الزام سچ نہیں ہیں تو خان ان کی تردید کیوں نہیں کرتا۔ وہ تو یوں لگتا ہے اقبال جرم کیے بیٹھا ہے۔“ روشی بڑبڑاتی ہوئی۔

”ایک دن سچائی سب پر واضح ہو جائے گی۔ آپ بھی کچھ انتظار کیجیے۔“

”یہ عروس کا کیا معاملہ ہے؟“

”سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ اس دفعہ معاملہ جرگے کے پاس نہیں قانون کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ بھی ذکاؤ خان کے دشمن کی ایک چال ہے۔ کیونکہ جرگہ والوں کی جرات نہیں تھی کہ سردار پر انگلی اٹھاتے۔“

”اگرچہ سردار کتنا ہی بے انصاف اور جابر کیوں نہ ہوتا۔“ وہ کھیلے لہجے میں بولی۔

”میرزہ کاؤ خان کی خوش نصیبی پر ہر لحاظ سے رشک آتا ہے مگر یوں لگتا ہے وہ آپ کا اعتماد جیتنے میں ناکام رہا ہے۔“ سبطین خان مبسم سا مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”بچوں کا خیال رکھیے گا بھرجائی! میرے بچوں کی بہت فکر تھی۔ چلتا ہوں اللہ حافظ۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہر نکل گیا تھا۔

”اونہ! ناکام تو تب ہو تا جب اعتماد جیتنے کی کوشش کرتا۔ اسے اور عورتوں کی قربتوں سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی جو میری طرف متوجہ ہوتا۔“ وہ سلگتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”خانیہ پر جو الزام ہیں کیا وہ سچ ہیں۔“

”کمال سے بھرجائی! آپ بھی مشکوک ہیں۔“ وہ بڑے ساف کے عالم میں بولا۔

”سوال کی امید نہیں تھی۔“

”مگر یہ الزام سچ نہیں ہیں تو خان ان کی تردید کیوں نہیں کرتا۔ وہ تو یوں لگتا ہے اقبال جرم کیے بیٹھا ہے۔“ روشی بڑبڑاتی ہوئی۔

”ایک دن سچائی سب پر واضح ہو جائے گی۔ آپ بھی کچھ انتظار کیجیے۔“

”یہ عروس کا کیا معاملہ ہے؟“

”سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ اس دفعہ معاملہ جرگے کے پاس نہیں قانون کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ بھی ذکاؤ خان کے دشمن کی ایک چال ہے۔ کیونکہ جرگہ والوں کی جرات نہیں تھی کہ سردار پر انگلی اٹھاتے۔“

”اگرچہ سردار کتنا ہی بے انصاف اور جابر کیوں نہ ہوتا۔“ وہ کھیلے لہجے میں بولی۔

”میرزہ کاؤ خان کی خوش نصیبی پر ہر لحاظ سے رشک آتا ہے مگر یوں لگتا ہے وہ آپ کا اعتماد جیتنے میں ناکام رہا ہے۔“ سبطین خان مبسم سا مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”بچوں کا خیال رکھیے گا بھرجائی! میرے بچوں کی بہت فکر تھی۔ چلتا ہوں اللہ حافظ۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہر نکل گیا تھا۔

”اونہ! ناکام تو تب ہو تا جب اعتماد جیتنے کی کوشش کرتا۔ اسے اور عورتوں کی قربتوں سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی جو میری طرف متوجہ ہوتا۔“ وہ سلگتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”خانیہ پر جو الزام ہیں کیا وہ سچ ہیں۔“

”کمال سے بھرجائی! آپ بھی مشکوک ہیں۔“ وہ بڑے ساف کے عالم میں بولا۔

”سوال کی امید نہیں تھی۔“

”مگر یہ الزام سچ نہیں ہیں تو خان ان کی تردید کیوں نہیں کرتا۔ وہ تو یوں لگتا ہے اقبال جرم کیے بیٹھا ہے۔“ روشی بڑبڑاتی ہوئی۔

”ایک دن سچائی سب پر واضح ہو جائے گی۔ آپ بھی کچھ انتظار کیجیے۔“

”یہ عروس کا کیا معاملہ ہے؟“

”سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔ اس دفعہ معاملہ جرگے کے پاس نہیں قانون کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ بھی ذکاؤ خان کے دشمن کی ایک چال ہے۔ کیونکہ جرگہ والوں کی جرات نہیں تھی کہ سردار پر انگلی اٹھاتے۔“

تھا۔ اس خبر نے پورے زمان خانے میں کھرام مچا دیا۔
روشی اپنی بیٹی کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ رو رہی تھی گڑگڑا رہی تھی۔

اور دوسرے زکاء کا جیل سے فون آیا۔

”ہٹ دھرم عورت! اگر میری بیٹی شام سے پہلے گھر نہ آئی تو پوری ہستی کو آگ لگا دوں گا۔“

روشی فون سن کر لبرار زمین پر آگری۔ گھر میں صاف ماتم پکھی ہوئی تھی۔ زخام کو بھی اطلاع مل گئی تھی اور سہ پہر کو وہ بھی لوٹ آیا تھا۔ زروس خان اپنا سارا رسوم استعمال کر چکا تھا۔ میر اورنگ زیب تو پورے قد سے ڈھے چکے تھے۔ مزید ذلت اٹھانے کا ان میں حوصلہ نہیں تھا۔ تب ہی صدمے سے مدھمال روشی کو بخورنے آکر کہا۔

”بی جان! آپ کو بلارہی ہیں۔“ روشی تھکے تھکے قدم اٹھائی بی جان کے کمرے میں آئی۔

روشی میکا کی انداز میں چلتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ بی جان بول نہیں سکتی تھیں مگر اشارے سے اسے کچھ سمجھا رہی تھیں۔ شاید تسلی دینا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا رزنا کا پتہ ہاتھ روشی کے سر پر رکھ دیا تھا۔ بارہ سالوں میں پہلی مرتبہ اپنی سگی نالی کی طرف سے یہ تسلی نما شفقت روشی کے حصے میں آئی تھی۔ بی جان غول غول کرتی نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنی ملازمہ خاص جنجور کو بلایا اور جنجور ان کی آنکھوں کے اشارے سمجھ کر سر ہلا رہی تھی۔ بی جان نے پھر سے روشی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”ہم نے سوچا تھا احمد خان کی بیٹی وہ دن بھی یہاں تک نہ پائے گی مگر تم نے ہمارے اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ ہم تمہارے متحرف ہیں، اور مان گئے ہیں کہ احمد خان کی بیٹی قول کا پاس اور دستار کا بھرم رکھنا جانتی ہے۔ تم پر ایک امتحان آیا ہے بیٹی! اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔ وہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ جھکنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“ بخور بتا رہی تھی۔
ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ روشی

ان کی پانچٹی سے سر نہکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اور پھر مغرب سے کچھ پہلے انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لی تھیں۔

اسی وقت جب بھی گھر آئی۔ زخام کے بازو کے گھیرے میں خوف زدہ سی جبہ کو روشی نے چھپ کر سینے میں بچھ لیا تھا۔

”زری خان جبہ کو لے کر آیا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔



زری خان کی ہر طرف دھوم تھی۔ اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی اینٹ کے انتظام سنبھال لیے تھے۔ گل افشاں اور گلرین خان کو قتل کروانے کے بعد پورے علاقے میں ویسے بھی اسے پسندیدگی کی سند مل چکی تھی۔ اب علاقے میں امن و امان کی صورت حال نظر آرہی تھی۔ چوری، ڈکیتی جیسی وارداتیں اور آئے دن کے جھگڑے اور قتل و غارت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

ایک دن زری خان نے روشی سے کہا۔

”میں ان تمام فرسودہ رسومات کا خاتمہ کروں گا بھرجانی! تم کو یہ بتانا۔“

اور روشی واقعی حیران تھی۔ زری خان نے غلے طبقے کے مزارعوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو زرعی زمین میں سے کچھ حصہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے بستی کے کئی غریب گھرانوں کی گفتات کا یہ نہ اٹھایا۔ گھر میں ملازمین کی فوج میں کمی ہو چکی تھی۔ زری خان بے جا اسراف کے حق میں نہیں تھا۔ نوکروں پر اٹھائے جانے والے اخراجات سے ایک عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ یہ ایک مدرسہ کی عمارت تھی جہاں بچیوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا تھا۔

ان سب کوششوں کے باوجود زری خان اپنے پیاروں کے دلوں میں اپنے لیے محبت کی جوت نہیں چگا سکا تھا۔ ماما اور بابا جان اب بھی اسے دیکھ کر منہ موڑ لیتے تھے۔ بابا جان اب مستقل گھر میں قیام کرتے تھے۔ ان کی صحت پہلے سے کافی بہتر تھی۔ مگر وہ ابھی مکمل طور پر صحت مند نہیں تھے۔ مہرا فزوں ساری دنیا

بھلائے شوہر کی خدمت میں جتنی تھیں۔

زخام نے اینٹ آباد میں ایک گھر خرید لیا تھا۔ کانوٹ سے منان، ریان، سبحان اور حنان کو اٹھوایا گیا تھا۔ اب وہ اپنے چاچو کے پاس رہتے تھے۔ جبہ کو بھی زخام اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ خود انہیں اسکول سے لے کر آتا تھا اور خود چھوڑ کر آتا اور بچوں کی کامیابیوں سے روشی کی سانسیں جڑی تھیں۔



ابھی تک کیس کی سماعت شروع نہیں ہو سکی تھی اور سبطین خان کا خیال تھا کہ کسی اثر و رسوخ والے آدمی نے سماعت روک رکھی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ مقابل پارٹی فیصلہ سننے کے حق میں نہیں ہے۔ اور جان بوجھ کر طول دے رہی ہے، حالانکہ تین سو دھکے مقامات کے فیصلے جلد کیے جاتے تھے۔

ان ہی دنوں روشی نے میر زکاء کو خط لکھا۔

”زکاء خان! سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدا دعائیہ کلمات سے کروں، تمہارے لیے دعا لکھوں یا بددعا۔ اگر تم میرے سہاگ نہ ہوتے یا میرے بچوں کے باپ نہ ہوتے تو میں کبھی بھی تمہارے پینے کی دکان نہ کرتی۔ اب یہ دعائیں جو میں تمہارے لوٹ آنے کے لیے کرتی ہوں، وہ صرف میری مجبوری ہے، خواہش یا چاہ نہیں۔ بہر حال تم میرے بچوں کے باپ ہو اور میرے بچے تمہارے آنے کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہے ہیں۔ یہ مت سمجھنا تمہارے فراق میں پاگل ہو کر خط لکھ رہی ہوں۔ بات تو فقط اتنی ہے کہ اس لفافے میں موجود ایک عدد طلاق نامہ ہے۔ اس پر دستخط کرو۔ خط میں موجود ایک تصویر بھی ہے۔ اگر بھول گئے ہو تو تصویر دیکھ کر تمہاری یادداشت لوٹ آئے گی۔ تیرہ سالوں سے ایک معصوم لڑکی کو تین لفظوں میں باندھ رکھا ہے۔ واپس آتے ہوئے اسے آزاد کیوں نہیں کیا تھا؟ عجیب انگریز عورت ہے جو انتظار لا حاصل میں عرض خلع کر رہی ہے۔ خوش قسمت ہو تم۔ باوقاف عورتوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے

تمہیں۔“

روشی نے دو چار لفظ گھسٹ کر خط پیام پر کودے دیا تھا۔ دوسرے دن وہ جواب لے کر بھی آگیا۔ روشی نے لفافہ چاک کر کے خط کو کھول کر بے صبری سے پڑھنا شروع کیا۔

”دو تیرہ سال بعد اگر خط لکھ ہی دیا تو اتنے پتھر مارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ویسے بھی آج کل میرے ستارے گردش میں ہیں۔ سیدھا کام بھی اٹھائی ہوتا ہے۔ اور یہ کس حسینہ کی تصویر بھیجی ہے۔ خدا کی قسم! دل باغ باغ ہو گیا ہے دیکھ کر۔ کمال کا شاہکار ہے۔ اس سفید کبوتری کی تصویر اور یہ طلاق نامہ! یا رب! بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ میں تو پہلے ہی دشمنوں کی سازش کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔ اور پوری یکسوئی کے ساتھ ان ابھی گتھیوں کو سلجھانا چاہ رہا تھا۔ مگر تم اب نیا کھانا کھول بیٹھی ہو۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے میری جدائی میں واقعی تمہارا داغ چل گیا ہے۔ میری جان کے عذاب، میری زندگی کے ناسور۔ میری آنکھ کے خواب، صبح کو خیر کے متباب! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اپنے داغ میں تو کوئی بات نہیں سائی۔ تم ہی کچھ سمجھاؤ۔ یہ سفید کبوتری آخر ہے کون؟“

”اؤ نہ! اعتراض بہت اچھے طریقے سے سمجھاؤں گی کہ یہ سفید کبوتری کون ہے؟“ روشی نے غصے کے عالم میں خط کو پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اب وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے دلی بھائی کو فون کیا۔

”آپ کا کیا خیال تھا کہ زکاء خان اتنی آسانی سے تسلیم کرنے والا ہے۔ وہ صاف مکر چکا ہے کہ وہ کسی جیلینا کو جانتا تک نہیں۔“

”اب کیا ہوگا۔“ دلی بھائی بھر کو خاموش ہی رہ گیا۔

”جو میں چاہوں گی وہی ہوگا۔“ روشی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اپنے برابر جگہ دے دوں کو تیار ہوں۔“
”روٹی! دلی حاکم دم بخودی تو رہ گیا تھا۔“

زری خان نے جوہی کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ جس نے سنا شہزادہ رہ گیا۔ ریش میں غنغفر علی کو زنان خانے کی خواتین نہیں جانتی تھیں۔ بابا جان اپنے چیک اپ کے سلسلے میں ملک لے رہے تھے۔ ”آٹا“ ”فانا“ اس رشتے کو طے کر دینے کی آخر کیا وجہ تھی۔ روشنی مہار کے آنسو دیکھ کر زری خان سے جواب طلبی کے لیے پہنچ گئی۔ ”بھرجانی! بابا جان کی غیر موجودگی میں جوہی کی شادی ہو جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ وہ اعتراض کریں گے۔ جوہی کی شادی کبھی نہیں ہونے دیں گے۔“ ”مگر کیوں؟“

”وہ اپنی بیٹیوں کے لیے کسی قابل اور شریف انسان کو پسند کر ہی نہیں سکتے۔“ وہ کھیلے لہجے میں بولا۔

”مگر بابا جان ایسا کیوں کرتے ہیں؟“ ”گھر لائی میں جا کر کیا کریں گی۔ بس آپ جوہی کی شادی کی تیاری کریں۔“ زری خان رنجیدگی سے کہتا باہر نکل گیا۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ مہار نے سنا تو غصے سے بلہا انھیں۔

”مہار! غنغفر علی ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ مجھے زری خان نے تصویر بھی دکھائی ہے۔“

”اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ تمہیں زری خان نے بتا دیا ہے۔ وہ کس قدر عیاش آدمی ہے یہ تمہیں اس نے نہیں بتایا ہوگا۔“ مہار نے سختی سے کہا۔

”مہار! وہ کچھ کہنا چاہتی تھی جب مہار نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔“ ”دلدار خان اور حشمت خان ان پر بڑھ ضرور ہیں۔ مگر بے کروار یا بددیانت نہیں۔ ماوی کو بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ کیونکہ شوہر اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ وہ کالوں کا پکا تھا۔ ماں بہنوں کی باتوں میں

آکر ماوی کو کڑوی کسمبلی سنا دیتا تھا۔ مگر وہ شریف اور پاک باز تھا۔ ابھی وقت کی طنائیں حشمت خان کی ماں کے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی وقت بدلے گا۔ ماوی پر بھی سالوں کی رستہ برے گی۔ کیا یہ کم ہے کہ حشمت خان پوری برادری کی مخالفت مول لے کر بچپوں کو بڑھا رہا تھا۔ مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔“ وہ بیٹیوں کے حالات سے اتنی بھی بے خبر نہیں تھیں۔ اسی پل بجور کمرے میں داخل ہوئی۔

”سبطین خان آئے ہیں۔ آپ سے بات کریں گے۔“ وہ مہار فزوں سے کہہ رہی تھی۔

نہ جانے مہار فزوں اور سبطین خان کی آپس میں کیا بات ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”نہ جانے کب میرا بچہ آزاد ہوگا۔“

احمد صاحب نے ذکاء خان کی گرفتاری کی کچھ زیادہ ہی نشین لے لی تھی۔ گل بخت کالوں آیا تھا اور وہ بتا رہی تھی وہ بلہا ہیں۔ انہیں بلڈ پریشر کا مسئلہ تو اکثر ہی رہنے لگا تھا۔ روشنی سنتے ساتھ ہی بے چین ہو گئی۔ فوراً ”مہار سے اجازت لے کر ازبک ہاؤس آئی۔“

احمد صاحب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کی صحت قابل رشک ہو آتی تھی۔ مگر اس وقت وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی صدمے کو اپنے اوپر سوار نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اپنی بیٹیوں کے لیے رنجیدہ تھے۔ شانی کی طرف سے اگر زہنی سکون تھا تو روشنی کی پریشانی انہیں بے چین رکھتی تھی۔ اور گل بخت بتا رہی تھی کہ بابا جان علیزے کی وجہ سے بہت فکر مند ہیں۔ لوگ ان کی بیٹی علیزے کو محض بد صورتی کی وجہ سے ٹھکرا چکے تھے۔

علیزے ”جہ سے کچھ ہی بڑی تھی۔ جہ میٹرک کے پرے چلے چکی تھی۔ ان دنوں زخام انہیں ٹاورن ایریا کی سیر کروانے لے گیا تھا۔ بچے کس قدر خوش تھے، مسرور تھے گویا کسی نفس سے آزادی ملی تھی

انہیں۔ وہ اپنے اس براؤ ماٹھڈ چاچو سے عشق کرتے تھے۔ جو ظاہری طور پر اپنے بھائیوں سے مختلف تھا۔ مگر اس کی سوچ اور اس کا دل بھی بہت مختلف تھا۔

روشنی نے بہت عرصے بعد علیزے کو دیکھا تھا۔ وہ بڑی ہو چکی تھی۔ اس کا قد جب سے کچھ لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ان میں دلن کی طرح ذہانت چمکتی تھی۔ روشنی سے بہت تپاک سے ملی۔

”بچو! آپ تو بھی آئی نہیں ہیں۔ شانی آپ تو ہر روز آتی تھیں۔ اب ناروے چلی گئی ہیں۔ میں ان کے جانے سے اور بھی اکیلی ہو گئی ہوں۔“

”تم ٹھیک تو ہو گئی! روشنی نے اسے پیار سے بانسوں میں سمیٹ لیا۔ اسے علیزے ”جہ کی طرح عزیز تھی۔“

”آپ کی یہ کالی سی گڑیا ٹھیک ہے۔“ ”میں نہیں بولتے میری جان! روشنی پوری جان سے کانپ کر رہ گئی تھی۔ علیزے کے لب و لہجے میں احساس کمتری بول رہا تھا۔

”سب سے پہلی کہتے ہیں۔ کبھی مہی کے ساتھ مارکیٹ چلی جاؤں تو لوگ حیرانی سے مڑ مڑ دیکھتے ہیں۔ ایک دن مولیٰ سی حیرا آئی نے پوچھ لیا تھا یہ آپ کی مہی ہے۔“ وہ لاہروالی سے کہہ رہی تھی۔ ”بچو! میں بابا جیسی ہوتی تو آپ کا بھائی! دادی تو کہتی ہیں مجھے کوئی بیانیہ بھی نہیں آئے گا۔“ اتنی سی عمر میں اسے کیسے کیسے غم اور فکریں چلت رہی تھیں۔

”دادی بھی تپتے حد کرتی ہیں۔“ روشنی تلملا اٹھی۔ ”ایسا مت سوچا کرو، تمہیں کیا خبر کے بعض حسین چہرے کیسے کریمہ اور بد نما ہوتے ہیں۔ خدا کی بنائی کوئی بھی چیز بد صورت نہیں ہو سکتی۔ علیزے خوب صورت ہے بہت ہی خوب صورت ہے۔“

”آئندہ ایسا نہیں کہوں گی۔“ وہ فرماں برداری سے بولی۔

”ہوں۔ گڈ گرل۔“ اس نے علیزے کی پیشانی جوہی کی تھی۔ اشرا اور اشان کلج سے آگے تھے نکلے قد کے تو مگر نوجوان کے روپ میں۔ ان کی مسک بھگ

رہی تھیں۔ وہ اپنے اونچے مضبوط بھائیوں کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔

”کیا وقت اتنی جلدی بیت گیا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے یہ میرے کندھوں پر جھولا کرتے تھے۔ آج مجھے اپنی ہانپوں کے حصار میں لیے کھڑے ہیں۔“

”بچو! تم کہاں غائب ہو جاتی ہو۔ گھڑی دو گھڑی کو صورت دکھا کر۔“ اشان کی محبت بھرے شکوے امر کی ناراضی۔

”تم دونوں نے تو ہری پور کی سڑکیں گھسا دی ہیں۔“

”سچ! آئی! ہم تو روزی آجائے، مگر یہ علیزے کیسے جانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اور اسے گھر میں تنہا بور ہونے کے لیے نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ورنہ یہ سو سائڈ بھی کر سکتی ہے۔“

اشرا نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ابھی وہ کچھ دن اور اپنی بہن اور بھائیوں کے درمیان رہنا چاہتی تھی، مگر مہار فزوں کی فون کال نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔ وہ ماوی اور بابا جان کو لے کر فوراً ”ہی ہری پور روانہ ہو گئی۔“

ادھر جوہی کی شادی کا فنکشن عروج پر تھا۔ اس نے بمشکل مہار کو سمجھایا۔ وہ دہائیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ جبکہ جوہی پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔ ”یہ سب زری خان کا کیا ڈنڈا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ صدمے کی شدت سے پھٹی پھٹی آواز میں بولیں۔

”کم از کم بابا جان کو تو آنے دیا ہوتا۔ کیا ان کی غیر موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔“ وہ زری خان کو دیکھ کر پھٹ پڑی۔

”بابا جان نے آکر کیا کرنا تھا۔ وہ ویسے بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ اب اس بحث کو چھوڑو۔ جوہی کو نکاح کے لیے تیار کرو۔ میں مولوی کو لے کر آتا ہوں۔ ویسے بھرجانی! آج غضب ڈھا رہی ہو۔ کاش! ذکاء خان باہر ہوتا۔“ وہ ایک شرارتی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر باہر نکل گیا تھا۔

”جوہی! روشنی جوہی کو گرتے دیکھ کر سرعت سے

BIG SAVER

Butterfly®

LONG ULTRA NAPKIN



Butterfly Big Saver

سب سے زیادہ جاذب المٹانیکین
استعمال کے دوران آپری سطح خشک رہتی ہے جس کی وجہ سے ریڈیز نہیں ہوتے۔
سب سے زیادہ بچت والا المٹانیکین پیک۔

www.butterfly.com.pk

Santex

اس میں تیرا قصور نہیں۔ تو نے جنم ہی ایسی دو نہر
عورت کے بطن سے لیا ہے۔ اور اس خون کی تاثیر میں
بے وفائی ازل سے گردش کر رہی ہے۔ افسوس کی بات
یہ ہے کہ مہراؤں کا دودھ بھی تمہارے اندر نفرتوں کی
آگ کو کم نہیں کر سکا۔

”کیا اس بند کرو۔“ زری خان چلا اٹھا۔
”تم بالکل حاکم کی اولاد ہو۔ اسی کی طرح بے ضمیر
اور بے غیرت۔“ ذکاء خان کے انکشاف نے روشنائی
سمیت ہر ذی نفس کو پتہ چلا تھا۔ زنان خانے کی
عورتیں حیران تھیں۔

”مجھے ہماری اسٹیٹ پر حکومت کرنا تھی نا! مجھے
سرکاری چاہیے تھی۔ تو نے اس علاقے کا سردار بننے
کے لیے کیسی گھٹیا چالیں چلی ہیں۔ تو آرام سے کہہ دیتا
زری خان! یہ سرداری یہ شان و شوکت مجھ سے زیادہ
عزیز نہیں ہیں مجھے۔ تیری نفرت کی جڑیں بہت دور
تک پھیلی ہیں۔ ہماری محبت اس نفرت کو بھی ختم
نہیں کر سکی۔ تو نے اس جاہ لال کی خاطر کیسے کیسے
منصوبے بنائے ہیں۔ سوچوں تو شرم آنے لگتی ہے۔
مجھے آج سے بہت برس پہلے ہی سمجھ لیتا چاہیے تھا۔

جب تو نے مجھ پر ایک انگریز عورت سے نکاح کا جھوٹا
الزام لگایا تھا۔ بابا جان کے پاس ابھی تک وہ نکاح نامہ
موجود ہے۔ تو مجھے ہر طرح سے بابا جان کی نظر سے گراتا
چاہتا تھا۔ مگر ہوا کیا؟ اپنے مقام سے تو خود گر گیا۔ اس
الزام کے باوجود بابا جان نے میرے سر پر دستار رکھنے کا
فیصلہ کر لیا تھا۔ اگرچہ اس فیصلے کو عملی جامہ بہت
عرصے بعد پہنایا گیا۔

پھر تم نے گل افشاں اور گلریز خان کو ورغلا دیا۔ ان کا
نکاح کیا۔ انہیں یہاں سے بھگا دیا۔ صرف اور صرف
میری غیر ذمہ داری ثابت کرنے کے لیے۔ اس لیے کہ
لوگ جان جائیں میں فیملی کا سردار بننے کا اہل نہیں
ہوں۔ اور انہوں نے مجھے سردار بنا کر ایک غلط فیصلہ کیا
ہے۔ اسی دوران مجھ پر قتل کا مقدمہ چل پڑا۔ مجھ پر
چوری کا الزام لگایا گیا۔ اور میں اپنے ناویدہ دشمن کو
ڈھونڈتا رہ گیا۔ مجھے اک پل کے لیے بھی خیال نہیں

اس کی طرف لگی۔ ”آنکھیں کھولو جو ہی ایسوں پریشان
ہو رہی ہو“ میں ہوں نا! ”
”تم کچھ بھی نہ کر سکو گی بھر جائی! تم زری خان کو
جانتی جو نہیں ہو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
اسی پل مجھ کو خوشی سے چلائی ہوئی اندر آئی۔ ”مبارک
ہوں بی بی صاحب! میرا میں آگئے ہیں۔“
”کون بھایا؟“ پناے حیرت کے چھٹکے سے سنبھل
کر پوچھا۔

”ہاں جی۔“
”میر ذکاء آگیا ہے۔“ روشی گویا خود سے مخاطب
ہوئی۔ ”اب کیا یہ شادی ٹرک جائے گی؟ تم کیوں؟ میر
ذکاء سے کسی رحم دلی کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اور کیا وہ
اپنی بہن کو بچا پائے گا؟ اور وہ اپنی بہن کو بچائے گا ہی
گیوں؟ بہنوں اور بیٹیوں کی اہمیت ان کے نزدیک
بے جان سورتوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔“ پاپا ہرے عجیب
وغریب شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ روشنائی بھی
پنا کے پیچھے باہر نکل آئی۔ میر ذکاء اور زری خان ایک
دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ ایک دم ہی بھانت
بھانت کی آوازیں کا شور مچا رہی تھیں۔

”زری خان! تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک
تو یہ کہ اس خطے سے کہیں دور بہت دور نکل جاؤ۔ کبھی
مجھے دوبارہ دکھائی نہ دینے کے لیے۔ اور دوسرا راستہ یہ
ہے کہ جوڑ ہر تو نے میرے اندر اتار لے اس زہر کو میں
تیرے اندر اتار دوں۔ اگرچہ میری ماں کی ماتا میرے
راستے کی دیوار ہے، مگر تمہارے جرم اتنے بھاری اور
غلیظ ہیں کہ ان کی غلاظت اور سزاوند سے نفص اور وہاں
پھونٹے کا خدشہ ہے۔ بولو کیا چاہتے ہو؟“ ذکاء خان کی
آنکھوں میں غصے اور غضب کے رنگ سرخی بن کر
چھلک رہے تھے۔

”یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ تمہاری حیثیت اس
علاقے میں کسی ہمارے ہوئے جواری کی سی ہے۔ میں
ایک سینڈ میں تمہارا کام تمام کروا سکتا ہوں۔“ زری
خان بھی پھٹک اٹھا۔
”مجھے عزت، محبت اور خلوص راس نہیں آیا۔

گزر رہا تھا کہ میرا دشمن میری رگ جال سے قریب تر ہے۔ غصہ غلیظ علی کے ساتھ منصوبہ بنا کر عروس کو قتل کر دیا گیا۔ غصہ غلیظ علی عروس کا سابقہ منگیتر ہے۔ اور وہ اس سے جاںبدار ہتھیانے کے چکر میں تھا۔ عروس مجھ سے مدد چاہ رہی تھی۔ وہ مجھ رہی تھی کہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ پناہ لینے کی غرض سے ہمارے گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھی۔ اسے قتل کروا کر میری جیب میں رکھ دیا گیا۔ تمام شواہد میرے حق میں نہیں تھے۔ میرا کوئی گواہ نہیں تھا۔ مجھے ہتھکڑی تو لگنا ہی تھی۔ تم نے تو اپنے باپ دادا کی عزت و ناموس تک کا خیال نہیں رکھا۔ میرے جیل جانے کے بعد تمہاری دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ سردار بننے کے بعد تم نے گل افشاں اور گلریز خان کو مروا دیا۔ جرگے والوں نے تمہارے احساس ذمہ داری کو سراہا۔ علاقے میں تمہاری غیرت کے جھنڈے گڑنے لگے۔ پھر میری بیٹی کو اغوا کرتے ہوئے تمہیں اک بیل کو بھی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی کہ تم اپنی سگی بیٹی کو اغوا کر رہے تھے صرف اور صرف مجھے نجات کھانے کے لیے۔

روشانے کو بدگمان کرتے رہے۔ اس کی نظروں میں خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے انقلاب لانے کی تقریریں کرتے رہے۔ میرے خلاف نہ جانے کون کون سی داستانیں اسے سنار کھی تھیں۔ میں عیاش ہوں، آوارہ ہوں، بے کردار ہوں، بددیانت ہوں، اور ادھر میرے نام ولی حاقان کو لوہے پر ٹوٹ کر کے مجھے روشانے سے متنفر کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ آج مجھے بتاؤ روزی خان! کہ اس نفرت کی کوئی حد بھی ہے؟

وہ دکھ اور صدمے کے زیر اثر تھک کر خاموش ہو گیا تھا اور روشانے خان کے دل کی دھڑکن رک رک کر چل رہی تھی۔ یہ سناعتیں کیا سن رہی تھیں؟ یہ کیسی حقیقتیں تھیں؟ یہ کیسے سچ تھے؟

”اس نفرت کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ نفرت مجھے بابا جان سے ہے۔ جنہوں نے میری ماں کو کم سن میں

ورغلا کر نکاح کر لیا تھا۔ پھر اپنی خاندانی بیوی کے لیے اسے چھوڑ دیا اور وہ صرف ضد اور انانہ کی خاطر بابا جان کے تباہ زاد بھائی احمد خان سے شادی کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ یہ نفرت مجھے تم سے ہے۔ اس گھر کے ہر فرد سے ہے۔ یہ سب جنہوں نے مجھے دھتکارا۔ میری ماں کو دھتکارا۔ میری ماں کو گھر سے بھاگ آنے کے طعنے دیے گئے۔ کیا وہ خود بھاگ کر آئی تھی؟ وہ غیض و غضب سے چیخ رہا۔

”زری خان! میرے بچے تم کچھ نہیں جانتے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ مہر افروز کے لبوں کا نقل ٹوٹ گیا تھا۔ اور انہوں نے اس برسوں پرانے قصے پر جی کر دکی تھوں کو صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”مانہ اور اورنگ زیب کی شادی تمہارے دادا نے کروائی تھی۔ حاقان ان کا بیٹا تھا۔ اورنگ زیب اس شادی سے خوش نہیں تھے۔ پھر میری گود میں ذکاء خان نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے بعد مانہ نے تمہیں جنم دیا۔ مانہ بہت بے باک لڑکی تھی۔ اسے فیشن بھاتے تھے اور وہ یہاں کے گھٹے گھٹے ماحول سے متنفر تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے طلاق لے کر احمد خان کے دفتر میں نوکری کر لی۔ وہ تعلیم یافتہ تھی اور خود کو رنگ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت مانہ بھی احمد خان کو اتنا نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اسے یہ پتا تھا کہ احمد خان اورنگ زیب کا تباہ زاد بھائی ہے۔ آپس میں رنجشوں کی بنا پر ایک دوسرے سے تعلقات کشیدہ تھے۔

جب ہم نے روشانے کا رشتہ مانگا تھا تب اسے پتا چلا کہ اورنگ زیب اور احمد خان کا کیا تعلق ہے ایک دوسرے کے ساتھ۔ پھر وہ احمد خان کے ساتھ بھی نہیں رہی تھی۔ تمہیں وہ ساتھ اس لیے نہیں لے کر گئی تھی کہ اسے اورنگ زیب سے اس پوری جاںبداد میں سے برابر کا حصہ چاہیے تھا۔ تم صرف دو ماہ کے تھے جب وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں نے تمہیں ماں بن کر پالا ہے۔ اپنا دودھ پلایا ہے۔ تم سے باقی بچوں سے بڑھ کر محبت کی ہے۔ مگر شاید ہماری

محبت میں ہی کھوٹ تھا۔“

مہر افروز رونے لگی تھیں۔ زری خان دم بخود تھا۔ اسے اپنی ماں کی وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو اکثر وہ خطوط میں لکھا کرتی تھیں۔ اس کے باپ کے ظلم و جبر کے قصے اپنی بے بسی اپنے دکھ خود ساختہ مظالم کی دردناک داستانیں بچوں کے زری خان کا رواں دواں سنگ اٹھتا تھا۔ اسے خود سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔

”مجھے معاف کریں ماما! ندامت کے بوجھ سے اس کا سر جھک گیا تھا۔

”کس کس سے معافی مانگو گے۔ گل افشاں اور گلریز کے قاتل! ذرا سراٹھا کر دیکھو۔“ ذکاء خان کا لہجہ کٹھن تھا۔ روشانے سمیت زنان خانے کی عورتیں حق دیتی کھڑی رہ گئی تھیں۔ ولی حاقان کے ساتھ ایک دلی تپتی انگریز عورت سر پر اسکارف باندھے کھڑی تھی۔ اس کے برابر میں ایک ننگے ہونے قد کا لڑکا بھی کھڑا تھا۔

”بتاؤ جلیہنا! ذکاء خان کون ہے ان میں سے؟“ ولی حاقان اس کا ہاتھ تھامے ہوئے رہا تھا۔

”وہ جس کی آنکھوں کا رنگ بھی جیسا ہے اس نے مجھے اپنا نام ذکاء خان بتایا تھا۔ یہ جھوٹا ہے ایمان بے وفا ہے۔ اور اس کے انتظار میں میں نے اپنی زندگی کے چودہ سال برباد کر دیے۔“ وہ زردی کا کریمان پکڑے چلا رہی تھی۔ روشانے کو سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔

”میں نے تم کو واقعی دھوکہ دیا ہے۔ صرف اور صرف ذکاء خان کو جھکانے کے لیے۔ تم بھی میرے پلان کا حصہ تھیں۔ مجھے یہ اسٹیٹ چاہیے تھی۔ حکمرانی چاہیے تھی جو کہ میرا ذکاء کو بڑے ہونے کی وجہ سے ملنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس اسٹیٹ کو حاصل کرنے کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا اور اسے ہی دھتکار کر میں یہاں سے جا رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ ولی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔

”میں بھی۔“

”اور میں نے ٹھیک لے رکھا ہے تمہاری بیوی اور بچوں کی کفالت کا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”پلین مانا! اس وقت مجھے کچھ مت کہیے گا۔ پہلے سے شرمندگی کے تالاب میں ڈبکیاں لگانے والے کو اور کیا کہنا ہے۔“

”مہر حال جہاں بھی جاؤ۔ اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لے کر جاؤ۔ بلکہ سیدھے اپنی غمی کے پاس چلے جاؤ۔ وہ بہت بیمار ہیں۔“

”جب آپ آئے تھے تب ہی مجھے سب کچھ بتا دیتے۔“ وہ سب سے نظریں چرا کر رہا تھا۔

”تب میں خود بھی انجان تھا۔ اور مجھے مانہ آتے کچھ دن پہلے ساری سچائی بتائی ہے انہیں کینسر ہو گیا ہے۔ اور مرنے سے پہلے وہ سچائی بتانا چاہتی تھیں۔“

”اماں! مجھے معاف کریں۔“ وہ ایک مرتبہ پھر مہر افروز کے گھٹنوں پر جھک گیا تھا۔ مہر افروز نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”اور تمہاری بے قصور بیوی بھی کھڑی ہے۔ اس سے بھی معافی مانگ لو۔“ ولی نے اسے جیلی کی طرف دھکیلا تھا۔ میں اپنی ہی لگائی آگ میں اتنے سال جلتا رہا ہوں اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ وہ غمی کو سینے سے پیچھے کر رہا تھا۔

روشانے خاموشی سے منظر سے ہٹ گئی تھی۔ میرا ذکاء نے چونک کر روشانے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ماں کو اٹھانے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔



پورے ڈیڑھ سال بعد میرا ذکاء کی طرف سے بلاوا آیا تھا۔

”میں بچیوں کو سلا رہی ہوں۔“ اس نے غصے کے عالم میں ملازمہ کو جواب دیا۔ کچھ دیر بعد ملازمہ پھر سے آگئی تھی۔

”خان غصے ہو رہے ہیں۔ آپ ان کی بات سن لیں۔“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ غصے سے پھٹکاری۔

ملازمہ خوف زدہ سی باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد میرڈ کاغذ خود ہی آگیا تھا۔
”بڑا غلطہ اور غرور ہے تم میں۔ کیوں نہ ہو آخر بی جاہل کی نواسی ہو۔“

”میرے کمرے میں کیوں آئے ہیں؟“
”یہ میرا تمہارا کیا ہوا۔ تمہارے آنے سے پہلے یہ بھی میرا ہی گھر تھا۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا کہتا ہے؟“
”کہنا تو بہت کچھ ہے۔ اگر تم کچھ وقت دو تو۔“
”میرے پاس آپ کے لیے وقت نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے بولے۔

”کیا ابھی تک فضا ہو؟ میری طویل تقریر بھی بے اثر رہی ہے۔“ ذکا خان نے ہیکے سے لہجے میں کہا۔
”میں حیران ہوں کہ لوگوں نے چروں پر کیسے کیسے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ ممی اور یہ زری خان۔ میں اسے کیا سمجھتی تھی اور یہ کیا نکلا۔“

”تمہاری ایکس ممی اس کے اندر زہر بھرتی رہی ہیں۔“
”اور جو اس نے گل افشاں کے ساتھ کیا ہے۔“

اس کے لیے اللہ تعالیٰ اسے خود سزا دے گا۔ قاتل کی معافی نہیں ہے۔“
”مجھے افسوس صرف اتنا ہے کہ کوئی بھی شخص اگر تمہیں میرے متعلق کچھ بھی بتائے تم فوراً یقین کر لو گی؟ کیا اتنے سالوں میں مجھے صرف اتنا سہی جان پائی ہو۔“

”آپ بھی تو مجھ پر شک کیا کرتے تھے۔“ روشی کو بھی اس کے طعنے تشنہ یاد آگئے۔
”وہ تو محض تمہیں شک کرنے کے لیے تھا۔ اگر میرے شکوک اتنے ہی مضبوط ہوتے یا مجھے شک میں مبتلا کرنے والے پر اتنا ہی یقین ہوتا تو ہمارے راستے کب کے جدا ہو جاتے تھے۔“ وہ بڑے یقین سے کہہ رہا تھا۔

”اور یہ عروس کا کیا قصہ تھا؟“
”میرا خیال ہے میں وضاحت کر چکا ہوں۔ وہ میری اچھی دوست تھی۔ اس کا سابقہ منگیتر گرفتار ہو چکا ہے۔“

”اور یہ زری خان اس سے جوہی کی شادی کر رہا تھا۔“ روشی نے مخنی سے کہا۔
”صرف سبطین خان سے عداوت کی بنا پر اس جذباتی آدمی نے یہ انتہائی قدم اٹھالیا تھا، کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ میں جوہی اور سبطین خان کا رشتہ طے کرنے والا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ روشی ابھی۔
”تم اپنی کوئی بات نہیں کر سکتی۔“ وہ جھلا اٹھا۔
”یہ اپنی باتوں کا نہیں، بچوں کے فیوچر کی پلاننگ کرنے کا وقت ہے۔ اپنا نام آپ کنوا چکے ہیں۔ اپنی انا کے گنبد میں قید رہ کر۔“ وہ اس کی پیش قدمی پر پملو بدلتے ہوئے بولی۔

”فیملی پلاننگ پر تو سوچا نہیں۔ اب فیوچر کی پلاننگ پر تو لازماً سوچنا پڑے گا۔“ وہ مٹی ہوئی ماہ نور کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولا۔
”میری زندگی میں صرف احمد خان ازبک کی بیٹی کے علاوہ کوئی نہیں۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔“ وہ زنج ہو کر کہہ رہا تھا جانتا تھا کہ روشی بہت بدگمان رہی ہے۔

”خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ بچیاں آپ کے جذباتی مکالمے سن کر اٹھ جائیں گی۔“
”چلا جاتا ہوں، مگر تمہیں مجھ سے بھی پہلے میرے کمرے میں جانا ہو گا۔“

”خان صاحب زیادہ پھینکے کی ضرورت نہیں۔“ روشی مصنوعی خشکی سے بولی۔
”شکر ہے میں تمہارا ساگ ہوں اور تمہارے بچوں کا باپ ہوں۔ ورنہ تم کبھی بھی میرے لوٹ آنے کی دعا نہ کرتیں۔“ وہ شرارتی نظموں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ذکا خان!“ روشی نے تینہبھا اسے گھورا۔ وہ

بنے ہوئے اسے آنے کا اشارہ کر کے پلٹ گیا تھا۔ اور روشانے نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ آج اتنے سالوں بعد محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صحرا میں چلتے چلتے کسی ٹھکانے میں قدم رکھ چکی ہے۔

”وقت نے تو بدلنا ہی تھا۔ اور وقت واقعی بدل چکا تھا۔ جب ولی حاقان نے ماوی کا ہاتھ مانگا تو بابا جان اور عشق النساء نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کل کالا اور گل زبنا نے ماوی کو رخصت کرتے ہوئے دعا دی تھی۔ ان کی آنکھوں میں حسرتیں اور مایوسیاں نہیں تھیں۔ وہ اپنی چاچوں کی طرح جانی ماندہ زندگی کو عبادت کے لیے وقف کر چکی تھیں۔ ماوی اور اس کی قیتوں بچیوں کو لے کر رن چلا گیا تھا۔

جوہی، سبطین خان کے سنگ رخصت ہو چکی تھی۔ بنا اور پزیران کی شادیاں مہر افروں کے بھانجوں سے ہو گئیں۔ سہری دخت کو گل بخت نے اشتر کے لیے مانگ لیا تھا۔

اور زحام نے اپنے لیے علیزے کو منتخب کر لیا۔ وہ کہتا تھا۔
”بھرجانی! حسن کو اتنے قریب سے ارزاں ہوتے دیکھا ہے کہ حسن سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے میں اور علیزے اچھی زندگی گزاریں گے۔“

زری خان اور جیلی بھی رن چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے اس نے ذرا رسہ کا افتتاح کیا تھا۔ اور اپنے حصے کی تمام جائیداد افلا جی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔

بابا جان پھر بھی خاموش رہے تھے۔ اب غلطیوں کے کفارے کا وقت تھا۔ سو شاید اسی لیے وہ خاموش تھے اور علم کا چراغ روشن ہونے والا تھا۔

نہ جانے کتنے زمانوں سے اس عمر رسیدہ درخت کے سارے چر مرے، زرد اور بے جان پتے آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔ خزاں کسی اور ٹکڑے کاغذ کی گرتی پیشہ کے لیے یہاں سے رخصت ہو چکی تھی۔ نئی کوئٹلیں

پھوٹ رہی تھیں۔ زندگی مسکرانے لگی تھی۔ اور روشانے خان کی آنکھوں میں اس خواب کے طویل سفر سے واپسی کے بعد کوئی جھکن نہیں تھی۔ زرد پتوں کے شجر پر بہار کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	200/-
دل ایک شہرچوں	آسیہ مرزا	450/-
آجیوں کا شہر	فاخرہ افکار	500/-
بھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ افکار	200/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل آسے دھڑلایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جاسم خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خواب در پہیے	سعدیہ یاسین کاشف	200/-
اماؤں کا چاند	مژدی سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	450/-
درد کے قاسمے	رضیہ جمیل	500/-
آج صبح پرچا عروسیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	جم عورتی	250/-

ناول منکوانے کے لئے نئی کتاب ڈاک خرچ 30/- روپے

منکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 2216361

حکایت



لوگوں کو نئی سے لطف اندوز ہوتے دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔
کریم نے مسکرا کر عید مبارک کے ساتھ اکبر کو خوش آمدید کہا۔

”کیا خدمت کروں؟“ وہ مسکرا کر بولا۔
”وہی پلاؤ۔“ اکبر نے مسکرا کر کہا۔

”جناب اور کچھ۔“ وہی کا کتنا آدہ رکھ لوں، نور آپا نے توکل رات ہی تین رات وہی ایک کروائی، آپ کی کتنی کڑیوں؟“ وہ مسکرا کر کہنے لگا۔

”بھی گھر والوں نے کچھ نہیں بتایا۔“ اکبر نے لسی کا گلاس تمام کر جواب دیا۔

کریم بولا۔ ”جناب وہی کا آرڈر بک کرادیں ورنہ وہی بک گیا تو آپ کی عید کا مزہ خراب ہو جائے گا۔“

اکبر لسی کا گلاس خالی کر چکا تھا۔ وہ گلاس دے کر حیرت سے پوچھنے لگا۔ ”وہ کیوں؟“

”جناب گوشت کی گرمی وہی کاٹتا ہے۔ اور گوشت کی دُش کے ساتھ وہی نہ ہو تو مزہ خراب سمجھو۔“

کریم نے ہنس کر بتایا۔
”جلیے دو رات کر دیں۔“ اکبر بھی ہنس پڑا۔

پچھلی دفعہ بھی وہ دو رات وہی لے کر گیا تھا۔
کریم حیرت سے بولا۔ ”زیادہ کر لیں یہ کم ہیں۔“

لیکن اکبر نے کہا۔ ”یہ بھی زیادہ ہیں۔“ تو کریم خاموش ہو گیا۔

اکبر دل میں مسکرایا۔ ”بکرا حلال نہیں ہوا، لوگوں نے کھانے کے مزے پہلے تیار کر لیے۔“

امام صاحب عید الاضحیٰ کی نماز کی ادائیگی کے بعد دعائیں مشغول ہو گئے۔ دعا زیادہ ہی لمبی ہو گئی تو۔

تب اکبر نے وہاں سے کھسکا مناسب سمجھا۔ اور قبرستان کی طرف بڑھا۔ واوی اماں کی ہدایت کے مطابق اپنے خاندان کے بزرگوں کی قبروں پر اس نے فاتحہ پڑھی۔

اکبر قبرستان سے فارغ ہوا تو سیدھا گھر پہنچا، ابھی دروازے پر قدم رکھے تھے۔ تو مقصودہ فکر مندی سے بولی۔

”قصائی مل گیا کیا؟“

”ماں نماز پڑھ کر آیا ہوں، پھول بھی چڑھائے ہیں، ابھی سوئیاں تو کھانے دو، پھر پکڑ لیتا ہوں۔“ اکبر نے خفگی سے جواب دیا۔

مقصودہ پیار سے بولی۔ ”بیٹا! سوئیاں ابھی تیار نہیں ہوئیں اور دیکھ تیری واوی اماں نے قربانی سے پہلے کچھ نہیں کھانا، قربانی ہوئی تو ان کا حلق تر ہو گا۔ میرے بچے جا جلدی سے قصائی پکڑ لے۔“ مقصودہ کو اپنی ساس

صفراں بیگم کی ناساز طبیعت کی فکر تھی۔ رات کو وہ بخار میں مبتلا تھیں۔ اس لیے مقصودہ قصائی جلدی لے کر آنے پر زور دے رہی تھی۔ ان کو واوی دے دی

جائے ورنہ کہیں زیادہ طبیعت ناساز نہ ہو جائے۔
اکبر نے اپنی واوی اماں کے متعلق سنا تو اپنی ماں کا حکم سر آنکھوں پر رکھ کر قصائی کی تلاش میں گھر سے باہر نکل آیا۔

روڈ پر اس نے کریم دودھ وہی والے کی دکان پر

اس نے ڈور تیل دی، تو کوئی نہ آیا، آخر کار چار دفعہ تیل دینے پر نور آپا نے خفگی سے پوچھا۔

”کون ہے؟“

اکبر نے کہا۔ ”واوی آیا میں ہوں، اکبر؟“

دوسری طرف سے آواز ابھری۔ ”کون اکبر؟“

اکبر یہ سن کر حیرت زدہ ہو گیا، پھر بولا۔ ”واوی آپا! صفراں کا پوتا اکبر۔“ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

دروازہ کھل گیا نور آپا مسکرا کر ملیں، اور پھر خفگی سے بولیں۔

”میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی فقیر ہے۔“

اکبر نے ہنس کر کہا۔ ”واوی آپا! باہر منھی بچی کھڑی ہے۔“

”کب سے ان لوگوں کو گوشت بانٹ رہی ہوں، یہ لوگ تو جانے کا نام ہی نہیں لے رہے۔“ نور آپا نے

کریم کی دکان کو پہنچے چھوڑ کر وہ قصائی کی دکان پر گیا۔ جہاں قصائی کے ملازمین نے قیسے والی مشین رکھی ہوئی تھی، دو چھوٹے ملازم ریڈیو پر گانے سن رہے تھے۔

”قصائی جی کہاں ہیں؟“ اکبر نے ایک سے پوچھا۔

”نور آپا کے گھر پر ہیں۔“ اس نے بتایا۔

اکبر نور آپا کے گھر کی طرف بڑھنے لگا، نور آپا اس کی واوی صفراں بیگم کی دوست تھیں۔ نور آپا کے گھر کے

باہر کمرے کا خون کھڑا کچھ کر اندازہ ہو گیا کہ نور آپا کا بکرا فز ہو گیا ہے، منھی بچی ہاتھ میں ایک بڑا خالی شاپر لیے

کھڑی تھی، اکبر کو دیکھ کر وہ منھی غریب بچی بولی۔

”صاحب! تھوڑا گوشت دے دو۔“ وہ منھی بچی سمجھی تھی شاید اکبر اس گھر کا فرد ہے۔

اکبر نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے اندر تو جانے دو۔ پھر تمہاری فرمائش پٹھانیا ہوں۔“

بہزار ہو کر بتایا۔ جیسے ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ جو فقیر ان کی جان نہیں چھوڑ رہے۔

محکم میں قصائی کو دیکھا جو بکرے کی کھال اتار رہا تھا، نور اپنی بسو فرجی کی آواز پر بچن کی طرف جا گھسے۔ جبکہ فرحان چاچو قصائی کو بدایت دے رہے تھے کہ کھال کو کٹ مت لگنا، فرحان چاچو کی نظریں اکبر پر پڑیں تو انہوں نے اس کو گلے سے لگا کر عید مبارک کا فخر ادا کیا۔

قصائی بکرے کی کھال ابھی اتار رہا تھا۔ اور گوشت بنانی نہیں تھا تو بکرے کا گوشت کیسے بانٹ دیا گیا؟ اکبر کو وہ بھٹی غریب بچی یاد آگئی جو بارہکڑی تھی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔

”تم لوگ کس کو کھال دیتے ہو؟“ چاچو فرحان نے مسکرا کر پوچھا۔

چاچو فرحان کا مدعا یہ تھا کہ کھال ان کے حوالے کر دی جائے اس سے پہلے کہ وہ منہ سے بول دیتے۔ اکبر نے جھٹ سے کہا۔

”داوی اماں اکبر کی کھال مسجد فاروقیہ کو دیتی ہیں“ وہاں یتیم بچوں کی پرورش بھی ہوتی ہے۔ ان کھالوں کو بیچ کر مسجد کے ممبران بچوں کے لیے کھانے پینے پسنے اور ہنسنے کا سامان خرید لیتے ہیں۔“

یہ اس کی داوی اماں نے بچپن میں اس کو بتایا تھا۔

جب وہ صغیران یتیم سے پوچھتا تھا۔

”داوی اماں! آپ یہ کھال مسجد کو کیوں دیتی ہیں“ جبکہ بڑے ماموں طفیل تو بیچ دیتے ہیں۔“

تو صغیران نے پیار سے پوچھ کر سمجھایا تھا کہ جب بکرے کو اللہ کی راہ میں قربان کیا جاتا ہے تو اس میں کھال بھی شامل ہے۔ اس کھال کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

پھر اکبر نے اپنے نضیال جاکر بھی کھال فروخت کرنے کے بجائے اللہ کی راہ میں دینے کا سبق دیا۔

بڑے ماموں طفیل نے اپنے بھانجے کی بات کو فوراً تسلیم کیا۔ جب چھوٹا سا بچہ یہ درس دے تو بڑے

شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

اکبر نے مسجد فاروقیہ کے متعلق چاچو فرحان کو بتایا۔

تو ان کا چہرہ زرو سا ہو گیا۔ جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو، جبکہ اکبر جانتا تھا کہ چاچو فرحان لوگوں سے اللہ کے نام پر کھالیں لے کر فروخت کر دیتے ہیں اور ان پیسوں کو اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ بکرے کی کھال اتاری تو چاچو فرحان نو دو گیارہ ہو گئے۔ ان کا چھوٹا بیٹا عمیر رو رو کر باب کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔

داوی آپا کی بسو فرجی نے کہا۔

”بابا ضروری کام سے گئے ہیں بس جلدی آجائیں گے، پھر ہمیں پارک لے کر جائیں گے، تمہیں ایتھے اچھے کھلونے لے کر دیں گے۔“

اکبر کا دل چاہا کہ وہ آٹنی فرجی سے کہہ دے کہ چاچو فرحان کا ضروری کام لوگوں کو اللہ کے نام پر دھوکا دینا ہے۔

چاچو فرحان اپنے مشن پر نکل چکے تھے کہ لوگوں کے گھروں سے کھالیں بنو کر فروخت کر دیں گے۔ آٹنی فرجی نے کھلونے اور پارک کالاچ دے کر عمیر کو جب کروالیا تھا۔ شاید فرجی بھی لالچ کی وجہ سے چاچو فرحان کو نصیحت نہیں کر سکتی تھیں کہ کھال کو فروخت کر کے کسی سفید پوش یا غریب کی مدد کر دی جائے۔

داوی آپا کی بڑی بسو کرن کا بچن سے آواز ابھری۔

”بچئی کے لیے پیاز کاٹ دی ہے، کچھی دے دیں۔“

فرجی نے قصائی سے کچھی کی پرات پکڑی۔ اور بچن میں جا کھی، بچن میں سے داوی آپا نکلیں بچن کے ہاتھ میں ایک بڑی ٹرے تھی۔ جس پر چار سلاکس دو ابلے ہوئے انڈے اور جیم کے ساتھ چائے کا ٹک تھا۔ جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔

اکبر کو داوی آپا پیار پیار آگیا کہ انہیں اس کا کتنا خیال ہے وہ کتنی مہمان نواز ہیں۔ جو اس کے لیے ناشتہ لے کر آگئیں۔ مگر اکبر کا خیال چکنا چور ہو گیا۔ جب داوی آپا نے وہ ٹرے قصائی کے ہاتھ میں تھما دی۔

قصائی ہاتھ منہ دھوئے میسن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ

داوی آپا کے گھر کا فروگ رہا تھا۔

اس نے مزے سے ایک انڈہ منہ میں ڈال لیا۔ اکبر کا دل چاہا کہ وہ دو سر انڈہ جو پلیٹ میں رہا ہو اسے اٹھا لے۔ مگر دوسرے ہی لمحے قصائی نے اس کو سلاکس کے ساتھ ہٹ کر لیا۔ انڈوں کے ساتھ انصاف کر کے قصائی نے چائے کا سب لیا تو داوی آپا نے پوچھا۔

”بیٹا! کچھ اڑتو نہیں چاہیے؟“ داوی آپا کا پیار سے پوچھنا اکبر کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے برابر تھا۔

اکبر جو بھوکے پیٹ تھا، اس کو داوی آپا پر غصہ آنے لگا کہ کچھ مہمان سے بھی پوچھ لیں۔ مگر وہ قصائی پر پنجھار ہو رہی تھیں۔

کرن تیزی سے کچن سے نکلی۔ اور کچھی کی پرات داوی آپا کو دے کر بولی۔

”اماں! کچھی کے ٹکڑے چھوٹے کروالیں، کم از کم دو دن تو چلنی چاہیے۔“

کرن نے بڑے کاشد دل بھی بنالیا تھا۔ جو وہ کچھی کو دو دن زیر استعمال کے لیے بول رہی تھی۔ داوی آپا نے ان کی بدایت پر عمل کیا۔ اور قصائی سے منت کی۔

دوسرے دن کرن کی نظریں اکبر پر پڑیں تو کرن نے پیار سے پوچھا۔

”قصائی لینے آئے ہو؟“

اکبر نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا کر بولا۔ ”جی“

قصائی لینے آیا ہوں، اپنا گلا کٹوانے کے لیے۔“ اکبر نے یہ جملہ آستنی سے کہا تھا جو کرن کے کانوں تک نہیں پہنچا تھا، کیونکہ قصائی اپنی طرفوں کے پل باندھ رہا تھا۔ داوی آپا نے اس سے کہا تھا کہ پچھلی مرتبہ ان سے غلطی ہو گئی، انہوں نے ایک پشمان سے بکرا فٹن کر دیا۔ اور اس نے گوشت کا ستاناس کر دیا۔

قصائی نے ڈنک مارتے ہوئے کہا۔

”جناب پشمان بھی کبھی قصائی کا کام سمجھ سکتا ہے؟ جس کو عقل نے خود خیر یاد کہہ دیا کہ میں اس کے داغ میں نہیں رہ سکتی، بکرے کا گوشت بنانا بھی مہارت کا

کام ہے، الٹی سیدھی چھری چلا لینے سے کوئی قصائی نہیں بن جاتا۔“

اس نے کچھی کے ٹکڑے چھوٹے چھوٹے کر کے داوی آپا کو پرات دے کر اپنی مہارت ثبوت پیش کیا۔

داوی آپا اس لیے قصائی کی خوشامد کر رہی تھیں کہ ان کے گوشت کو سلیتے سے بنایا جائے، وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئیں۔ وہ قصائی کی موجودگی میں اکبر کو نظر انداز کر رہی تھیں۔ اکبر نے محسوس کیا کہ لوگ سچ ہی کہتے ہیں، عید الاضحیٰ کا چاند قصائی ہوتا ہے، رات کو ہی قصائی سے ملا جاتا ہے، کوئی جا کر ٹام کر لیتا ہے، تو کوئی فون پر ساری رات قصائی کو گھر پر آنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہے، اور قصائی صبح جس گھر میں پہلا ڈیرہ اڈال دیتا ہے وہاں عید شروع ہو جاتی ہے، اور ہر لحال تو عید شروع۔

داوی آپا نے مسکرا کر اکبر سے کہا۔ ”بیٹا! یہ کچھی کی پرات کرن کو بچن میں دے آؤ۔“

اکبر نے رات لے لی اور اس توقع میں کچن کی طرف بڑھا۔ شاید بچن میں اس کو کچھ کھانے کے لیے پوچھا جائے، وہ ابھی بچن کے دروازے پر پہنچا تھا کہ فرجی کی آواز سنائی دی۔

”صالیہ! تو ہر دفعہ مجھے گوشت بھیجا، مگر ایک میں ہوں، جو کبھی بھی بیچ نہیں پاتی۔“ اس کی آواز میں افسردگی تھی۔

”اوہو! تم اماں کی اجازت کے بغیر بھیج دو۔“ کرل نے لہسن چھیلے ہوئے کہا۔ فرجی پیاز کاٹ رہی تھی۔

وہ لرزتی آواز میں بولی۔

”اب اپنے ہی گھر میں گوشت چوری کرنا پڑے گا۔“

”بابا! کرن نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو کب سے گوشت چوری کر رہی ہوں۔“

”سچ بھائی!“ فرجی جو کرن کی دیوہالی تھی مسکرا کر پوچھنے لگی۔

”صلی کس دن کام آئے گا؟ آخر ہمارا چھوٹا دیوہ ہے

بس اس کے دوست کا حصہ نکال کر رکھو اور اس کو صالحہ کے گھر گوشت دینے کی بھی ہدایت دے دینا کہاں کو کیا پتا چلے گا۔

”اماں کو پتا چل گیا تو؟“ فرجی جو کچی چور تھی ڈر کر پوچھنے لگی۔

کرنا نے مسکرا کر کہا۔ ”بکرے کے گوشت میں بڑی لذت ہے۔ جب کبھی بھون کر ان کو دیں گے تو وہ یہ کہہ کر لیٹ جائیں گی کہ گوشت کی خماری آگئی اور وہ سو جائیں گی پھر تم صالحہ کے گھر اپنی پسند کا گوشت بھیج دینا۔“

اکبر کی ہنسی پھوٹ گئی، دونوں بیک دم ڈری گئیں۔ کرنا کے ہاتھ سے لہسن کی پلیٹ کھینچی، جبکہ فرجی کے پیاز کاٹتے ہاتھ رک گئے۔

”جی۔ کبھی کی پرات۔“ اکبر نے پرات کرن کو پکڑ لیا۔ اس نے شرمندگی سے پکڑ لی۔ اور وہ وہاں سے واپس کھن میں آگیا۔ وہ مسکرا رہا تھا کہ شاید بکرے کے گوشت میں واقعی بہت لذت ہے، جو دوا دی آپا ہر فقیر کی صدایران کو دھکا کر بھگا دیتی ہیں۔

قصائی فارغ ہو چکا تھا، دوا دی آپا میسے لئے کمرے میں گئیں تو اس نے اکبر سے نظریں پچا کر کچھ گوشت مزید چڑایا۔ جو کہ اکبر دیکھ چکا تھا۔ مگر اس نے بولنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں اس کے گھر کا بکرا بو نہ کھڑا نہ رہ جائے، اور اس کی دوا دی صغراں بیگم جو بھوکا ہیں ان کی صحت مزید نہ خراب ہو جائے۔

قصائی نے دو ہزار دوا دی آپا سے منہ نہ کر کے وہ تین ہزار مانگ رہا تھا کہ اس نے سب کے کام چھوڑ کر پہلے ان کے ہاں حاضری دی ہے، مگر دوا دی آپا کے تیور بدل گئے تھے۔ وہ دو ہزار دے کر دروازہ بند کر چکی تھیں۔ کیونکہ قصائی سے ان کا کام ختم ہو چکا تھا۔

قصائی خفگی سے بولا۔ ”کام نکال لینے کے بعد یوں ہی دروازے بند کر لیتا تو ان امیر لوگوں کی فطرت ہے۔“

اکبر کا دل چاہا کہ وہ قصائی کو بتا دے، جو گوشت بناتے وقت ایک غریب گھرانے کا قصہ بتا رہا تھا کہ

انہوں نے پہلی دفعہ قربانی دی، جس پر انہوں نے پورے خاندان کو گھر پر مدعو کر لیا، اور سب لوگوں کے شور سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

قصائی کے بھی سر میں درد ہوتا ہے، جو گاہک کو باتوں میں لگا کر گوشت کی ہیرا پھیری کرتا ہے۔

ابھی وہ نور دوا دی آپا کی کچی سے نکلا ہی تھا کہ خالہ فاطمہ اس کو مل گئیں۔

”ہائے میرے بچے قصائی کہاں لے کر جا رہا ہے۔“ خالہ فاطمہ نے ہانپ کر کہا۔ ”میرے بچے امیر اکبر! حلال کروا دے، بچوں کے فون پر فون آرہے ہیں تو تو زلیخا کی ساس کو جانتا ہی ہے، بیشش کی شادی پر اس کو کھانے کا ڈبہ لیٹ ملا تو اس نے زلیخا کی کتنی بے عزتی کر دی تھی۔ زلیخا کی مندریں بھی آچکی ہیں۔ ایسے میں زلیخا کے لیے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔“

خالہ فاطمہ کی پانچ بیٹیاں تھیں، بیشش، زینت کی تو شادیاں ہو چکی تھیں۔ باقی کوثر اور شبنم پڑھ رہی تھیں، کوثر ایم اے میں تھی، جبکہ شبنم ایف اے میں تھی۔

کوثر کے لیے خالہ فاطمہ نے صغراں بیگم سے اکبر کے لیے بات کی۔ صغراں بیگم بھی کوثر کی پرہیزی سے مطمئن تھیں۔ اکبر نے بھی اپنی اے اسی سال کیا تھا، اور ایک فرم میں منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا۔

اکبر نے دوا دی اماں سے کہہ دیا تھا کہ ابھی میرے لیے شادی کرنا ممکن نہیں، مگر جب بھی کروں گا، آپ کی اجازت کے ساتھ ہی ہوگی۔

خالہ فاطمہ کی ایک بیور عات تھی۔ ان کا بیٹا عثمان دینی میں تھا، گھر میں مرد کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اکبر نے قصائی سمیت خالہ فاطمہ کے گھر رکنا مناسب سمجھا۔

دوا دی آپا کے گھر سے تو وہ سوکھے منہ نکلا تھا لیکن خالہ فاطمہ کے گھر پر اس کی خوب خاطر مدارت ہوئی، کوثر نے فروٹ چاٹ کھائی، جو کافی مزے کی تھی، بکرا حلال ہونے سے پہلے ہی خالہ فاطمہ نے بھی فروٹ چاٹ کی پانی کھالی۔ اکبر نے حیرت سے پوچھا۔

”خالہ! آپ نے فروٹ چاٹ کھالی؟“

”اس میں کیا ہوا، کوثر مسکرا کر بولی، وہ چاہتی تھی اکبر اس سے بات کرے اس کو معلوم تھا کہ اس کی ماں کی خواہش اکبر ہے۔“

”ہنسی! قربانی کا گوشت پہلے کھانا سنت ہے۔“

”ہنسا! اب وہ صحت کہاں، جو پانچ گھنٹے کی بھوک کاٹ سکوں۔“ خالہ فاطمہ نے شرمندگی سے کہا۔

اکبر خاموش ہو گیا۔ اس کو اپنی دوا دی صغراں بیگم یاد آ گئیں، جو خالہ فاطمہ سے کافی عمر رسیدہ تھیں۔ بیماری میں مبتلا تھیں، مگر پھر بھی انہوں نے سنت پر عمل کیا۔ قصائی نے بکرا حلال کیا تو خالہ فاطمہ بے تابلی سے بولیں۔

”رائیں سالمہ۔ اور بازو سالم اتار دو، اور سینے کا گوشت اور ہڈی کا گوشت بس سلیتے سے بنا دو۔“ خالہ فاطمہ کے حکم کے مطابق قصائی نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ ”خالہ! گھر میں گوشت بنائیں گی کیا؟“

”ایک ران سالم زلیخا کے گھر جانی ہے، ایک بیشش کے گھر جائے گی اور ایک بازو سالم زینت کے گھر اور ایک بازو بیور عات کے میکے دوں گی۔ اب اس کا شوہر قربانی کر رہا ہے، تو اس کو بھی تو خوش رکھنا ہے، باقی بچا سینے اور ہڈی کا گوشت تو کل تینوں بچیوں اور دلا دلا گھر آئیں گے ان کے لیے پکائیں گے۔“

خالہ فاطمہ نے معصومیت کے ساتھ اپنے بکرے کے گوشت کا حساب بتا دیا۔

شبنم خفگی سے بولی۔ ”اماں بکرے کے گوشت کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک گھر کا دو سرا شتے داروں کا اور تیسرا غریبوں کا اور آپ ہمیشہ غلط حصے کرتی ہیں۔“

”تو کیا کروں، بچیوں کے گھر میں نہ بھیجوں۔ تو سسرال والے تو طعنے دے دے کر جینا حرام کرویں گے۔“ خالہ فاطمہ بگڑ گئیں۔

مکمل ماحولنا حنا

بہنوں کا اپنا ماحولنا

نومبر 2010 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے
نومبر 2010 کے شمارے کی ایک جھک

☆ ”خوشیاں میرے انگن میں“ حمیرا زیباب چندا
کامل ناول

☆ ”ایک لحد جاوداں“ ڈاکٹر نازش امین کامل ناول

☆ ”راستے محبت کے“ شگفتہ بھٹی کا ناول

☆ ”مجھے مکمل کر دو“ نصیر اختر کا ناول

☆ اس کے علاوہ سندس جیس، متاع کاوش، غزال میل، قمر امین، شادی ملک اور ہزارا کے افسانے

☆ ”پیسا سادشت“ فرحت شوکت کا سلسلہ دار ناول

☆ ”میں سحر سے کہو“ ام مریم کا سلسلہ دار ناول

☆ ”میں سقارہ صبح امید کا“ فوزیہ فزل کا ناول

دار ناول کی پہلی قسط

اس کے علاوہ

بیارے محمد علی کی باتیں، انشاء نامہ، انٹرویو، شوہر کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ ستا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں

نومبر 2010 کا شمارہ

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں



رخسانہ نگار عدنان

اولیٰ کا پیڑ

مجھے لگتا تھا کہ میرے دماغ میں موجود بھیہر سنگ کربا ہر آجائے گا اور اسے تو آنا ہی تھا، میرا بھیہر ہی تو پھرا تھا، جو اچھا بھلا اپنے رستے پر جاتے اس شہر کی طرف گاڑی موڑ بیٹھا تھا۔

”میں یہاں کیوں آیا ہوں مجھے کس سے ملنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟“ یہ تین سوال جو اس گھنٹہ بھر کے اذیت ناک سفر میں میں نے کوئی دسویں بار خود سے

ایک انتہائی بے ہنگم ست رو فضول سی ٹریفک کی قطار تھی جو چوٹی کی رفتار سے میری گاڑی کے آگے چل رہی تھی۔

تیز دھوپ اور جس بھرا موسم ارد گرد اڑتی دھول مٹی۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی مختلف پائپ ڈالنے کے لیے نئے گڈھوں کو میوٹیل والے پڑ کرنا بھول گئے تھے یا اس بازار کے دکان داروں کی اپنی کارکردگی تھی۔۔۔ بڑی چھوٹی ایک دوسرے سے کندھا جوڑے بلکہ باقاعدہ ایک دوسرے کے ساتھ جھم گھٹا ہوتی جوتوں، کپڑوں، کاسیٹس، الیکٹرونکس اور ایسی نوع کی ان گنت دکانیں اس دورو پے تنگ سی سڑک کے دونوں جانب کچھ گھٹکھائی ہوئی سی کھڑی تھیں۔

اور ان دکانوں کے آگے فٹ پاتھ کی حدود بے بھی نکلنے آدھی سڑک پر قابض مختلف اشائے خواہنے والی فروٹ بیچتے پھان ریشمی ستے کپڑے بستے جوتے برتن اور دوسری ضرورت کی ان گنت چیزیں جن پر آتی جاتی خواتین کھجور کی طرح رک رک جاتی تھیں جس سے دواں ٹریفک اور لوگوں کے پیدل چلنے کے بساؤ میں رکاوٹ آتی تھی پھر فٹ پاتھ سے آگے سواریوں کے انتظار میں کھڑے رکٹے چنگ چمی اور گاڑیاں۔۔۔ سڑک کون ساموئے جتنی کشادہ تھی، جو پہلے ٹھنڈوں اور گرلوں کے باعث محدود ہو چکی تھی اور اس سانپ جیسی ٹیڑھی بڑی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر زوں زوں چلتی منخوس ٹریفک اور اس اژدحام میں چھپتی میری گاڑی جو نہ اب واپس مڑ کر کہیں اور نکل سکتی تھی اور نہ آگے جانے کی کوئی صورت نظر آ رہی تھی خانچہ فروشوں اور ریڑھی باتوں کی یہی تائیں اور آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی میں تو ایک صابر مذہب شہری کی طرح خاموشی سے گاڑی لیے رہ گیا تھا میرے پیچھے چلنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور نہ اتنے صابر تھے نہ مذہب بے صبری سے بارن پر انگلی رکھے جیسے ان کے اس شور قیامت بپا کرنے سے ٹریفک کو ہر لگ جائیں گے یا سڑک خود بخود کشادہ ہو جائے گی اور ان کا منسلک شور۔۔۔

تعالیٰ کی راہ میں قربانی دی ہے۔ ہم لوگ تو گوشت کھاتے رہتے ہیں ان لوگوں کا سوچو، جہاں دال بھی پکانا مشکل ہے، اور اگر سال میں ایک دن ہم ان لوگوں کو گوشت کھادیں تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔“

صغرا نے یہ کہہ کر اپنے پوتے اکبر کو پیار کیا اور پھر یہ کہہ کر کمرے سے نکلیں۔

”میرے مرنے کے بعد بھی تم سنت ابراہیمی کا بیعت خیال رکھنا۔“

”لوگوں نے تو سنت ابراہیمی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، بکرا خلال کر کے اپنے گھر میں فرزند کر دیا جاتا ہے، اکبر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ وادی آپا کے گھر دیکھ کر آیا تھا کہ ان کی بسو میں اپنے گھر میں گوشت چوری کرتی ہیں کیا کریں۔ وادی آپا سنت ابراہیمی بھول چکی تھیں۔ وہ غریبوں اور رشتے داروں کو نہیں بلکہ پورا بکرا خود اپنے گھر میں رکھنا چاہتی تھیں۔ جبکہ خالہ فاطمہ شاید مجبور تھیں۔ جن کا پورا بکرا بیٹیوں کے سسرال والوں کے گھر کی نذر ہو رہا تھا۔“

اکبر نے کچھ کی ایک بوٹی حلق سے اٹاری تو اس کو یوں لگا جیسے اس کا پیٹ بھر گیا ہو، پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک ایسی صدی آجائے جس میں بکرا خود بول پڑے کہ مجھے خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دے کہ خود اپنے لیے اکبر یہ ہی سوچتے ہوئے سو گیا۔

صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو وادی آپا آئی ہوئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”ابن کا بکرا تیس ہزار کا تھا۔ اور ان کے کافی رشتے دار رہ گئے تھے۔ جن کے گھروں میں گوشت نہیں جاسکا، کیونکہ بکرے میں گوشت ہی کم نکلتا تھا۔“

”بس اب بکرے کی فکر کرنا چھوڑ دو اور دعا کرو کہ ہماری قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول کی ہو۔“ اس کی وادی اماں بار سے کہہ رہی تھیں کہ وہ جانتی تھیں کہ انہوں نے قربانی کا حق صحیح ادا کیا ہے۔ اس لیے وہ مطمئن تھیں، جبکہ نور وادی آپا فکر مند۔

کوثر نے شبم کو تھپڑ رسید کیا اور بولی۔

”ابناورس بند کرو۔“

شبم روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اکبر خاموشی سے قصائی کو اپنے گھر لے گیا۔ کوثر جس نے ایم اے کیا تھا۔ وہ اسے جاہل ان پڑھ لگی۔ اس کو افسوس ہوا، ڈگری حاصل کر لینے سے بندہ پڑھا لکھا نہیں ہوتا، جب تک اس تعلیم پر عمل نہ کیا جائے۔

بچپن سے جب ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے ہوتے ہیں، تو کیوں عمل نہیں ہوتا، اکبر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وادی اماں کو کوثر کے بجائے شبم کا نام دے گا۔ اس کے بعد جو اس کی وادی کا فیصلہ ہو گا، وہ اس کو منظور ہو گا۔

وہ قصائی کو لے کر گھر پہنچا۔ صغرا بیگم نے اپنی بسو مقصودہ کو چار پلیٹیں لانے کا حکم دیا۔ مقصودہ پلیٹیں حاضر کر دیں۔ انہوں نے پھلیوں کو بھرا اور فکر مندی سے بولیں۔

”جلدی سے سامنے چار گھروں میں گوشت دیا جائے۔ انہوں نے ہنسیا تیار کرنی ہوگی۔“

صغرا نے محلے داروں کا سب سے پہلے حق ادا کیا۔ پھر مقصودہ کو دعا دیت دی۔

”پچاس چھوٹے شاعر، چار چار بوٹیوں کے بنا دیے جائیں، اور جو غریب سامنے اس کو دیا جائے۔“

ہر غریب خوشی سے آکر شہر لیتا جا رہا تھا۔ اور صغرا بیگم کو دعا میں دیتا، اکبر کو انہوں نے رشتے داروں کے گھر گوشت بانٹنے کا کام سونپا۔

شام کو اکبر گوشت بانٹ کر گھر پہنچا تو اس کو زور سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ سارا دن مشروبات سے اس نے نکالا، مقصودہ نے کھانا دیا تو اسے حیرانی ہوئی۔ ایک پانی میں تھوڑی سی کھجی اور گوشت کا شوربہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔

”اماں قیے کی نکلیں بھالیتیں اور کھجی بھی اتنی تھوڑی۔“ اکبر خفگی سے بولا وادی اماں بولیں۔

”بیٹا! بکرا چھوٹا تھا، اور تم خود بانٹ کر آئے ہو۔ اللہ

پوچھتے تھے اور جواب نہ ملنے پر اور بھی جھنجھلاہٹ بھجھ
پر سوار ہوئی تھی۔

آگے جاتا ہیپسی کا ڈالر پنا اور منظر جیسے یک لذت
صاف ہو گیا موڑ سے آگے اگرچہ سڑک کے اطراف
بازار اور لوگوں کے رش کی وہی کیفیت تھی بلکہ بازار
کچھ اور بھی تنگ ہو گیا تھا کہ موڑ مڑنے ہی اور گرد
کھانے پینے کی دکانیں ہوئیں وغیرہ بنے تھے وہ ہر کا
ٹائم تھا سو لوگ بچ کے لیے ان سے ہونٹوں پر ٹوٹے پڑ
رہے تھے۔

بھوک تو مجھے بھی لگی تھی۔ مگر مجھے تو شاید
کہیں پہنچنا تھا کہاں؟ معلوم نہیں۔

میں بے مقصد محض اپنی یادداشت کے زور پر آگے
ہی آگے چلا جا رہا تھا۔

یہ گند اس آبادی سے لبریز شہر بہر حال میری یادوں کا
حصہ نہیں تھا جن کو تازہ کرنے کے لیے اچھا بھلا لاہور
کی طرف جانے کے بجائے میں اس طرف مڑ آیا تھا۔

ہم جو ہر آبادی پہنچنے میانوالی سے تو میرے ذرا دور کی
طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور کیوں خراب ہوئی اس
کی وجہ بھی مجھے معلوم تھی اس کی شادی کو زیادہ عرصہ
نہیں ہوا تھا اور اس کا گھر جو ہر آبادی میں تھا تو یہاں پہنچنے
پر اس کی طبیعت تو خراب ہو نا ہی تھی۔

اسے دودن کی چھٹی دے کر میں نے وہیں اتار اور
خود لاہور جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

جانے کیسے بڑی بھڑیاں کا موڑ مڑنے ہی مخالف
سمت میں جاتی سڑک نے کسی طاقت ور مقابلے کا کام
کیا اور میری گاڑی خود بخود اس طرف مڑ گئی۔

اور اب میں احمقوں کی طرح منہ اٹھائے اس نئے

شہر میں سے بیس پچیس سال پہلے والا شہر کھوجنے کی
کوشش کر رہا تھا۔

ایک طرف گاڑی پارک کر کے ایک نسبتاً اچھی
بیکری سے میں نے سینڈویچ اور کوئلہ ڈرنک کی پیاس
سے یوں بھی حال تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر کھاتے
ہوئے میں از سر نو اس شہر کا جغرافیہ دریافت کرنے کی

کوشش کرنے لگا گاڑی سرکاری تھی جس کا اسے سی
حسب روایت خراب تھا جو اس گرمی میں مجھے اس
مندور میں بیٹھنا پڑا تھا۔

گاڑی چلتی جا رہی تھی مگر مجھے اس یاد کا کوئی سراہا تھا
نہیں آ رہا تھا جس سے میں کچھ بھی تلاش کر سکوں۔

ایک موڑ پر میں گاڑی روک کر بغور اس بے تحاشا
رش اور شور والی جگہ کو دیکھنے لگا میری
imagination بالکل ٹھیک کام کر رہی تھی۔

میں سال پہلے یہ جگہ مانگہ اڈہ تھی یہاں دن بھر
گھوڑے ٹانگے کھڑے رہتے تھے اور میوہ کے سولی
گولڈن ٹوٹنی والے نلکے میں اتنی مولی دھار میں بن
یٹھ پانی آتا تھا اور اس نلکے کے گرد سارا دن ماشکی اپنی
چمڑے کی مشکیں اٹھائے پانی بھرتے اور شہر کے مختلف
گھروں میں پہنچاتے تھے۔ پہلے گھر گھر موڑیں تھیں
پانی والی اور نہ نلکے۔ شہر کی بنیادی ضرورتیں اسی
طرح کی دو تین سرکاری نوٹیوں اور ان ماشکیوں سے
پوری ہو جاتی تھیں۔

ایک طرف گھوڑوں کو نعل لگانے کی دکان ہوا کرتی
تھی جہاں ہم بچے سارا دن یہ لوگ اٹھیل دیکھتے
اور تجسس رہتے گھوڑے لوہے کی جوتاں پہنتے اور ہم
اپنی ہر ہوائی چپلوں کو حسرت سے دیکھتے کہ کاش ان کو
بھی نعل لگ سکتے۔

ہم بچے سارا دن اس نلکے کے اطراف مچلے اور
گلیوں میں بہت سے کھیل کھیلتے پکڑ پکڑائی پھور
سپاہی پھوگر مٹی چوبے کا کھیل پھینچ پھپائی برف
پانی گھروں کی ڈیوڑھیاں جس کے کٹڑی کے دروازے
سارا دن کھلے رہتے نہ انٹرل لاک تھے نہ لوہے کے
ہوشیاری گٹ نہ دن دہارے چوری ڈاکے کا ڈر نہ
دہشت گردی نہ ہم بلا سٹ نہ خود کش بمبار نہ ڈرون
حملے اس قسم کے الفاظ تک ڈکٹری میں ابھی مندرج
نہ ہوئے تھے اور یہ صدیوں پرانے نہیں فقط بیس سال
پہلے کی بات ہے۔

ہر گلی کے موڑ پر کھڑے کوئی نہ کوئی گھنا ہرا بھرا
درخت موجود ہوتا تھا اس سرکاری نلکے پر خوب ہرے

بھرے پھیلنے سائے کر رکھا تھا تو پچھلے چوک میں برگد
کے دو درخت تھے ہماری گلی کی ٹکڑ پر سوڑے کا
درخت تھا جب سوڑے پلٹے تو پٹ پٹ خود بخود نیچے
گرا کرتے تھے اور وہ جب جب پڑتے سوڑے ہم
کھاتے یا کسی بڑے کے کپڑوں کے ساتھ شرارت
میں چمکاتے اور وہ املی کا پڑا!

اتنی کاپڑا! میری ساری حیات بیدار ہو گئیں۔
اور مجھے اپنے تئیں سوالوں کا جواب مل گیا اصل

میں میں اس املی کے پڑنے کی تلاش میں آیا تھا۔
چھپن چھپائی پکڑن پکڑائی پھوگر مٹی بادشاہ ملکہ پھور
سپاہی برف پانی ان سارے کھیلوں میں میری ایک ہی
پارٹنر ہوا کرتی تھی زب النساء۔ زبئی۔ زبئی۔

اور جانے کیسے میری گاڑی خود بخود رستوں کی پہچان کرتی
بڑے بڑے سینور بلڈنگز خوبصورت پتھر کے گھروں
لوہے کے مین کیشوں کو نظر انداز کرتی اس محلے تک
جا پہنچی جو میرا بیٹا تھا بقول غلام عباس کے جہاں
میری نعل لگتی تھی۔

وہ محلہ بھی ان میں سالوں میں کسیر ہل چکا تھا۔
ہمارا اپیلی سفیدی والا گلی کے موڑ سے شروع ہو کر
وسط تک جانے والا گھر جانے کہاں تھا یہاں موڑ پر
ایک جدید بینک تھا اس کے ساتھ فوٹو کاپی کی دکان اس
کے ساتھ چھوٹا نائیٹ کیفے اور آگے آگے چند گھر
تھے مگر وہ بھی جدید اور نئے بنے ہوئے۔

”تو وہ لوگ کبھی یہاں سے چلے گئے۔“ میں دل
گرفتگی سے گاڑی لاک کر کے پیدل گلی میں نکل آیا۔

گلی کے گرد بے اونچے مکانوں کے سالوں نے گلی
میں چھایا کر رکھی تھی پہلے کی طرح برسات کی دھوپ
چھاؤں والی پچھلے پھر کی دھوپ تھی موسم نہیں بدلتے
دھوپ اور چھاؤں کا احساس ان کے گھٹتے بڑھتے سائے
بہ ٹانگے لمحے کچھ بھی تو نہیں بدلتے۔ یہ provarb
بالکل غلط ہے کہ موسم بدل جاتے ہیں مجھے یاد ہے
ٹھیک بیس برس پہلے اس گلی میں سمیر کے اواکل میں
ایسی ہی فرحت بخش چھایا ہوا کرتی تھی جس میں ان
کے دھل جانے کا احساس چھپا ہوا تھا آج بھی دھوپ

اس قدر اور چھاؤں اسی رفتار سے مکانوں کی دیواروں
چھتوں کو پھلانگ رہی تھی اگرچہ مکانوں کے قد بہت
طویل ہو گئے تھے تو موسم نہیں بدلتے ہم انسان بدل
جاتے ہیں۔

اور میرے قدم بے اختیار ٹھٹک گئے۔

ماسٹر عبد الحفیظ لی ایسی ایڈی کی مٹی بو سیدہ سفید
تختی اینٹوں کی سال خوردہ دیواروں پر دروازے کے
بالکل پہلو میں ابھی بھی لگی تھی اور کٹڑی کا دروازہ بھی
پہلے جیسا تھا میرے ہاتھ یک لذت سرد سے ہو گئے۔

”دروازہ کھٹکناؤں یا واپس چلا جاؤں؟ نہیں مجھے
چلے جانا چاہیے؟“ دو سرا خیال زیادہ زور آور تھا میں
پلٹ گیا۔

مگر چند قدم چلنے کے بعد مجھے کوئی طاقت پھر سے
واپس کھینچ لائی۔



ماسٹر عبد الحفیظ کا گھر ہمارے ہسائے میں نہیں تھا
بلکہ ہم دو گھروں کے بیچ ایک گھر تھا اس گھر میں آگ
لگی تو ماسٹر عبد الحفیظ کے گھر کہ شہوت نے بھی وہ آگ
پکڑ لی تھی کن کی بلی دیوار ساری کی ساری بھٹک گئی
تھی زبوی چنوں نے سارے محلے کو اکٹھا کر لیا تھا۔
آگ بجھ گئی مگر شہوت جل گیا صرف املی کا پیڑ بچ گیا تھا
اور چھوٹا ساڑ کا بارہ تیرہ سال کا جب مجھے صحن سے
گزار کر ماسٹر عبد الحفیظ کے کمرے کی طرف لے کر گیا
تو املی کا وہ رانا بڑا اگرچہ بالکل بے پھل بے بات کا ہو چکا
تھا مگر کھڑا تھا میں لمحہ بھر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اور ماسٹر جی نے مجھے منٹ کے ستر سو حصے میں
پہچان لیا تھا کہ میرا نام عبدالصمد بھی تو انہوں نے ہی
رکھا تھا۔ پہلے ہمسایوں سے تعلقات رشتہ داروں
سے بڑھ کر ہوتے تھے ابانے ہم تئیں چھوٹوں کے نام
ماسٹر جی سے رکھوائے تھے اور اب شاید زندہ رہتے تو ہم
بیس سال پہلے یہ محلہ بھی چھوڑ کر دوسرے شہر نہ
جاتے۔

”اتنے سالوں بعد آئے کبھی دل نہ کیا ملے کو۔“ ان

کارنگ سالوں کے سائے میں کچھ اور بھی گمراہ ہو گیا تھا آنکھوں پر مونے عدسوں والی سیاہ فریم کی عینک اور ہاتھوں اور چہرے پر بنی جھڑیاں آبشاروں کی طرح خوب ابھری ہوئی تھیں۔

”بس پڑھائی رہی پہلے پھر تین سال کے لیے باہر چلا گیا“ اس کے بعد نوکری۔ ”میں شرمندہ سا مختصر وضاحت کر کے بولا۔

”کہاں نوکری کرتے ہو؟“ ان کے پوچھنے پر میں بتانے لگا۔

”ماشاء اللہ خوب ترقی کی اللہ اور ترقی دے۔“ وہ سر ہلا کر بولے۔

میں خاموشی کے وقفے میں ارد گرد کا جائزہ لینے لگا، ان کا کمرہ کتابوں کی لماری سب پہلے کی طرح صاف ستھرا تھا مگر بے حد بوسیدہ سیلن کی بو سارے کمرے میں رچی ہوئی تھی مگر چہرے دونوں کھڑکیاں صحن میں کھلی تھیں۔

”آپ... ماسٹر جی کیا کرتے ہیں آج کل؟“ بہت دیر بعد مجھے خیال آیا۔

”کچھ بھی نہیں رشتہ ہو گیا ہوں شام میں محلے کے بچوں کو پڑھا دیتا ہوں میری ساری عمر لگ گئی لوگوں کو تعلیم دینے اور ظلم دیکھو تم rate of literacy (شرح خواندگی) کو ہیں اور تو اور یہ جو جعلی ڈگریاں لوگوں کی دھڑا دھڑکتی رہی ہیں ان کی بنیاد بھی تو نہیں پڑی ہوگی تو پھر میری سہل کے کچھ استادوں نے ایسا ہی کیا ہوگی جو یہ اتنا برا قومی چھٹا ہو گیا۔ ریٹ آف لٹریسی میری پوری عمر کھانے کے بعد بھی سمجھو وہی بیسی کا بیسی (بیس) کرنا بھٹ ہے سب نرا ایک واس یہ سروے یہ اعداد و شمار کہ ہمارے ہاں خواندگی پچاس فیصد ہو گئی“ آدھے تو سمجھو جعلی نکلے عبدالصمد! میری تو عمر کی محنت اکارت گئی ہیں وہ پشیمانی سے ہاتھ ملنے لگے۔ ریٹ آف لٹریسی کیا بھولی ہوئی نرم ماسٹر جی نے یاد کرائی تھی۔

”بھی میری اور زیو کی شرط لگا کرتی تھی ہم دونوں ملے۔

کر اس ملک میں شرح خواندگی کو کو سو نہیں تو نوے فیصد تو ضرور لے جائیں گے باقی کے اسی فیصد بعد میں پڑھائیں گے۔

”ہم دونوں ماسٹر جی کے طرح استاد بنیں گے اور صرف کلم پھیلائیں گے۔

اور اس وقت یہ بتا نہیں تھا ہمارے یہاں علم کو نہیں دولت کے پھیلاؤ کو اہمیت دی جاتی ہے۔

”ماسٹر جی زب النساء! ہم بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

اور اس وقت سیاہ برقعے میں ملبوس سرو قامت گندی رنگت متمتاتے چہرے کے ساتھ اوپر کے نقاب کی ڈوریاں کھوئی آف تو بے ابا یہ برسات اور جس تو اس دفعہ جانے کا نام نہیں لے رہی وہ ٹھٹھن اور جس کہ بس پوچھو تا اور پٹ پٹ برقعہ کے ٹٹن کھولتی ہے اختیار اس کے ہاتھ بھٹ سے گئے۔

روشنی سے نیم کلمجہ کمرے میں آکر شاید کچھ دیر کو منظر اس کی سمجھ میں نہیں آیا اس نے بے اختیار برقعے کے اندر سے کھینچ کر وہ پٹ نکالا اور اپنے ارد گرد پھیلاتے ہوئے برقعہ اتار دیا۔

”زیو دیکھو یہ کون آیا ہے عبدالصمد۔ اپنے مختار بھائی کا بیٹا پچھانائے۔“

”پچان ہی تو چکی ہوں اب“ وہ ایک گہری نظر مجھ پر ڈال کر زیر لب بولی۔

”کیسی ہیں زب النساء؟“ میں نے شاید پہلی بار اس کا پورا نام لیا تھا۔

”میں کچھ لاتی ہوں۔“ وہ جواب دیے بغیر فوراً سے باہر نکل گئی۔

”میری جگہ اسکول میں نوکری مل گئی اسے مجھ سے زیادہ پڑھی ہے ایم اے کیا پھر ایم اے اور اس پگ کو بھی میری طرح جنون ہے ہمارے ملک میں شرح خواندگی سو فیصد ہو جائے، سمجھتا ہوں۔ اب لپٹی کیوں اپنی عمر برباد کر رہی ہے یہاں کچھ نہیں ہونے والا پر جانے کیسا جنون ہے اسے۔“ وہ بتانے لگے اور میں کم صم بیٹھا رہ گیا۔

”شادی... شادی نہیں کی آپ نے زب النساء کی؟“

”کہاں دیوانی کہتی ہے میری۔ پتنگ سے شادی ہو گئی ہے۔ اب کون سمجھائے اسے۔“

اور میرے دماغ میں چھماکا ہوا۔

”زیو! ہم دونوں شادی نہیں کریں گے، بلکہ جوا کی طرح اس جہالت سے لڑیں گے، علم پھیلائیں گے اپنے ملک کو تعلیم میں اور صفائی میں یورپ امریکہ کی طرح نمبرون بنائیں گے اور بڑے ہو کر ہم دونوں آپس میں شادی کریں گے۔“ میں اسے اکثر ترغیب دیتا اور اس آخری فقرے پر وہ جوتی اتار کر مجھے مارنے کو ڈورتی اور پھر پورے مکے میں، میں آگے آگے اور وہ پیچھے ہوتی۔

ہم دونوں کا یہ مذاق جو ہمارے لیے باقاعدہ کھٹ منٹ بھی پورے اٹھارہ برس کی عمروں تک چلتا رہا اور انیف ایس سی کے بعد جب میں امی اور ماموں بھائیوں کے ساتھ لاہور جانے لگا تو بھی زیو کو ہی یاد دہانی کروا کے آیا کہ صرف بی ایس سی کرتے ہی میں واپس آجاؤں گا ہم دونوں اپنا اسکول کھولیں گے اور پڑھوں، جوانوں بچوں سب کو مفت تعلیم دیں گے۔ پھر کیا ہوا بیچ میں تیس سال آگئے۔

اور ان بیس سالوں میں ہم دونوں ایک دوسرے کو بھول گئے تو کھٹ منٹ ابھلا کیا یاد رہتی۔

میں نے ظاہری راستہ اور کتاب سرو کرتی۔ سنجیدہ صورت زیو کو چپکے سے دیکھا جس نے شاید اس عمر کے اس معمولی سے مذاق کو واقعی کھٹ منٹ جان لیا تھا۔



میں جب ماضی کے روشن باب سے باہر نکل آیا تھا تو پرنے اپنے گھونسلوں میں لوٹ چکے تھے۔

”آپ کے دو خطوط جو آپ لوگوں کے جانے کے بعد غلطی سے ہمارے ایڈریس پر آگئے تھے۔“

اس نے لکڑی کے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر مجھے رخصت کرتے سے دو بوسیدہ پہلے لفافے مجھے

تھمائے اور میں دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے یہ دونوں خط زیو کو لاہور جا کر لکھے تھے اور

خوب پی کی قسمیں کھائی تھیں کہ میں واپس آؤں گا، ہم دونوں مل کے اسکول کھولیں گے اور پھر شادی کریں گے۔

اور یہ غلطی سے نہیں بلکہ ان ہی کے ایڈریس پر میں نے بھیجے تھے۔

میں دونوں خط ہاتھ میں پکڑے شرمندہ سا کھڑا رہ گیا۔

”مسوری زیو! میں بھول گیا تھا۔“ بہت دیر بلا میرے منہ سے نکلا۔

”بھول ہی تو گئے ہیں ہم پچھلے تریسٹھ برسوں سے سب کچھ بھول گئے ہیں تو کیا ہوا جو آپ تیس سال پرانا

فضول ساعد بھول گئے۔“ وہ میرے ساتھ اتنا آہستہ آواز میں بولنے لگی تھی یا واقعی کم بولنے لگی تھی۔

”اور آپ بھول گئے تو کیا میں نے تو یاد رکھا نا وعدہ اگر سو فیصد پورا نہ بھی ہو تو کوئی بات نہیں پچاس فیصد تو پورا ہو گیا تم نے کیا میں نے بات تو ایک ہی ہے۔ خدا حافظ۔“

کہہ کر وہ میرا اگلا جملہ سنے بغیر پیچھے ہٹ گئی اور

اواسٹ تاریخوں کے نیچے مجھے چاند کی روشنی میں سر جھکائے اور سناہن املی کا پیڑ کتنا اکیلا لگ رہا تھا اور اس کی

طرف رخ کیے زب النساء اس پیڑ سے بھی اکیلی۔

پہلی بار مجھے خود سے گھن آئی ایک وعدہ خلاف شخص سے۔

اسی وقت سیل فون کی بپ بجنے لگی۔

”فون! کہاں رہ گئے آپ زیو! میڈیوں سے گر گئی

ہے میں اسے ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔“ سیمائی جھنجھائی گجرائی آواز پر جیسے میں کسی حکم سے باہر نکل

آیا میں بھگتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور اندھا دھند ڈرائیو کرتا آدھے گھنٹے میں ماضی کے شہر سے نکل آیا۔

میرے دماغ میں صرف زیو کی پریشانی تھی نہ املی کا پیڑ نہ زب النساء کا اکیلا پن اور نہ اپنا کوئی بھولا ہوا وعدہ۔

دعاؤں کے حصار

”جیتی رہو بیٹی! اللہ خوش رکھے، نصیب اچھا کرے۔“ ایک گلاس پانی پی کر بی وادی کی دعا میں یونہی شروع ہو جایا کرتی تھیں۔

”آمین!“ عازنہ نے گلاس واپس لیتے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ کہا۔

”وادی! مجھے بھی دعا دیں۔“ قریب بیٹھی شہزائے فرمائش کی۔

”اللہ میری ہر بیٹی کا نصیب اچھا کرے، سب کے مقدر میں بہت ساری خوشیاں لکھے۔“ وادی نے دعا میں سب ہی کو لے لیا۔

”اور میں؟“ ذرا دور بیٹھا نصیب موبائل کی رنگ ٹون تبدیل کر رہا تھا، جلدی سے بولا۔ ”بس پوتیوں کو دعا میں دیتی ہیں اچھے مقدر کی۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔“

”گو یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، تمہارے لیے بھی دعا کرتی ہوں میں، بس یہ ہے کہ تم تو لڑکے ہو، تمہاری اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کہ لڑکیوں کا ہوتی ہے، بڑے

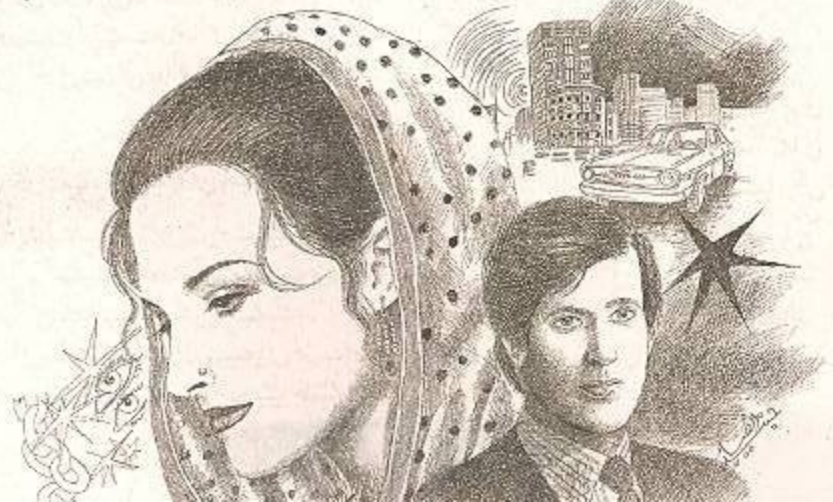
بوڑھے کہہ گئے ہیں لڑکیوں سے ڈر نہیں لگتا ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے اس لیے اچھے بیٹھے، ہر دم اچھے نصیبوں کی دعا کرتی ہوں ان کے لیے۔“ وادی نے وضاحت کی۔

”اللہ میرے بچے کو بھی چاندی دلن دے، صحت و تندرستی دے، خوشیاں دکھائے۔“ وادی نے نصیب کی فرمائش بھی پوری کر دی۔

”چاندی دلن؟ اللہ معاف کرے وادی! اس میں تو اتنے بڑے بڑے کڑھے اور بھیا تک غار ہیں، اوپر سے سانس لینے کے لیے ہوا بھی نہیں، آکسیجن سلنڈر ساتھ ساتھ لے کر چھو۔“ نصیب نے برا سامنے بتایا۔

”اور کیا وادی! چاند بظاہر چمکتا نظر آتا ہے، مگر اندر سے بڑا تاریک ہے، پھر اس کی چمک اور روشنی بھی سورج کی مرہونِ سنت ہے۔“ شہزائے بھی اپنی معلومات کا رعب بھاڑا، آخر نویں جماعت کی طالبہ تھی وہ بھی ذہین فطین۔

”ارے تجھی تم تھمرے آج کے دور کے پڑھے



لکھے بیچ، ہم پہلے کے وقتوں کے بڑے بوڑھے یہ سب سائنسی باتیں نہیں سمجھتے، بس اتنا معلوم ہے کہ چاندی دھن لائے کا اربابان جانے کتنی نسلوں پر اتارے سو ہم نے بھی وہی دعا دے دی جو اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔ ”داوی مسکراتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کر رہی تھیں، اور ان کی وضاحت سن کر ان کے پوتے صاحب اور دونوں پوتیاں مسکرا رہے تھے۔“

”اچھا بھئی بیچوں، ہم اب چلے بہت نامم ہو گیا، پھر تہجد میں اٹھا نہیں جاتا، چل شراب اپنے اماں! باوا کو بلا، کہاں ہیں؟“ داوی نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

”اچھی کہاں چل دس داوی؟ آپ نے میرا غرارہ بھی نہیں کانا، کئے گا نہیں تو سلے گا کیسے اور سلے گا نہیں تو میں عائشہ کی شادی میں کیا پنوں گی؟“ شرابا ٹھنکی۔

”ارے خدا کا خوف کر لو! عائشہ کی شادی میں تو ابھی پورے دو ماہ بڑے ہیں، جب تک تو درجنوں غرارے سل جائیں، اور ویسے بھی تو نے بتایا بھی مجھے شام کو، اب نظر تم جوانوں کی طرح تھوڑی کام کرتی ہے، برہائے کی نظر ہے، کچھ کا کچھ کٹ جائے تو دن میں بتاتی تو کٹ دیتی، پوری دوپہر فارغ بیٹھی باتیں بگھارتی رہی، غرارے کا نہیں بتایا، چل اب اگلے بیٹے چکر لگاؤں گی تو کٹ دوں گی۔“ داوی نے اسے تسلی دی۔

”افو! جانے کی ضرورت کیا ہے، آپ بس بیٹیں رُک جائیں، وہاں اکیلے آپ کا دل کیسے لگتا ہے، مجھے تو اکیلے گھر میں ایسی وحشت ہوتی ہے، اللہ توبہ۔“ شرابا نے کانوں کو ہاتھ لگا لے۔

”بی بی! قبر میں اکیلی ہی رہو گی، وہاں تمہاری چھ درجن سہیلیوں کا جمگھٹا نہیں ہوگا۔“ فیب بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا مضبوط نہیں کر سکا بول اٹھا۔

”ہاں تو قبر میں تو سب ہی اکیلے جائیں گے، وہ تو مجھے بھی پتا ہے، اچھا اب بات کو گھما میں نہیں، داوی کو بیٹیں چھوڑ جائیں، ایک دو بیٹے کے لیے۔“

شرابا نے فیب کو گھورا، جو ان کی داوی پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ بے شک وہ فیب کی بھی داوی تھیں، مگر شرابا کی بھی تو تھیں، پھر یہ کیا بات ہوئی کہ وہ مستقل فیب ہی کے ساتھ رہتی تھیں، بس کبھی بیٹے، دس دن میں باپ بیٹوں کے گھر چکر لگایا یا کبھی بھار ایک آدھ دن ٹھہر گئیں، وہ بھی بچوں کے بے حد اصرار پر شرابا کو کبھی کبھی فیب بھائی سے بڑی چڑ ہوئی تھی۔

”اور کیا داوی! لڑک جاسیں نا، کتنے دن ہو گئے آپ رہنے کے لیے تو آتی نہیں۔“ عازرہ نے بھی ان کے پاؤں دباتے شکوہ کیا۔

”ارے میری چاند! میرا کیا ہے، ایک آنکھ تم ہو، ایک آنکھ وہ سب سے ہی محبت ہے، بس رکنے کا معاملہ ذرا ٹھہرا ہو جاتا ہے، بیچ کو پریشانی ہو جاتی ہے کھانے پینے کی، پھر گھر بالکل اکیلا ہو جاتا ہے، ماسی آئے بھی تو کام کیسے کرے، یہ تو صبح تالا لگا چلا جائے گا، پھر صفائی نہیں ہوگی تو گندے گھر میں یہ بھی نہیں رکے گا، بھاگا بھاگا یہاں آجائے گا کہ داوی گھر چلو۔“

داوی نے تفصیل کے ساتھ اپنے منہ رکنے کے جواز پیش کیے۔

”اتنے بڑے ہو گئے، ذرا سا گھر کا کام خود نہیں کر سکتے، صفائی کرنے میں اور کھانا پکانے میں کیا مشکل ہے؟“ شرابا نے بڑی آسانی سے مسئلے کا حل پیش کیا۔

”اے لڑکی! میری داوی کو زیادہ پٹیاں پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، دو ویسے ہی بھولی بھالی ہیں، تمہاری باتوں میں آگئیں تو میرا کیا ہوگا؟“ فیب نے شرابا کو گھورا۔

”آئیں داوی گھر چلیں۔“

”ابو کو تو آنے دس، وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔“ شرابا نے جواباً فیب کو گھورا، جو آج داوی کو گھر لے جانے پر تھکا ہوا تھا۔

”یہ لڑکا شروع سے ہی دوائی کھانے کا چور ہے، اسے باندی سے دوائی دے رہی ہو یا نہیں؟“ داوی اپنے بیٹے کے متعلق بات کر رہی تھیں جو گھٹیا کے مرض کی وجہ سے کہیں بھی آنے جانے سے معذور ہو گئے تھے، کبھی کبھی گھٹنوں اور پیروں کی سوجن اتنی

بڑھ جاتی کہ وہ قریبی مسجد جانے سے بھی معذور ہو جاتے، پچھلے کچھ ہفتوں سے ان کی سوجن۔۔۔ بڑھ گئی تھی، مجبوراً وہ مسجد جانے کے بجائے گھر میں ہی نماز پڑھ رہے تھے۔

”لڑکا؟ کون لڑکا؟“ شرابا اک دم چونک پڑی، جبکہ عازرہ اور فیب داوی کے اپنے بیٹے کے لیے لفظوں کے انتخاب پر مسکرا رہے تھے۔

”ارے یہ ہی تمہارا باپ اور بھلا کس کی بات کر رہی ہوں میں۔“ داوی اپنے مخصوص لہجے میں بولیں اور سب کی ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

”بھئی! اولاد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے والدین کے لیے تو ہمیشہ بچہ ہی رہتی ہے نا!“

”ہاں یہ تو ہے۔“ فیب نے بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ سر ہلایا۔ ”جب میں دادا، نانا بن جاؤں گا تو داوی مجھے اسی طرح آواز دے کر بلایا کریں گی، اے لڑکے! ذرا اوسر تو آ۔“ فیب نے داوی کے انداز میں کہا۔

”ہاں، میں تو قیامت کے پورے بیٹے کے لیے زندہ رہوں گی، ہے نا!“ داوی نے اپنے شرابی پوتے کو محبت سے گھر کا۔

”چل شرابا! پورا دیکھ کر تو آ، تیرے باوا نے سلام پھیر لیا ہو تو میں اسے خدا حافظ کہہ دوں۔“ داوی شرابا سے مخاطب ہوئیں۔

”اچھا داوی!“ شرابا انتہائی فرماں برداری اور شرافت سے اٹھ کئی۔

”ابو دعا مانگ رہے ہیں۔“ شرابا نے واپس آکر انہیں بتایا۔

”اچھا!“ داوی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

”دعا مانگ رہے ہوں گے کہ اللہ میری چھوٹی بیٹی کو ہدایت دے اور اسے بھی بڑی بیٹی کی طرح نیک پروین بنادے۔“ فیب نے شرابا کو چھیڑا۔

”جیسے آپ خود ہیں، ویسا ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔“ شرابا نے فوراً چپ کر لیا، جبکہ عازرہ فیب کی بات پر چیخپ کر مسکرائے لگی تھی۔

”داوی! میرے غرارے کا کیا ہوگا؟“ شرابا نے داوی کو اٹھاتا دیکھ کر منہ بسورا۔

”آپ دو تین بعد آجائے گا نا!“ اس نے پھر اصرار کیا۔

”جی نہیں، پاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے یا کنواں خود چل کر پاس کے پاس آتا ہے؟ تمہارا کام ہے، خود آؤ داوی کے پاس، تمک کر سات سلام کرو، پھر عازبان کرو۔“ فیب مسلسل شرابا کو زچ کرنے میں لگا ہوا تھا، اور وہ بھی اپنی ننھی سی ٹانگ سیکڑ سیکڑ کر اسے جوابات سے نواز رہی تھی۔

”چل چپ ہو جا لڑکے! ہر وقت میری بچی کو تنگ کرتا رہتا ہے، یہ تو میری بڑی پیاری بیٹی ہے تو فکر نہ کر بچی! میں تیرا غرارہ کٹ بھی دوں گی اور سلوا بھی دوں گی۔“

داوی نے فیب کو ڈانٹا اور پوتی کو چکار کر تسلی دی اور اٹھ کھڑی ہوئیں، پھر برابر والے کمرے میں چلی گئیں اور کچھ دیر بعد واپس آئیں۔

”جاؤ نا! بڑے ابو کو خدا حافظ کہہ آؤ، وہ نماز پڑھ چکے ہیں۔“ داوی فیب سے مخاطب ہوئیں۔

”اچھا!“ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”داوی! اب دوبارہ جلدی آئے گا اس بار بھی آپ پورے تین بیٹے بعد آتی ہیں۔“ عازرہ کھڑے ہوئے ہوئے کہنے لگی۔

”ارے ہاں بچی، کیا کروں، دل تو ہمیں پڑا رہتا ہے، مگر بس مسئلہ سارا یہ ہی ہے تاکہ لے کر کون آئے مجھ بوڑھی جان کو، یہ لڑکا تو صبح کا گیارہ گئے تک آتا ہے، ایک چھٹی کا دن ملتا ہے تو آدھا دن سو کر گزارتا ہے، باپ آوے دن میں ہفتے بھر کا سودا سلف لاتا ہے، پھر گھر کے سترے بستر کام ہوتے ہیں، کبھی کوئی چیز خراب ہوگی، کبھی کوئی مسئلہ ہو گیا، بس اس میں چھٹی کا دن بھی گزر جاتا ہے، کبھی تو مجھے بھی ترس آتا ہے کہ بچے کو دو گھنٹی کا آرام نہیں ملتا، خیر پھر بھی میرے کئے بغیر یہ سب کے گھر لے ہی جاتا ہے مجھے، اللہ اسے حیاتی دے، خوشیاں دے۔“

”آمین!“ عازنہ نے جیکے سے دل ہی دل میں کہا پتا نہیں کب سے مانی اس کی آنکھوں میں خواب بن کر سجنے لگا تھا۔ کب اور کیسے اس کی چاہت و ہرمنوں میں شامل ہو گئی عازنہ کو خبر ہی نہ ہوئی، احساس تب ہوا جب اسے مانی کی آمد کا شدت سے انتظار رہنے لگا۔ اس کے آنے پر عازنہ کی خوشی بیان سے باہر ہوئی، مگر اپنی آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی مسکان اور دھڑکنوں کا شور وہ بڑی احتیاط سے سب سے چھپائے رکھتی، جیکے کے اس خاموش محبت میں کسک بھی تھی اور مڑا پیچھے۔ محبت کے سمندر میں زندگی کی ناؤ ڈال دی تھی۔

مقدر میں طوفان ہے یا ساحل۔
وہ اپنے مقدر سے بے خبر تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی مانی نے سب سے پہلے لاؤنج کی لائٹ جلائی، داوی کو اندھیرے میں بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔

”توبہ توبہ قبر کی اندھیری کوٹھڑی میں کیا حال ہو گا“ دنیا کا ذرا سا اندھیرا برداشت نہیں ہے۔ ”داوی صوفے پر بیٹھ کر توبہ بھی کرتی جاتیں۔

”پانی پی لیں۔“ دانی ٹھنڈے پانی کی بوتل فریج سے نکال لایا اور پانی گلاس میں ڈال کر انہیں دیا۔

”اللہ تیرا شکر ہے“ ٹھنڈا پیٹھا پانی بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔“ انہوں نے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا اور وہیں صوفے پر کشن لگا کر لیٹ گئیں۔

”جھلا جتاؤ گاڑی میں گئے گاڑی میں آئے“ پھر بھی ایسی تھکن ہو رہی ہے جیسے میلوں پیدل چلی ہوں، مجھ پر تو کچھ زیادہ ہی بڑھاپا آگیا۔“ وہ خود سے ہم کلام تھیں۔

”صبح فجر سے بھی پہلے کی جاگی ہوئی ہیں، تھکن نہیں ہوئی تو اور کیا ہو گا۔“ مانی بھی پانی کی بوتل فریج میں رکھ کر آیا اور نیچے کارپٹ پر تکیہ لگا کر لیٹ گیا۔
”اے ہائے خالی ڈھنڈا رگھر بھی کیسا برا لگتا ہے“

ہے نا! کچھ دیر بعد وہ پھر شروع ہو گئیں۔
”خالی کہاں ہے؟ دو افراد اتنا سارا سناو سامان کیا یہ کسی گنتی میں نہیں؟“ مانی نے لینے لینے جواب دیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔

”گھر کوئی سامان سے تھوڑی بنتا ہے انسانوں سے بنتا ہے، جو اس میں رہتے ہیں، تیری دامن گھر میں آجائے تو کچھ رونق ہو، پھر یہ مکان گھر بنے گا۔“ داوی آج کل کسی نہ کسی بات پر اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑ رہی تھیں۔

”تو لے آئیں کوئی ذات شریف، جو اس مکان کو گھر بنا دے۔“ مانی آنکھیں بند کیے کیے ہی ان سے باتیں کر رہا تھا، اور یونہی باتیں کرتے کرتے وہ نیند کی دواویوں میں پھنسنے لگا، اس کی پرانی عادت تھی۔

”آج کل میں بھی بڑی سنجیدگی سے یہ ہی سوچ رہی ہوں۔“ داوی کی پُرخیال نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ کیس اور تھا، وہ لڑکی ان کے ذہن کی اسکرین پر بھی، جسے وہ مانی کو دامن بنا کر اس گھر میں لانا چاہتی تھیں۔

”اور میں بھی آج کل بڑی سنجیدگی سے کسی کو سوچ رہا ہوں۔“ مانی کی آنکھوں میں وہ چمکا دکھتا چہرہ آگیا۔ جس پر کچھ تکلیف اور کچھ غصے کے آثار نے اس کا حسن اور بڑھاپا تھا۔

”اگر وہ زندگی میں شامل ہو جائے تو؟“ مانی کا خوابیدہ ذہن بھی وہی بات سوچ رہا تھا جو کئی روز سے دن میں جاگتے میں اس کے خیالوں میں تھی۔

وہ ہمارے ایک رات تھی، اس کے دوست نوحہ کا ولیمہ تھا۔ رنگ ہی رنگ، روشنی ہی روشنی، خوشبو ہی خوشبو، چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، فضا گلاب اور موتیے کے علاوہ مختلف مصنوعی خوشبوئیاں سے بوجھل تھی، فیصہ بڑی دلچسپی سے محفل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”پتا نہیں یہ چار یا کارٹولہ کب آئے گا؟“ اس نے اپنے بانی دوستوں کے بارے میں سوچا، جنہیں وہ چار یا کارٹولہ کہا کرتا تھا کہ چاروں ایک ہی محلے کے تھے اور

ایک ہی ساتھ ان کا آنا جانا ہوتا تھا۔
ایکے بیٹھے بیٹھے جب اسے پوریت ہونے لگی اور انتظار طویل سمجھ گیا تو اس نے باہر کھڑے ہو کر دوستوں کا انتظار کرنے کو ترجیح دی اور باہر آنے لگا۔

”اف خدا یا! آب دیکھ کر نہیں چل سکتے۔“ ایک نسوانی آواز پر وہ غیر شعوری طور پر رک کر آواز کا مبع دیکھنے لگا۔ اس کے قریب ہی وہ کھڑی تھی اور اپنے سامنے ایک سوئڈ بوئڈ صاحب کو غصیلی نظروں سے گھور رہی تھی۔

”پورا پاؤں پھل کے رکھ دیا ہے میرا آپ کے اس ہتھوڑے نما شوڑنے۔“ وہ غرائی۔

”اکی ایم سوری میم امیں جلدی میں تھا، دیکھ نہیں سکا، آتم ایکسٹری سوری۔“ وہ صاحب خجالت سے منمنائے۔

”اوہ نہ! سب سے آسان یہ ہی لفظ کہتا ہے“ سوری۔“ اس نے ایک بار پھر ان ہی صاحب کو گھورتے ہوئے آگے کی طرف قدم بڑھا دئے، اس نے ذرا حادوہیاں دینے کی بھی دھت نہیں کی کہ اس کے بہت قریب کھڑا فیصہ کتنی دلچسپی اور حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ اندر لگائی غیب کو یوں لگا جیسے ارد گرد کی ساری روشنیاں چمک اور رنگ اک دم سے ماند پڑ گئے ہوں۔

کبھی کبھی اس پاس کا حسن کسی وجود کا مہزون منت ہوتا ہے، وہ جائے تو سب خوب صورتی بھی اسی کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ فیصہ لاشعوری طور پر اندر کی طرف واپس مڑ گیا۔

وہ کوئی ایسا چھوڑا یا ظاہری حسن پرست انسان تو نہیں تھا۔ اتھا خاصا سمجھ دار، تعلیم یافتہ اور باشعور تھا، مگر نہ جانے کیوں آج اس چہرے نے اسے ٹھنک جانے اور پھر اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں جان میں اندر کھڑا وہ ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔ مگر اس بار اس کا مطمح نظر وہ ہستی تھی جو محض چند منٹوں میں اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرا آئل

SOHNI HAIR OIL

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔

☆ بے بال آگاتا ہے۔

☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔

☆ خردوں، مورتوں اور بچوں کے لئے

☆ یکساں مفید۔

☆ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوہنی ہیرا آئل

قیمت = 80 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا ہر جڑی بوٹی کا مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں، مگر اپنی ہی دقت خریدنا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 70 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آؤرنگی کر جیٹرز پارسل سے منگوا لیں، ہر جڑی بوٹی سے منگوانے والے سنی آؤر اس حساب سے منگوائیں۔

1 بوتل کے لئے = 100 روپے
2 بوتلوں کے لئے = 180 روپے
3 بوتلوں کے لئے = 270 روپے
نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

سنی آؤر جیسے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگی ب، مارکٹ، سیکنڈ فلوئر، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دقیقہ خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرا آئل ان چوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس 53 اورنگی ب، مارکٹ، سیکنڈ فلوئر، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

پراسے کبھی بھی یقین نہیں رہا تھا مگر آج اس وقت پہلی بار وہ اس بارے میں تذبذب کا شکار تھا۔ کیا واقعی پہلی نظر کی محبت کا کوئی وجود ہوتا ہے یا بس ہماری وقتی فیلنگز ہوتی ہیں وہ بے چینی سے اس چہرے کو کھوجتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کیا ایک اسے اپنا گوہر مقصود نظر آگیا۔ وہ اسٹیج کے پاس کھڑی نوافل کی اسی سے بات کر رہی تھی۔

غیب نے نوافل کی تلاش میں ادھر ادھر نظر سر دوڑائیں اور اس کے لیے اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ ڈنرسوٹ میں لمبوس، گلے میں موٹے موٹے سرخ گلابوں کا پار ڈالے وہ زیادہ دور نہیں کھڑا تھا، دو میزوں کے بعد تیسری میز پر وہ چند مہمانوں سے علیک سلیک کر رہا تھا۔

غیب تیزی سے اس کے پاس جا پہنچا۔
”کیا ہوا؟ یہ اپنے چار یار پیچھے نہیں ابھی تک؟“
نوافل مہمانوں سے فارغ ہو کر غیب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ان ہی کا ہی انتظار کر رہا تھا، پتا نہیں کہاں رہ گئے۔“ غیب نے اس کی بات کا جواب دیا۔
”اچھا، آرہے ہوں گے۔“ نوافل نے اسٹیج کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
”ایک بات سن یا!۔“ غیب نے بے تابی سے اسے روکا۔

”ہاں! وہ ٹھہر گیا۔“
”یہ لڑکی کون ہے کیا تو جانتا ہے؟“ غیب اس سے انتابے تکلف تھا کہ یہ بات باآسانی ہو چکی۔
”اوہ، تو اور لڑکی؟ پتھروں میں جو تک کب سے لگ گئی۔“ نوافل نے اسے چھیڑا۔
”آئی ایم سیریس یار!“

”ہاں ہاں ظاہر ہے، پہلی بار کسی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہے تو سیریس ہی ہوگا۔“ نوافل مسکرایا۔
”اب کچھ منہ سے چھوٹے گا بھی یا یونہی فالتو بانکتا

رہے گا؟“ غیب نے اسے گھورا۔

”اچھا۔۔۔ تیار ہوں یہ جو میری امی کے ساتھ کھڑی ہے؟“ نوافل نے تصدیق کی۔
”ہاں۔“

”یہ محترمہ ہمارے محلے میں ابھی کچھ ماہ پہلے شفٹ ہوئی ہیں، ہماری لائن میں تیسرا گھر ہے، والد فوت ہو چکے ہیں باقی حدود اربعہ میں کچھ نہیں جانتا۔“
”اچھا!“ غیب کے دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ رابطہ اور رسائی اتنی مشکل نہیں۔

”ابنیں انکسج تو میں؟“ اچانک اسے خیال آیا۔

”پتا نہیں۔“ نوافل نے کندھے اچکائے۔

”تو کئے تو پوچھ کر آؤ؟“ وہ پھر شرارتی ہوا۔

”تینکی اور پوچھ پوچھ۔“ غیب مسکرا اٹھا۔

گھر اگر بھی وہ ان ہی خیالوں میں گم رہا نہ جانے کیا بات تھی اس میں کہ اس طرف سے دھیان ہی نہیں ہٹ رہا تھا۔

آج بھی اس کو ایسے ہمراہ خواہوں میں دیکھتا رہا۔

”چلو غیب! صاحب آپ تو گئے کام سے۔“

صحنہ گھر کے اندر لڑائی لیتے ہوئے غیب خواہ مخواہ مسکرا اٹھا۔

نہا وہ کو تیار ہوا تو وادی اس کے لیے اسٹیٹ اور توس تیار کر کے میز پر رکھ چکی تھیں، وہ خود تو علی الصبح ہی ناشتا کرنے کی عادی تھیں، فجر کی نماز اور درود و طائف سے فارغ ہو کر وہ ناشتا کرتیں۔ اور غیب کی روٹین بھی کم و بیش یہی تھی، فجر کی نماز کے بعد وہ یا تو تھوڑی دیر واک پر چلا جاتا یا گھر پر ایک سرساز کرتا، پھر وادی کے ساتھ ناشتا اور پھر آفس جانے کی تیاری، مگر جب سبھی اس کی فجر کی نماز قضاء ہو جاتی تو یہ زمین تبدیل ہو جاتی، پھر تو بس اسے ناشتا کر کے آفس بھاگنے کی جلدی ہوتی، جیسا آج ہوا، وادی نے اسے دو چار بار آوازیں بھی دیں، بلایا بھی، مگر وہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ کس سے مس نہیں ہوا، اور اب بھاگ بھاگ تیاری کر رہا تھا۔ جلدی جلدی ٹائی کی ناٹ پاندھتے ہوئے اس نے کرسی چھینٹی، دو چار لمحوں میں سلاکس اور اینڈ اکھایا، بوس کا گلاس غنا غٹ چڑھایا اور نشوونما

سے ہاتھ اور منہ صاف کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

چائے وہ بہت سی کم پیتا تھا، گرمیوں میں تو بالکل نہیں اور سردیوں میں زیادہ تر کافی چلاتی۔

”ناشتا تو ٹھیک سے کرتا جا لے!“ وادی نے اسے اٹھتے دیکھا تو ٹوکا۔

”بس وادی! کر لیا، بہت لیٹ ہو رہا ہوں میں، اچھا خدا حافظ۔“ غیب نے گاڑی کی چابی ہاتھ میں اور موبائل جیب میں رکھا، بریف کیس اٹھایا اور انہیں سلام کرتے ہوئے نکلے لگا۔

”اچھا خدا حافظ، اللہ اپنی حفظ و امان میں رکھے، خیریت سے جاؤ، خیریت سے آؤ۔“ وادی اس کے پیچھے پیچھے پورج میں آئیں۔ غیب نے گاڑی نکال لی لوگیٹ بند کر کے اندر آ گئیں۔

ساڑھے نو، دس بجے تک ماسی آتی تھی، اس سے اپنی نگرانی میں جھاڑ پوچھ اور صفائی کروا کر وہ تھوڑی دیر آرام کرتیں، دس پر میں کھانا پکانے کا کوئی خاص تردد نہیں کرتی تھیں، البتہ شام میں اہتمام سے کھانا پکاتیں، غیب کو باہر کھانا کچھ خاص پسند نہیں تھا، گھر کی بنی ہوئی چیزیں زیادہ مرغوب تھیں۔

آج کام والی خلاف معمول دیر سے آئی، ساڑھے گیارہ بج گئے، ورنہ وہ عموماً دس بجے تک تو لازمی آ جاتی تھی۔

”خیریت تو ہے رشیدہ! آج بڑی دیر لگا دی۔“

رشیدہ گیٹ کا لاک لگا رہی تھی، وادی اندر آتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”بتایا تو تھا بڑی املاں بھانجے کی شادی چل رہی ہے نا، کل بارات تھی، بس رات کو سوتے سوتے اتنا وقت ہو گیا، ترے آنکھ ہی نہ کھلی، چھوٹی والی نے اٹھایا کہ املاں آج کل پر نہیں جاؤ گی، بس منہ پہ چھپا کر مار کر بھاگی بھاگی آ گئی۔“ رشیدہ باتوں ہی تھی، لہذا اپنی عادت کے مطابق وادی کو شادی کی تمام تر تفصیلات سنارہی تھی۔

”پہلے ناشتا کر لے، پھر کام کرنا، خالی پیٹ کیا کام کرے گی۔“ وادی نے اسے جھاڑو اٹھاتے دیکھا تو

ہمدردی سے کہا۔

”نہ بڑی املاں! پہلے کام کر لوں، پھر پیٹ میں کچھ ڈالوں گی۔“ رشیدہ چھپاک سے کمرے میں گھس گئی۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے آرام سے ایک پراٹھایا بنایا، سالن گرم کیا اور لاؤنج میں ٹرے لے کر بیٹھ گئی۔

”بڑی املاں! اکیلے کیسے رہ لیتی ہیں، مجھے تو بڑی وحشت ہوتی ہے اس سائلے میں۔“ رشیدہ حسب عادت بولتی جا رہی تھی۔

”ہاں تو ظاہر ہے، تو ٹھہری بارہ بچوں کی املاں، تجھے تو میرے گھر کی خاموشی سے وحشت ہو گی ہی۔“ وادی ہنسنے لگیں۔

”ویسے کتنی تو تو ٹھیک ہے، کبھی کبھی تو اکیلے گھر میں مجھے بھی بڑی وحشت ہوتی ہے، مانی کی شادی ہو جائے تو گھر میں رونق ہو، مینا، سونچے، پھرنے گھر گھر لگے گا۔“ وادی کی بوڑھی آنکھوں میں خواب چمکنے لگے۔

”لوگوں کے لیے کیا کمی ہے، مسئلے مسائل تو سارے ہم عورتوں اور لڑکیوں کے لیے ہیں، چھوٹے بابا کے لیے دیکھ لیں کوئی اچھی سی لڑکی اور کر دیں شادی، رشیدہ نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے لا پرواہی سے مشورہ دیا۔

”لڑکی تو میری نظر میں ہے، سوچ رہی ہوں کہ مانی سے بات کر ہی لوں۔“ وادی کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”کون لڑکی ہے؟“ رشیدہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میری پوتی ہے عازنہ، املاں اسے ہی اپنے مانی کی دلہن بناؤں گی، ان شاء اللہ!“ وادی نے سنجیدگی سے اپنا عزم ظاہر کیا۔

”اچھی بچی ہے، اللہ مبارک کرے آپ کو سب کو خوشیاں دے۔“ رشیدہ ان کے خاندان کے بیشتر افراد سے واقف تھی سب ہی آتے جاتے رہتے تھے۔

”آمین!“ وادی نے صدق دل سے کہا۔

☆ ☆ ☆

”وادی! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا

سب۔ ”رات میں کھانا کھاتے ہوئے فیب نے انتہائی سنجیدگی سے بات شروع کی۔

”ضروری بات؟“ وادی نے چونک کر اسے دیکھا۔
”مجھے بھی تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔“
چند لمحوں کے بعد وہ بولیں۔

”کیسے۔“
”تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی، عازنہ کیسی رہے گی؟“ وادی نے بغیر کسی تہمید کے دو ٹوک بات کی۔

”عازنہ؟“ فیب نے بے چارگی سے انہیں دیکھا۔
اگر یہ بات نو فل کی شادی سے پہلے کی جاتی تو شاید اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا مگر اب۔۔۔

”ناممکن!“ فیب نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”اس میں اتنا سوچ بچار کرنے کی کیا ضرورت ہے، گھر کی لڑکی ہے، دیکھی بھالی ہے۔“ وادی نے اسے خیالات میں غلطاب و بیچان دیکھا تو بولیں۔

”میں سوچ کر جواب دوں گا۔“ فیب نے آہستہ سے کہا۔

”اچھا!“ وادی نے ایک گہری سانس لی۔
”ویسے تم کیا کہہ رہے تھے؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

”بعد میں بتاؤں گا۔“ فیب نے پھر وہی جملہ دہرایا۔

”کوئی خاص بات ہے؟“
”جی!“ فیب نے مختصراً سچ بیان کیا۔

”ویسے آپ نے لوکی بہت عمدہ لپائی ہے۔“
فیب نے موضوع بدلا، اس کی تعریف جھوٹ

موٹ کی نہیں تھی، وادی کے ہاتھ میں واقعی بہت ڈالٹھ تھا۔ مگر بقیل وادی کے ڈالٹھ تو بہت سے ہاتھوں میں ہوتا ہے، ماؤں کے ہاتھ کے بچے کھانوں میں ان کی ممتا اور محبت بھی شامل ہو جاتی ہے، اس لیے ان کا ڈالٹھ منفرد لگتا ہے۔

”اچھا“ میں سوچ رہی تھی پتا نہیں تم کھاؤ یا نہ کھاؤ،

ویسے تو پسندے بھی تھے، مگر میرا دل چاہ رہا تھا لوکی کھائے، کو اس لیے تھوڑی سی پکائی۔“ وادی نے خوش ہو کر اسے بتایا۔

”اچھا!“ فیب نے مسکرایا۔
”آج رات سونے سے پہلے وادی سے بات کر لوں گا۔“ فیب نے کھانا کھاتے ہوئے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا۔

رات میں سونے سے پہلے اوپر اُدھر کی باتوں کے دوران فیب نے مختصراً ”اندازہ عیاں کیا۔“
وادی اس کی بات سن کر خاموش ہو گئیں، انہیں دل ہی دل میں دھچکا لگا تھا، مگر انہوں نے اظہار نہیں کیا۔

”میرا ارادہ تھا عازنہ کے لیے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے گویا ہوئیں۔

فیب خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا، جس کے اچھے اچھے تاثرات ان کی اندرونی کشش کی غمازی کر رہے تھے۔

”چلو، جیسے تمہاری مرضی، اس لڑکی کو دیکھ لیتے ہیں۔“ وادی مجھے انداز میں بولیں۔

”ناراضی سے کہہ رہی ہیں؟“ فیب نے سوال کیا۔

”نہیں، ناراضی کی کیا بات ہے، زندگی تمہیں گزرائی ہے، تمہاری خوشی اور مرضی اہم ہے، اور پھر جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔“ وادی نے سادہ سے لب و لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

ہر طرف پھول ہی پھول، گلاب کے سرخ پھول، موتیا کے چاندی رنگ پھول، اس پر مستزاد محبت کی خوشبو، ساری خوشبو میں مل کر یوں ہم آہنگ ہوئیں کہ فضا کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی ملک اٹھے۔

”تم تصور بھی نہیں کر سکتیں ماہم! میں تمہیں پاکر کتنا خوش ہوں، کیا میرے جیسا خوش نصیب کوئی ہوگا، جس نے پہلی نظر میں دل ہار کر اپنی محبت کو جیت لیا۔“

جب تک تم میری زندگی میں شامل نہیں ہوئیں، میں سولی پر لٹتا رہا کہ نہ جانے کیا ہوگا، ہمارا ملن ہو سکے گا یا نہیں، میری محبت، جگر کا عذاب سے گی یا وصل کی دولت سے مالا مال ہوگی، میرے خواب پورے ہوں گے یا ادھورے ہی رہیں گے۔“

فیب دھیرے دھیرے اپنی بے چنچل خواب وارتھ کی اور اپنا دل ماہم کے سامنے کھول کھول کر رکھ رہا تھا اور وہ ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھی۔

”رشتہ طے ہونے کے بعد دل بہت تیزیا تم سے بات کرنے کے لیے، مگر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ فیب احمد خان صبر، صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے اور پھر ویسے بھی حال دل پہلے ہی بتا دیتا تو آج کہنے کے لیے کیا ہوتا؟“

فیب اپنی اہل خانہ محبت کا اظہار کر رہا تھا اور وہ شرماء کو خود میں سمجھتی جا رہی تھی۔

”تم بھی تو کچھ کوماہم!“ فیب کے لبوں نے پہلی بار اس کا نام چھو، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ نام پہلی بار کسی لڑکی کا رکھا گیا ہو اور پہلی بار اس کے لبوں سے ادا ہوا ہو۔

”کیا کہوں، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ اس کے بے حد اصرار پر ماہم دھیرے سے گویا ہوئی۔

”کیا میری محبت کوئی بہت مشکل چیز ہے جو سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ فیب مسکرا اٹھا۔

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔“ وہ تھوڑی سٹ پٹائی ہوئی، تھوڑی گھبرائی ہوئی اور کچھ شرمائی ہوئی اتنی حسین اور دل فریب لگ رہی تھی کہ فیب مزید باتوں کا ارادہ ترک کر کے اسے اپنی بے پناہ چاہت اور محبت کا یقین دلانے لگ گیا۔

”چپ ہو جاؤ آئی! یہاں تمہارے آنسو دیکھنے اور بوچھے والا کوئی نہیں، بلا وجہ آنسو بہا کر اپنی طبیعت خراب مت کرو۔“ عازنہ کی مسلسل سوں سوں سے چڑ کر شہزائے تلخی سے کہا۔

”رونا آئے جا رہا ہے تو کیا کروں؟“ عازنہ بے بسی سے گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

”شکر کرو کہ بڑی بچھو بچھو ہیں لاؤں میں لیٹ گئیں، روز کی طرح یہاں سوئیں تو تم تو کئی مہینے کام سے مالی بھائی کی شادی اور تمہارا اترا ہوا چہرہ اور آنسو، معمولی سی عقل کا بندہ بھی بالکل ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا سکتا ہے، اب اللہ کے واسطے چپ ہو جاؤ ورنہ صبح تمہاری سوجنی ہوئی آنکھیں دیکھ کر سب کو تشویش ہوگی۔“

شہزائے اس بار فہستہ ”نری سے کہا۔
”تم نے محبت کی ہوتی تو تمہیں احساس ہوتا۔“

عازنہ نے تلخی میں منہ چھپا کر پھر ایک سسکی لی۔

”اللہ بچائے ایسی خاموشی یک طرفہ محبت سے، بلکہ ہر اس محبت سے جو ہماری قسمت میں نہ ہو۔“

شہزائے اکرم عمر ضرور تھی، مگر عقل و شعور میں اپنی بڑی بسن سے کہیں آگے تھی۔

”محبت کوئی سوچ سمجھ کر یا پلاننگ کر کے نہیں کی جاتی، یہ تو بے اختیار جذبہ ہے، محبت خود بخود ہو جاتی ہے۔“ عازنہ کے آنسو ٹپکے نہ تھے، نہ ہی باتیں ختم ہوئی تھیں۔

”اس خود بخود پیدا ہونے والے جذبے کو اب خود سے کوشش کر کے ختم کرو ورنہ کسی کا کچھ نہیں جائے گا، تمہاری اپنی لائف ڈسٹرپ رہے گی۔“ شہزائے سمجھاتے ہوئے دوسری جانب کروٹ لی۔

”میں نے اتنی دعا میں مانگی تھیں اللہ تعالیٰ سے، اتنا میں روئی، اس کے آگے گزر کر اتنی، مگر کچھ بھی حاصل نہیں، آخری آخری وقت تک مجھے یہ لگا کہ شاید اب کوئی معجزہ ہو جائے، شاید اب کوئی معجزہ ہو جائے اور میری محبت مجھے مل جائے، مگر میری قسمت میں شاید آنسو ہی لکھے ہیں۔“ عازنہ جذباتی انداز میں خود کھائی کر رہی تھی۔

”تم جس قسم کے معجزوں کی بات کر رہی ہو، وہ فقہ کمانیوں، ڈراموں اور فلموں میں ہی ہوتے ہیں، ریل لائف سے ان کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں، تمہارا کیا خیال ہے کہ عین وقت پر کسی بھی وجہ سے لڑکی

اس کے گھر والے شادی سے انکار کر دیتے اور دادی ہمیں ایمر جیسی دلہن بنا کر اس گھر میں لے آتیں کہ ان کی بھی خواہش تھی کہ تم مانی بھائی کی دلہن بنو، مگر ڈیر سسر! نصیب سے کوئی نہیں لڑ سکتا، اب تم حقیقت کو تسلیم کرو اور کل مانی بھائی کا دلہہ کھانے کی تیاری کرو اور اپنی شکل ٹھیک ہی رکھو تو بہتر ہے، تمہارے حق میں بھی اور ہمارے حق میں بھی اور اب پلیر خود بھی سوچا اور مجھے بھی سونے دو۔“

سسرانے آنکھیں بند کیے کیے کہا اے سچ جج بہت نیند آ رہی تھی، اور وہ واقعی تھوڑی دیر میں ہی گہری نیند کی وادیوں میں اتر گئی، عازنہ کو جاتے جاتے صبح ہو گئی اور پھر جانے کس وقت اس کی پللیں بھی خود بخود چڑ کر اسے گہری نیند سلا گئیں۔



دلہہ اور بنی مون بھی گزر گیا، نصیب اب تک پہلی نظر والی سرشاری اور خماری والی کیفیت میں تھا، اور اب اپنی محبت کو قوت میں بدل کر اس کے جذبوں کی شدت میں کمی یا ٹھہراؤ کے بجائے اور تیزی آ گئی تھی۔

”کیا چلو کر دیا ہے تم نے، تم سے ایک بل بھی دور رہنے کو دل نہیں کرتا۔“ ماہم کی رشتہ نشی خوشبودار زلفوں میں منہ چھپائے، وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

”اب ڈانڈلاگ جھاڑنا بند کریں اور آفس کی تیاریاں کریں، ٹائم دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔“

ماہم نے شوخ انداز میں بولتے ہوئے اس کے نرم گرم جذلوں پر جیسے ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔

”ارے یارا! یہ چٹخیاں اتنی جلدی کیوں ختم ہو گئیں۔“ نصیب ایک سرو آہ بھرتے ہوئے گویا بادل خواست اٹھ بیٹھا۔

”چل، بھئی نصیب! آج اپنی روٹین میں واپس بہت عیش کر لے۔“ نصیب نے ایک زوردار انگریزی لیتے ہوئے خود سے لہوا روٹ سے نیچے اتر گیا۔

نما دھو کر وہ ہاتھ روم سے باہر نکلا تو ماہم چہرے پر دنیا

جہان کی خوب صورتی اور معصومیت سمیٹے بے خبر سو رہی تھی۔

”مانی جان! چلو جلدی سے اٹھو اور اپنے خوب صورت ہاتھوں سے پہلی بار شوہر نادر کے لیے ناشتا بناؤ۔“ نصیب نے بڑے پیار سے اسے جگانے کی کوشش کی۔

”اونہوں، کیا ہے مانی! اب تک مت کرو پلیر، اتنے مزے کی نیند آ رہی ہے۔“ ماہم نے اس کی طرف سے دوسری جانب کروٹ بدلی۔

”کم آن یارا! مجھے دیر ہو جائے گی، جلدی کرو، ہری آپ! نصیب نے اس کے گال تھپتھپائے۔

”مجھے نیند آ رہی ہے، مانی! دادی بتاؤں گی نا تمہارا ناشتا، پہلے بھی تو وہی بناتی تھیں۔“ ماہم کس سے مس نہ ہوئی۔

”پہلے کی بات کچھ اور تھی جانم! جب تم یہاں نہیں تھیں، اب تم آ گئی ہو، ذرا تمہارا ہنر دیکھیں، شاپاش جلدی سے اپنا کمال دکھاؤ اور میرے لیے فنانٹ ناشتا تیار کرو۔“ نصیب بدستور بہت نرمی اور محبت سے بات کر رہا تھا۔

”کل سے بنا دوں گی نا پلیر، آج سونے دو۔“

ماہم نے اتنی لجاجت اور محبت سے کہا کہ وہ موم کی طرح پکھل گیا، ویسے بھی ماہم کی محبت میں پکھل کر وہ کب کا خاستر ہو چکا تھا۔

دادی حسب معمول جاگ رہی تھیں، اپنے درود و وظائف سے فارغ ہو کر وہ ناشتا بھی تیار کر چکی تھیں۔

”ارے آپ نے بنالیا ناشتا! نصیب جانے کیوں جھینپ گیا۔“

”ہاں، ماہم تو اب تک آئی نہیں تھیں، یکن میں تمہارے آفس جانے کا وقت ہو رہا تھا، اس لیے میں نے خود ہی بنالیا۔“ دادی سادہ سے لہجے میں کہتے ہوئے ڈانٹنگ ٹینل کے گرد بیٹھ گئیں۔

”ہاں وہ، ماہم کے سر میں درد ہو رہا تھا، تو میں نے اس لیے اٹھایا نہیں، شادی کی تقریبات، پھر سفر سے ابھی واپس آئے، ٹھیک سے تھکن ابھی اتنی

نہیں۔“ نصیب انک انک کر خواہوا ہی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔

”اچھا! چلو تم ٹھیک سے ناشتا کرو اور آفس کے لیے نکلو، ورنہ دیر ہو جائے گی۔“ دادی اس کے یوں صفائیاں پیش کرنے پر مسکرا دیں۔

نصیب کے آفس جانے کے بعد بہت دیر تک دادی ماہم کے اٹھنے کا انتظار کرتی رہیں، مگر ان کا انتظار بے سود ہی رہا، رشیدہ بھی اپنے معمول کے مطابق وقت پر آگئی اور آتے ہی اپنے کام میں لگ گئی۔

”دلہن کہاں ہے بڑی اماں؟“ ڈسٹنگ کرتے ہوئے اس نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔

”ابھی سو کر نہیں اٹھیں۔“ دادی نے مختصراً جواب دیا۔

”توج کل کی ہو، پٹیوں کو نیند بہت آتی ہے۔“ رشیدہ نے ایک عمومی تجزیہ پیش کیا اور ہنسنے لگی۔

”ہاں کتنی تو تم ٹھیک ہی ہو۔“ دادی نے ایک گہری سانس لی۔

”ایک ہمارا دور تھا، میکے میں تھے تو ماں، باپ کے اٹھنے سے پہلے بیدار ہوتے تھے اور سسرال میں تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا کہ شوہر ساس، سسر بیدار ہو جائیں اور ہم سوتے رہیں، ہمیشہ سب سے پہلے جاتے تھے، چاہے طبیعت خراب ہو یا کچھ اور حال ہو، اس میں ماشاء اللہ اٹھ بیٹے بھی ہوئے، کبھی کبھی تو مشکل سے چار، پانچ گھنٹے سونے کو ملتا تھا، مگر وہ وقت کاٹ ہی لیا۔“

”ہاں بڑی اماں! اب کہاں وہ پہلے سے لوگ، پہلی سی باتیں، اب تو بس نیا دور، نئے لوگ، نئے نئے طریقے، یہ بیوی کیبل نے سب کی ست مار دی ہے۔“ رشیدہ نے ان کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے جھٹ سے الیکٹرونک میڈیا کو مورد الزام ٹھہرایا۔

”ہو سکتا ہے، یہ بھی بات ہو اور کچھ اب وہ تربیت بھی نہیں رہی والدین کی، جو پہلے ہوا کرتی تھی۔“ دادی صوفے پر نیم براؤ ہو گئیں۔

”آپ کہیں تو اٹھاؤں دلہن کو؟ میرے جانے کے

بعد پھر آپ کیل کیا کریں گی، اب تو دلہن گھر ہے، دو باتیں وہ کرے، دو باتیں آپ کریں، آپ کا بھی دل پہلے اور ان کا بھی دل اس گھر میں لگے۔“ رشیدہ کام ختم کر کے جانے کو تھی، ازراہ ہمدردی دادی سے کہہ بیٹھی۔

”رہنے دو، خود ہی اٹھ جائیں گی، شادی کی تھکن، پھر سفر کی تھکن، نئی نسل بے چاری بھی کیا کرے، نازک بھی ہے، تن آسان بھی، چل سونے دے بچی کو۔“ دادی کا دل فطری طور پر بہت نرم تھا، فوراً ہی ماہم کے لیے ہمدردی کے سونے ابل پڑے۔

”جیسے آپ کی مرضی بڑی اماں! اچھا، پھر میں تو چلتی ہوں، سلام علیکم گیٹ کی کنڈی لگا لیں۔“

”ہاں چل، میں آتی ہوں۔“ دادی نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

گیٹ کا لاک لگا کر دادی اندر آ گئیں اور پھر سے صوفے پر لیٹ گئیں، اور معمول کے مطابق تھوڑی دیر میں ہی ان کی آنکھ لگ گئی کہ وہ صبح چار بجے کی جاگی ہوئی ہوئی تھیں۔

ماہم کی آنکھ کھلی تو بارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک تو کسل مندی سے لیٹی رہی اور سامنے دیوار پر لگے خوب صورت سنہری وال کلال کو گھورتی رہی، جس کی سریلی گھنٹیوں کی مدھرتانوں سے ہی وہ بیدار ہوئی تھی۔

”آ آ آ!“ ایک جھلای لے کر وہ خود پر جبر کر کے اٹھ بیٹھی، دل تو ابھی بھی یہی چاہ رہا تھا کہ لمبی نین کر دوبارہ سو جائے، مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

نما دھو کر وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی، دھانی رنگ کا خوب صورت ہلکی سی کڑھائی والا سوٹ، ہلکی پھلکی میچنگ جیولری، لائٹ سامیک آپ، آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے اس نے خود پر فٹوم کا اسپرے کیا اور مسکرا دی۔

نئی نئی بے پناہ محبت کا خمار اور خود کو چاہے جانے کا دلکش اور حسین تجربہ آنکھوں اور زندگی میں میکسی

چمک اور تابندگی بھرتا ہے، خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے خوب اندازہ ہو رہا تھا۔

اپنے بند روم سے باہر آئی تو لاؤنج میں وادی سوری تھیں، ماہم بچن میں کھس گئی۔ بچن بالکل صاف ستھرا، دھلا دھلا چمک رہا تھا، ہر شے بے حد طریقے اور سلیقے سے اپنی جگہ رکھی تھی۔

فرنیچ کھول کر جائزہ لیا، دودھ، مکھن، ڈبل روٹی، شہد، جام جیلی، انڈے، ناشتے کے بست سے لوازمات اور دوسری کئی کھانے پینے کی اشیاء سے فرنیچ بھر پرا تھا۔

فرنیچ کا معائنہ کر کے ماہم بچن کے کینٹ ایک ایک کر کے کھولنے لگی، ایک کینٹ میں بیکری کی اشیاء رکھی تھیں، کوکیز، بسکٹ، رسک، نمکو، پیس اور کئی بیککنس میں جانے کیا کیا رکھا تھا۔

ماہم نے کوکیز کے چار میں سے چند کو کیز نکالیں، دودھ گرم کر کے مک میں انڈا اور لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

ناشتا کرنے سے پہلے اس نے موبائل اٹھایا۔

”ہیلو امی، السلام علیکم!“

”ہاں، اللہ کا شکر ہے، آپ کیسی ہیں؟“ ماہم نے ان کے خیریت پوچھنے پر کہا۔

”میں ناشتہ کر رہی ہوں۔“ امی کے استفسار پر اس نے جواب دیا۔

”اے ہائے نئی فونلی دلہن کو دودھ، بسکٹ پر رُخا دیا۔ امی نے بحث اعتراض جزا۔

”میں چیزیں تو سب رکھی ہیں، ناشتے کی، بس میرا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے پینے کو، اس لیے یہ لے لیا۔“ نیم گرم دودھ کا گھونٹ بھرتے ہوئے ماہم نے گویا صفائی پیش کی۔

”بڑی بلیا کر رہی ہیں؟“ امی نے پوچھا۔

”سورہی ہیں بی وی لاؤنج میں، ڈرامہ شروع ہونے والا ہے، میرے لی وی میں تو ابھی کیبل کا کارہی نہیں لگا، اب ڈرامہ کیسے دیکھوں؟“ ماہم نے پریشانی کا اظہار

کیا۔

”تم لی وی چلاؤ، دیکھو ڈرامہ، بڑی بی کو کیا ضرورت ہے لی وی لاؤنج میں اپنی فینڈ پوری کرنے کی، اپنے کمرے میں جا کر سوئیں۔“

”ہاں، دیکھتی ہوں۔“ ماہم نے دودھ کا مک ٹرے میں رکھا۔

”شام میں چکر لگایا گھر کا، نیب کتنے بجے تک آجاتا ہے؟“

”کہہ تو رہے تھے کہ چھ بجے تک آجائیں گے۔“

”اچھا، تو سنا، آٹھ بجے تک اس کے ساتھ آجائے رات کا کھانا ہمیں کھالیتا، ٹھیک ہے۔“ امی نے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے، ابھی میں ان کو فون کر کے کہہ دوں گی۔“ ماہم نے تاجدار سے سر ہلایا اور تھوڑی دیر تک اوجھڑا کر باتیں کر کے سیل آف کر کے وہ باہر لاؤنج میں آگئی۔

اسٹارٹس کا وہ مشہور ڈرامہ شروع ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے، وہ ریموٹ ہاتھ میں لیے چیلنج سرچنگ کرنے لگی۔

”اٹھ گئیں دلہن؟“ لی وی کی آواز سے وادی کی آنکھ کھل گئی۔

”جی، ماہم کی نظریں بدستور لی وی اسکرین پر ہی تھیں۔“

”ناشتا کر لیا؟“

”جی۔“

”کیا کھایا؟“ اٹھ بیٹھیں، ویسے بھی ابھی تھوڑی دیر میں وہ اٹھنے والی تھیں۔

”اب اپنا کھانا پیا بھی بیٹانا پڑے گا۔“ ماہم نے بے زاری سے سوچا۔

”نئی فونلی دلہن ہو، اس لیے پوچھ رہی ہوں، ٹھیک سے کھایا ہے نا، تکلف تو نہیں کیا۔“ وادی نے اس کی خاموشی محسوس کر کے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”جی، ٹھیک سے کرایا تھا ناشتا۔“ ماہم نے اب تک ان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا، بس انگلیاں ریموٹ پر

اور نظریں اسکرین پر بار بار وہ چیلنج بدل رہی تھی، مگر کسی پر بھی اس کے مطلب کا کوئی پروگرام نہیں آ رہا تھا۔

”کہیں یہ بڑی بی اپنی باتوں سے پور نہ کریں۔“ یہ سوچ کر ماہم ایک چیلنج پر ٹپک ہی گئی، جہاں سے گلے آ رہے تھے، لباس اور رقص دونوں ہی ایسے لچر اور

واہیات کہ وادی لاخول بڑھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”پہلے کیسے اوب آداب کے ساتھ فلمیں جیتی تھیں، نہ اتنے کم کپڑے، نہ ایسے واہیات رقص،

کم سے کم اس قابل تو ہوتی تھیں کہ ہم ہو، بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ لیں، اب تو توبہ توبہ، بس نہیں چلتا، یہ دو چار دھجیاں بھی اتار کر پھینک دیں۔“

”چلو اب بیٹھ کر ان کا لچر سنو۔“ ماہم کا منہ مٹنے لگا، اس کا پسندیدہ ڈرامہ شروع ہو چکا تھا اور وہ بہت آرام

اور سکون کے ساتھ کسی کی مداخلت کے بغیر اسے دیکھنا چاہتی تھی۔

”شکر ہے محترمہ یہاں سے روانہ تو ہوئیں۔“

وادی کو جاتے دیکھ کر اس نے کلہ شکر ادا کیا۔

وادی ہاتھ روم سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھو کر دوبارہ اپنی جگہ پر آکر ٹپک گئیں۔

”تم بھی یہ ڈرامے دیکھتی ہو؟ بھلا کیا اچھے لگتے ہیں، نہ کہانی، نہ اداکاری، بس ذوق برق کپڑے، زیور اور میک اپ دیکھ لو، مردوں کا بھی یہی حال ہے۔“ وادی شروع ہو گئیں۔

”چلو، دیکھ لیا ڈرامہ۔“ ماہم نے بے حد کوفت کے ساتھ ایک گرمی سانس لی۔

وادی نے اس کی تمام تر توجہ ڈرامے پر مرکوز دیکھی تو کچھ دیر میں خود ہی خاموش ہو گئیں۔

ظہر کی اذان ہونے لگی تھی، ماہم نے لی وی کی آواز ہلکی کر دی۔ وادی خاموشی سے اذان سنتی رہیں۔ اذان ختم ہوئی تو ڈرامہ دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ وہ تنگ آ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

اپنے کمرے میں آکر کچھ دیر تک تو زبانی تسبیح و تحلیل بڑھتی رہیں، پھر کچھ دیر بعد وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں، معمول کے مطابق

بہت اطمینان، سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی کر کے وہ دوبارہ لاؤنج میں آئیں، تو ماہم بدستور ریموٹ ہاتھ میں لیے لی وی کے سامنے براجمان تھی۔

”ختم نہیں ہوا تمہارا ڈرامہ؟“ وادی نے اپنی ٹپک آنکھوں پر جمالی۔

”وہ تو ختم ہو گیا، یہ دو سارا ڈرامہ ہے۔“ ماہم نے ایک نظر انہیں دیکھا اور جواب دیا۔

”اچھا۔“

”کھانا کب کھاؤ گی دوپہر کا؟“ چند لمحوں بعد انہوں نے ماہم سے پھر سوال کیا۔

”فی الحال تو بھوک نہیں ہے۔“ ماہم نے کندھے اچکائے۔

”میں تو ظہر کی نماز پڑھ کے کھانا کھاتی ہوں۔“ وادی نے بتایا۔

”اچھا!“ ماہم نے ان کی اس اطلاع پر کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

وادی کچھ دیر خاموشی کے ساتھ کبھی ماہم کو، کبھی لی وی اسکرین کو دیکھتی رہیں، پھر ناچار خود ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

فرنیچ کھول کر انہوں نے بریانی نکالی گرم کی اور بچن میں ہی کھانا کھا کر باہر آ گئیں۔

”تم جو کھاؤ وہ گرم کر لیتا، فرنیچ میں چاول بھی ہیں، سالن بھی اور تان بھی رکھے ہیں، کچھ اور کھاؤ تو بتاؤ۔“ وادی ماہم سے مخاطب ہوئیں۔

”مجھے جب بھوک لگے گی، میں کھاؤں گی، آپ پریشان مت ہوں۔“ ماہم نے قدرے رکھائی سے جواب دیا، اسے ڈرامے کے دوران بار بار وادی کی مداخلت بری لگ رہی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وادی نے ایک گرمی سانس لی اور اپنے کمرے میں آ گئیں، ان کی وارڈروپ بے ترتیب ہو رہی تھی، لی ویوں سے موقع ہی نہیں ملا تھا ٹھیک کرنے کا، لہذا آج وہ اس کام کو لے کر بیٹھ گئیں، دو گھنٹے بعد وہ فارغ ہوئیں تو کمر نکالنے اپنے کمرے میں ہی لیٹ گئیں۔

اودھر ماہم کے سارے ڈرائے ایک ایک کر کے ختم ہوئے تو اسے بھوک لگنے کا احساس ہوا۔
 ”کیا کھاؤں؟“ وہ فریج کھول کر جائزہ لینے لگی۔
 بریانی، چکن، مٹن، قورمہ، ٹائٹن اور کسٹرو سب ہی موجود تھا، ماہم نے فریج چکن کا ایک پکس نکالا اور مائیکرو ویو میں گرم کر کے پلیٹ میں رکھ کر باہر لے آئی، فریج سے کوئلہ ڈرنک بھی نکال لی۔
 ابھی وہ بیوی کے سامنے براجمان اپنا بیچ کر رہی تھی کہ اس کا سیل فون بجنے لگا، مانی کا فون تھا۔
 ”میں گھر آ رہا ہوں، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے حکم نامہ جاری کر کے سیل آف کر دیا۔
 ”واہ بھی! کیا انداز ہیں بادشاہ سلامت کے؟“ ماہم نے پہلے حیرانی سے اپنے موبائل کو دیکھا، پھر اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکا کر مسکرا دی۔
 مانی گھرواپس آیا تو وہ تیار تھی۔ پریل کمر کی جارحیت کی خوب صورت سی ساڑھی، میچنگ جیولری، نفاست سے کیا گیا میک اپ۔
 ”جان! تم ہر روز پہلے سے زیادہ حسین لگتی ہو۔“ اسے بانہوں میں لیے مانی بے خود ہو کر سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ماہم دھیمے دھیمے مسکرانے لگی، ساری فضا اک دم ریٹیم ریٹیم خوشبو خوشبو ہو گئی تھی۔
 ”امی نے بلایا ہے آج ہمیں۔“ ماہم نے جاو اثر لمحے کا فائدہ اٹھایا۔
 ”ہوں!“ مانی ریٹیم خوشبو کے احساس میں ہی گم تھا۔
 ”رات کا کھانا تو ہیں کھائیں گے، ٹھیک ہے۔“ ماہم اسے اور پکار کر رہی تھی۔
 ”ٹھیک ہے جان! ٹھیک ہے۔ ان نازک لبوں سے نکلا ہر لفظ خوب صورت ہی لگتا ہے۔“
 ”تو پھر کب چلیں گے؟“
 ”چلتے ہیں، اتنی جلدی کیا ہے، تھوڑا سا تاخیر ہمیں بھی دے دو، سارا دن جناب کے تصور میں ہی گزارا ہے۔“ مانی مسکرایا۔
 ”اچھا! آدھ گھنٹے بعد؟“

”ٹھیک ہے۔“ مانی نے اثبات میں سر ہلایا۔
 گھر پر سب لوگ گویا ان ہی دونوں کے انتظار میں بیٹھے تھے بہت ترجوش استقبال ہوا، مانی اس وی آئی پلی پروڈکول اور آؤ بھگت سے کچھ حیران بھی ہوا اور بہت خوش بھی۔
 ”اور سناؤ بیٹا! کیا رہا سفر؟“ ماہم کی امی اس سے پوچھ رہی تھیں۔
 پوچھ گوری رنگت، دلکش نقوش اور اس عمر میں بھی جاذب نظر سراپے کی مالک وہ کہیں سے بھی اتنے بڑے بچوں کی ماں نہیں دیکھتی تھیں۔ پھر ان کا گفتگو کرنے کا انداز، اتنے میٹھے بول، نرم لہجہ، کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔
 ”ہمارا سفر تو بہت اچھا گزرا، باقی ماہم بتائیں گی، ان کا سفر کیا رہا۔“ مانی کھل کر مسکرایا۔
 وہ کچھ دیر اودھر اودھر کی باتیں کرتی رہیں، پھر اسے اپنے میٹھے کے ساتھ خوش گفتگو چھوڑ کر غالباً ”چکن میں چلی گئیں“ ماہم بھی ان کے ساتھ تھی۔
 کھانا بہت پر تکلف اور ڈانٹنے والے، مٹن، بریانی، فرائی فیش، شکاری ککڑے، راستہ اور فوٹ سلاؤ، ہر شے لا جواب اور مزے دار تھی۔
 ”کھانا بہت زبردست ہے بھی، کس کا کمال ہے؟“ مانی نے کھانے کے دوران کھل کر تعریف کی۔
 ”یہ ہماری امی کا کمال ہے جناب! جاوے ان کے ہاتھوں میں، جو ایک بار ان کے ہاتھ کاذا آفتہ چھ لے، پھر بھول نہیں سکتا۔“ ماہم فخریہ انداز میں بولی۔
 ”یہ تو ہے بھی، میں تو گرویدہ ہو گیا ہوں پکا پکا۔“
 فییب نے سچائی سے اعتراف کیا۔
 ”کھانے کے بعد سوال اٹھا۔“ آئس کریم یا کافی؟“
 باہر ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی، موسم بہت خوشگوار ہو چلا تھا۔
 ”بھی، مجھے تو کافی چاہیے۔“ فییب پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”اور میں آئس کریم کھاؤں گی۔“ ماہم نے بچوں جیسی ایکساٹمنٹ سے فرمائش کی۔

”مجھے بھی آئس کریم چاہیے۔“ ماہم سے چھوٹی فروا نے بھی آئس کریم کے حق میں ووٹ دیا۔
 ”اور ہماری آئس کریم فییب بھائی کے ذمے۔“
 فروا نے آنکھیں شرارت سے چھمائیں، ”کیوں فییب بھائی؟“
 ”ارے آئس کریم کیا تم سے بڑھ کر ہے، آخر سالی ہو۔“ فییب مسکرایا۔
 ”چلیں پھر؟“
 ”کہاں؟“
 ”آئس کریم لینے اور کہاں۔“
 ”فروا! بھائی کو تنگ مت کرو۔“ امی نے اسے گھر کا۔
 ”امی!“ فروا نے منہ بسور کر احتجاج کیا۔
 ”چلو، چلو اٹھو بھی، تمہارے لیے آئس کریم لے کر آتے ہیں۔“ فییب اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”آپ جب تک کافی بنائیں امی! ہم بس ابھی آتے ہیں۔“ ماہم بھی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”بھگت دس منٹ کی ڈرائیو پر آئس کریم پارک رہا؟“
 بہت مشغور اور بہت مزگنا۔
 فروا وہاں جا کر پھیل گئی، مختلف فلیوورز میں وہ آئس کریم نکلا رہی تھی۔
 ”ان محترمہ کو آئس کریم کھلانا آسان نہیں ہے، تب ہی تو امی ڈانٹ رہی تھیں۔“ ماہم نے فییب کو اطلاع دی۔
 ”کوئی بات نہیں۔“ فییب نے بارہ سو روپے کی اواینگی کرتے ہوئے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔
 آئس کریم سے لدے پھندے گھر آئے تو سب ان ہی کا انتظار کر رہے تھے۔
 امی تھوڑی دیر میں ہی کافی بنا کر لے آئیں۔
 ”بیٹا! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟“ امی ذرا سنجیدہ لہجے میں فییب سے مخاطب ہوئیں، ”ڈرائنگ روم میں اس وقت امی، فییب اور ماہم ہی تھے۔“
 ”جی کہیے۔“ فییب نے کنفیوز ہو کر ان کی طرف

دیکھا۔
 ”دیکھو بیٹا! ہم نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ماہم ہماری بہت نازوں پی بی بی ہے، پھر ہمارا بہن سسن، کھانا پینا، سب تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے ہاں ہر چیز کھلی اور فراوانی سے ہوتی ہے، جو دل چاہتا ہے، سچے نکال کر کھا لیتے ہیں۔“ امی نے تمہید باندھی۔
 ”جی!“ فییب نے جی پر اکتفا کی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔
 ”تمہاری دادی ہماری بھی بڑی ہیں، ہم ان کی بہت عزت کرتے ہیں، مگر انہیں ماہم سے یہ نہیں پوچھنا چاہیے تھا کہ اس نے کیا کھایا، ایک تو وہ نئی نوکی دہن ہے، چاری نے خود ہی الٹا سیدھا جو ہاتھ لگا لے لیا، اب بتاؤ ذرا اودھ اور بسکٹ سے کوئی بھلا ہوتا ہے؟
 دوسرے کے کھانے کا بھی کچھ پتا نہیں، شام میں ذرا سی فرائی چکن گرم کر کے کھا رہی تھی کہ تمہارا فون آگیا، اس نے وہ بھی چھوڑی، پورے دن کی بھوکی، اب جا کر ٹھیک سے کھانا کھایا ہے، یہ تو بڑے بوڑھوں کا کام ہے کہ نئی نئی گھر میں آئی ہے، دو چار دن ذرا دیکھ لیں اسے کھانے پینے کا خیال کر لیں، پھر تو یہ سیٹ ہو ہی جائے گی۔“ امی نے اپنی ہی چوڑی بات ختم کی۔
 ”ماہم نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔“ فییب کھسپا ہوا کہہ بولا۔
 ”بچیاں تو اپنے دکھ سکھ، اپنے ماں، باپ سے ہی کہتی ہیں، پھر یہ ہے بھی شرمیلی اسے تو شرم آرہی تھی کہ تم سے تمہاری دادی کی شکایت کرنی، خیر بڑی بوڑھی ہیں، یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، بے دھڑک، بغیر سوچے مجھے بول دیتے ہیں۔ میں نے تو ماہم کو سمجھا دیا ہے کہ ان کی باتوں کو دل پر نہ لے۔“
 امی نے اک دم اپنی ٹون بدلی اور فییب خفیف ہو کر مسکرا دیا۔
 ”کافی تو پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ امی نے اس کی توجہ ہاتھ میں پکڑے کک کی طرف دلائی۔
 ”جی!“ اس نے کافی کا کک جو منوں سے لگا لیا۔

کشاہ روشن اور ہوادار کمرہ بڑی سی کھڑکی کے پردے سرکانے سے اور بھی روشن ہو گیا تھا، مینگا اور خوب صورت بیڈ روم سیٹ ڈیواروں پر آرائشی اشیاء ہر شے صاف تھی اور ٹھکانے پر۔

ماہی نے ایئر فریشر کا سپرے کیا، کمرے میں گلابوں کی خوشبو پھیل گئی۔
بیڈ کی تختیوں چاروں کی ناپید سلوٹ دور کر کے وہ تکیے سے ٹیک لگا کر کم دراز ہو گئی اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا موبائل اٹھالیا۔

”بڑی بلی کے کیا حال ہیں؟“ سلام دعا اور خیر خیریت پوچھنے کے بعد ای شرع ہو گئیں۔

”ٹھیک ہیں“ لاؤنج میں صوفے پر پڑی رہتی ہیں“ وہیں ہیں۔“ ماہم نے اطلاع دی۔

”جائزہ لینے کے لیے بڑی رہتی ہوں گی کہ تم کیا کر رہی ہو، کہاں اٹھ رہی ہو، کہاں بیٹھ رہی ہو۔“ امی نے غالباً برا سامنہ بنایا تھا۔

”پتا نہیں۔“ ماہم نے بے زاری سے جواب دیا۔
”میں تو اپنے کام سے کام رکھتی ہوں، زیادہ فری نہ ہوںی ہوں نہ کرتی ہوں۔“ وہ مزید بولی۔

”یہ کہیں آتی جاتی نہیں ہیں؟ اور بھی تو بیٹے ہیں ان کے، وہاں کیوں نہیں رہتیں، یہاں زیادہ دل لگتا ہے کیا؟“ امی بڑی رہتی ہیں۔“ امی نے استفسار کیا۔

”ہاں، پتا نہیں کیوں، کسی اور کے گھر رہتی ہی نہیں، حالانکہ اور بھی پوتے، پوتیاں ہیں، سب اتنا ہلاتے بھی رہتے ہیں، مگر بس اسی پوتے کے گھر زیادہ دل لگتا ہے، کچھ مانی نے بھی ان کو بہت سر پر چڑھا رکھا ہے، ایک آٹھ دن سے زیادہ کہیں رکنے ہی نہیں دیتا، فوراً گھر لے آتا ہے۔“ ماہم کے انداز میں واضح

بے زاری تھی۔

”بڑی بلی کا پتا صاف کرو، ماہم! یہ تو تمہاری اور مانی کی چوکیدار بن گئی ہیں۔“ امی نے مٹی کو مشورہ دیا۔

”کوشش تو کر رہی ہوں اب آہستہ آہستہ ہی سب کچھ ہوگا، آگ دم سے تو یہ یہاں سے جانے سے رہیں، بس آپ کو بتایا تاکہ سارا مسئلہ مانی کا ہے، ان ہی کے لاڈ

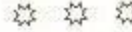
پیار اور جو محلے ختم نہیں ہوتے۔“
”بس تم مانی کا دل مٹھی میں لینے کی کوشش کرو، سارا کام ہی تمہاری مرضی اور خشا کے مطابق ہوگا۔“ امی کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک مشورہ تھے۔

”آپ دل کی بات کر رہی ہیں، وہ سر سے پاؤں تک پورا پورا میری مٹھی میں ہے۔“ ماہم کی ہنسی بہت خنجر تھی۔

”میرے موبائل کی بیٹی بلی ہو رہی ہے امی! میں آپ کو پھر بعد میں فون کروں گی، ٹھیک ہے۔“

”اچھا، ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا اور دب کر مت رہنا بڑی بلی سے، زیادہ جی حضوری کرنے کی ضرورت ہے، بس مانی کے سامنے ہنس بول لیا کرو، تاکہ اسے تسلی رہے، ٹھیک ہے، اچھا خدا حافظ۔“ فون بند کرتے کرتے بھی امی اسے مشورہ دیتا نہ بھولیں۔

”خدا حافظ!“ ماہم نے سیل آف کر دیا۔



آج گھر میں بہت رونق تھی اور داوی کے چہرے پر بھی بڑی پچھو اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں، جائزہ اور شرما کو بھی انہوں نے آتے ہوئے گھر سے لے لیا تھا۔

بڑی پچھو کی مونا، الوینہ، جائزہ اور شرما چاروں کی چاروں بچن میں مٹھی جالے کیا کارہی تھیں، ماہم سلام دعا کر کے اور تھوڑی دیر سب کے درمیان بیٹھ کر سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

امی کی نصیحت پر پورا پورا عمل کر رہی تھی کہ سسرالی رشتے داروں کو زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے، نہ نوکرانی بن کر خدمتیں کرنے کی ضرورت ہے، ڈراؤنکھ اور فاصلے سے ملنا سب سے۔

اسی لیے وہ سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

”تو ہے، کتنا شور مچاتی ہیں یہ لوگ۔“ عزیز کی ہنسنے بولنے کی آواز اسے کراں گزرنے لگیں تو اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

اوسر لاؤنج میں بڑی پچھو، داوی سے محو گفتگو تھیں۔

”فائزہ اپنے گھر چلی گئی یا ابھی میکے میں ہی ہے؟“
داوی ان کے جینے کی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

”کہاں، وہ تو صاف انکار کر رہی ہے، کہہ رہی ہے کہ میرے گھر والے کب تک اور کہاں تک ان کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں گے، بہتر ہے کہ اس معاملہ کو یہیں ختم کریں۔“ پچھو نے بتایا۔

”بے چاری بچی! کیسی اچھی شکل اور کیسے اچھے گمن، بس نصیحوں سے مار کھا گئی، مسرال والے ملے تو لا لچی، شوہر لالچی اور کھٹو، اللہ نے اولاد دی وہ بھی چند سائیں لے کر اوپر چلی گئی، مجھے تو بڑا ہی افسوس ہوتا ہے فائزہ کے بارے میں سوچ کر۔“ داوی نے ایک آہ بھری۔

”کیا کریں، ہمیں خود افسوس ہوتا ہے اسے دیکھ کر دو سال میں ہی وہ تو سوکھ کر کاٹنا ہو گئی، شکل سے لے کر انداز تک، دے تو نصیب بھی اچھے دے۔“ پچھو نے پرسوز لہجے میں کہا۔

”یہ تو ہے، اب مجھے ان لڑکیوں کی فکر لگی رہتی ہے، چاروں ایک برابر کی ہو رہی ہیں، خاندان میں کوئی جوڑ کا ہے نہیں، باہر کرتے ہوئے دل ڈرنا ہے، نہ جانے کیسے لوگ ملیں۔“ داوی کو اپنی سب ہی پوتیوں اور نواسیوں کی فکر لگی رہتی تھی۔

”آج کل تو بس لڑکے کی اور لڑکے والوں کی جیت ہے، ایک چھوٹ جائے تو دوسری، بلکہ تیسری، چوتھی شادیاں بھی ہو جاتی ہیں، چھ بچوں کے باپ کو بھی کنواری کا رشتہ مل جاتا ہے، مسئلہ تو سارا لڑکیوں کا ہے، میں بھی کسی کا کوئی ایسا وسیلہ واقعہ دیکھتی ہوں یا سنتی ہوں تو یہ ہی ڈر لگنے لگتا ہے کہ جانے ہماری بچیاں کیا نصیب لے کر اس دنیا میں آئی ہیں، ہر نماز میں ان کے اچھے نصیحوں کے لیے دعا کرتی ہوں۔“ پچھو دل سوزی سے گویا ہوئیں۔

”اللہ مالک ہے، ہمارا بھی ہماری بچیوں کا بھی اچھی

امید رکھو اللہ سے۔“ داوی نے انہیں تسلی دی۔
”یہ مانی کی دلہن بڑی سنجیدہ سنجیدہ رہتی ہیں، میں نے نہ زیادہ ہنستے دیکھا نہ بولتے دیکھا کسی سے، دو تین چار بار جب بھی ہم آئے یا تو میکے چلی گئیں یا پھر کمرے میں ٹھس کر بیٹھ گئیں۔“ پچھو نے موضوع بدلا۔

”بس اپنی مرضی کے مالک ہیں، کیا کہہ سکتے ہیں۔“
داوی نے محتاط انداز میں جواب دیا، حالانکہ کہنے کو تو ان کے پاس بہت کچھ تھا جو کچھ وہ ماہم کا رویہ اور انداز اس گھر میں دیکھ رہی تھیں، مگر ابھی انہوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”آپ کے ساتھ کسی ہیں، رویہ ٹھیک ہے، بات چیت کرتی ہیں یا بس لیے دیے رہتی ہیں؟“ پچھو نے انہیں کریدنے کی کوشش کی۔

”میرے ساتھ تو ٹھیک ہیں، بھئی اور ویسے بھی ہم بڈھوں کی اور آج کے جو جوانوں کی دلچسپیاں الگ الگ ہی ہیں۔“ داوی نے گول مول انداز اختیار کیا۔

”بس نصیب ہیں اپنے اپنے خاندان میں اتنی لڑکیاں ہوتے ہوئے مانی کا نصیب کہیں اور لکھا تھا۔“ پچھو نے ایک گہری سانس لی۔

”ہیلو ہلو خواتین، آج انڈریڈی جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جائیں۔“ شرما شور مچاتی ہوئی کچن سے لاؤنج میں آئی۔

”آج کیا نیا تجربہ کیا ہے تم لوگوں نے؟“ داوی مسکرائیں۔

”بس کھانے کے وقت دیکھیے گا، سر پر انزہ ہے۔“ شرما ہنسی۔

”اللہ خیر کرے، میرا ہاضمہ تو ویسے بھی کمزور ہے۔“ پچھو نے اسے چھیڑا۔

”پچھو جان! ایسی چیز بنائی ہے کہ اوسر کھائی اوسر ہضم۔“ شرما نے دسترخوان اٹھالیا۔

”ماہم کو بلاؤ۔“ داوی نے شرما کو ہدایت کی۔
”جی اچھا۔“ تابع داری سے سر ہلاتی ہوئی چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں واپس بھی آگئی۔

”داوی حضور! دروازہ اندر سے لاک ہے اور میں

نے کئی بار ناک کیا مگر کوئی رسپانس نہیں اس لیے میں واپس آگئی۔" شہزادے نے آتے ہی اعلان کیا۔
 "سر میں درد تھا، کیا پتا سو گئی ہو۔" پچھو نے قیاس آرائی کی۔
 "ہو سکتا ہے۔" شہزادے کندھے اچکائے۔

"مجھے بتاؤ، کیا میں اس گھر کی فرد نہیں ہوں، دودھ میں سے کسی کی طرح نکال باہر پھینکنا سب نے مجھے جھوٹے منہ بھی کھانے کا نہیں پوچھا، میں صبح سے بھوک پیڑی ہوئی ہوں۔" ماہم، نیب کے کندھے سے لگی سسک رہی تھی۔
 "یا اللہ کیا کروں؟" نیب خود ہی زنج ہو گیا، وہ ماہم سے صرف اتنا پوچھ رہا تھا کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ جب سے اپنا کمرہ بند کر کے کیوں پیڑی ہوئی تھی؟

"تنا شدید سر میں درد ہو رہا تھا، کسی سے یہ نہیں ہوا کہ ایک میبلٹ اور ایک گلاس پانی ہی دے دیتا، سب کے سب بس اپنے بلے گلے میں لگے ہوئے تھے۔" ماہم کے آنسوؤں میں روانی آگئی اور نیب کا لہجہ اور دل دونوں موم ہو گئے۔

"اچھا چلو چھوڑو، کیوں آنسو بہا کر ان خوب صورت آنکھوں پر اور مجھ پر ظلم کر رہی ہو، کہیں باہر چلتے ہیں، تم بھی فریٹش ہو جاؤ گی اور میں بھی۔" نیب نے اسے ہلایا۔

"اس کی ہاں چلیں؟" وہ جھٹ سے بولی۔
 "چلو۔" وہ دل و جان سے راضی تھا۔

وہ سسرال پہنچا تو پیشہ کی طرح پرتیک استقبال ہوا اور خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔
 "بچوں ایک اعلان سنو۔" فروا سب کی موجودگی میں اک دم اونچی آواز سے بولی۔

"کہا ہوا؟" ظہیر بھائی نے اسے گھورا۔
 "اگلے ہفتے میری سالگرہ ہے، سب کو معلوم ہے سوائے مانی بھائی کے، لہذا یہ اعلان اسپیشلی ان ہی

کے لیے ہے۔" فروا نے آنکھیں گھما لیں۔
 "تصویر آرہی ہے، مگر آواز نہیں۔" نیب نے اسے چھیڑا۔

"مجھے اگلے ہفتے اپنی پسند کا گفٹ چاہیے، کان کھول کر سن لیں۔" وہ نیب کی بات کو نظر انداز کر کے اپنی دھن میں بولتی رہی۔

"اچھا بھئی۔" لے لیتا اپنی پسند کا گفٹ، اب چپ ہو جاؤ۔" ماہم نے اسے گھورا۔

"آپ سے ہم کچھ نہیں کہہ رہے، ہم مانی بھائی سے بات کر رہے ہیں۔"

"ارے بھئی ہماری پیاری سی سالی کو ڈانٹو مت، یہ جو کہیں گی وہی ملے گا۔" نیب پہلے ماہم سے پھر فروا سے مخاطب ہوا، جس کی بانچھیں کھل گئی تھیں نیب کی بات سن کر۔

اگلے ہفتے فروا کی سالگرہ کا دن اتوار کا دن تھا۔ امی نے صبح سے ہی دونوں کو بلایا تھا۔ ناشتا گھر سے کر کے نکلے۔ وہاں پہنچ کر نیب اندر نہیں گیا۔
 "میں فروا کو گفٹ دلا دوں، پھر آتے ہیں۔" وہ ماہم سے بولا۔

فروا پانچ منٹ میں ہی تیار ہو کر آگئی۔

"ایک بار اور سوچ لیں مانی بھائی! میرا گفٹ لوگوں کو بہت مزہ دے جاتا ہے۔" دوپٹے کا پلو سنبھالتی ہوئی فروا نے اسے جبراً دیا۔

"ڈونٹ دری، نیب احمد کے لیے منگا سستا کوئی معنی نہیں رکھتا۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر میں روک دیں۔" فروا نے اک دم کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ارے آپ گاڑی تو روکیں، ہمیں اترنا ہے۔" وہ بے چینی سے بولی۔

نیب نے مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کر دی، پیدل چلتے ہوئے وہ تھوڑے سی پیچھے آئے جہاں فروا نے گاڑی روکنے کو کہا تھا، سامنے ہی نور چولر زکائیون سائن جگہ رہا تھا، نیب بے اختیار ایک گہری سانس

لے کر رہ گیا۔ سالگرہ کا تحفہ اتنا مزہ دے گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پاکٹ میں موجود کریڈٹ کارڈ کی موجودگی سے تقویت محسوس کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔

"ارے مانی! تم یہاں کیا کر رہے ہو، اچھا تیکم کی شاپنگ ہو رہی ہے۔" چھوٹی پچھو کی آواز سن کر وہ اک دم چونک پڑا، جنہوں نے سوال، جواب خود ہی کر لیے تھے۔

"پہلے سالی، پھر گھر والی، مانی بھائی تو میری سالگرہ کا گفٹ دلا رہے ہیں مجھے۔" ماہم یا نیب کے بولنے سے پہلے ہی فروا چنکی۔

"اچھا بھئی، تمہیں تو بڑے اچھے بہنوئی مل گئے۔" چھوٹی پچھو پہلے تو اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گئیں، پھر ایک ہنس کر بولیں، نیب ان کے لہجے میں جیسے طنز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ خفت سے سر جھکا کر رہ گیا۔

بیس ہزار نو سو پچاس کے نازک سے ایسرنگ لینے تک پچھو وہیں موجود تھیں، وہ اپنے دیواری سلائی میں بیٹے کے لیے آنکھوں میں لپٹے آئی تھیں۔
 رات میں دادی کے سامنے اس کی پیشی تھی۔
 "کنول کا فون آیا تھا، انہوں نے چھوٹی پچھو کا نام

لیا۔
 "جی، نیب بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی کہ تم یوں کاٹھ کے آؤ بن کر رہ جاؤ گے، لیکن دین بھی ایک طریقے سے حساب کتاب سے ہوتا ہے، یا تمہارے پاس زیادہ ہی دولت برس رہی ہے؟"

"چھوڑیں نا دادی! ایک بار ہو گیا، مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ تحفہ اتنا مزہ دے جائے گا، آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔

"کس کس بات کو چھوڑوں مانی! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔" دادی شردع ہو گئیں۔
 ان کی باتوں کا لب لباب یہ ہی تھا کہ ماہم کو گھرا

گھر داری سمیت کسی سے کوئی دلچسپی نہیں، سارا دن وہ یونہی گزار دیتی ہے، فون پر گھر والوں کے ساتھ لگی رہتی ہے، اور نیب کے آنے پر تیار ہو کر اس کے ساتھ نکل جاتی ہے۔

"میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے، مجھے بڑھیا کہہ کہہ کر اپنی ماں سے بات کرتی ہے۔" انہوں نے شکایتی انداز میں کہا۔

"تپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی دادی! ماہم ایسی ہے نہ اس کی امی، وہ تو بہت شائستہ خاتون ہیں۔" نیب نے نرم لہجے میں بیوی اور ساس کی صفائی پیش کی۔

"رہنے دو یہ بھس پہ لپٹا، بڑھیا ضرور ہوں، مگر میرے کان بھی سلامت ہیں، آنکھیں بھی اور داغ بھی ابھی سنسایا نہیں ہے کہ ہسکی ہسکی باتیں کروں۔" دادی غصے میں کہہ رہی تھیں۔

نیب خاموش ہو گیا، ایک طرف ماہم کے آنسو، دوسری طرف دادی کی خفگی، وہ تو چچی کے دوپالوں کے بیچ پھنس گیا تھا۔

وہ اسے اندازہ تھا کہ گھریلو معاملات میں ماہم کی بھی کچھ کوتاہیاں ہیں، مگر اس کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس گھر میں دادی کے ساتھ ایڈجسٹ ہو جائے گی، مگر اس کی یہ خام خیالی بہت جلد دور ہو گئی۔

"نکل آؤں گا میں لینے کے لیے۔" نیب نے پینٹ کی جیب میں چابیوں کی موجودگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کل نہیں پرسوں۔"
 "پرسوں؟ یا راکھ رحم کرو مجھ غریب پر، دو دن تمہارے بغیر کیسے رہوں گا۔" نیب کے لہجے میں دنیا بھر کا درد اور چرے پر دنیا بھر کی بے چارگی چھائی۔

"اللہ مانی! ابھی تو مجھے یہاں رکھنے دیا کریں آخر میرے گھر والے بھی مجھے اپنے درمیان دیکھنا چاہتے ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ مجھ پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے

ہیں۔ ”ماہم تازو بخیر سے بھرپور انداز میں گویا ہوئی۔
 ”قبضہ تو جناب نے کر رکھا ہے مجھ پر۔“ فیب ہنس پڑا۔
 ”ٹھیک ہے، پھر رسوں آئے گا لینے کے لیے۔“
 ماہم نے اس کے ہنسنے کا فائدہ اٹھایا اور جلدی سے بولی۔
 ”نہیں میں کل آؤں گا۔“
 ”مانی!“ ماہم کے لیے میں بھرپور احتجاج اور آنکھوں سے خشکی جھٹکے لگی۔
 ”میں کل آؤں گا تم سے ملنے کے لیے۔“ فیب نے ڈرامائی انداز میں اپنی بات مکمل کی۔
 ”ہمت برے ہو تم۔“
 ”واقعی؟“ وہ شرارت سے ماہم کی طرف جھکا۔
 ”اب جا میں بھی وہاں وادی کو تشویش ہو رہی ہوگی کہ اتنی دیر کیوں ہو گئی۔“ ماہم اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے مگرانی۔
 ”جا رہا ہوں یا ایک کیر کٹر اللہ حافظ!“
 ”اللہ حافظ!“
 ”جا رہے ہو بیٹا!“ اسی اندر داخل ہوئیں۔
 ”جی ای! خدا حافظ۔“ فیب جاتے جاتے ترک گیا اور ان کے آگے سرخم کیا۔
 ”خدا حافظ۔“ اسی مگرانی۔
 فیب باہر نکل گیا اور گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک ہی اسے کچھ یاد آیا۔
 ”وہ شٹ!“ پینٹ کی جیب میں ہاتھ مارتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ موبائل اندر گھر میں ہی بھول آیا تھا۔ وہ موبائل لینے کے لیے پلانا لاؤنج میں داخل ہوتے ہوتے وہ اک دم گھر گیا۔ اندر ماہم اور اس کی ای یا آواز بلند باتیں کر رہی تھیں فیب جیسے وہیں جم کر کھڑا ہو گیا، دونوں کی باتوں نے اسے پھر کا بنا ڈالا تھا۔



کمرے میں گہری خاموشی تھی ایسی خاموشی اور ایسا سناٹا جیسا فیب کے دل اور زندگی میں اتر آیا تھا۔

غیب کا سنا ہوا چہرہ اس پر گزرے ایسے کی داستان سنا رہا تھا اور سرخ آنکھیں اس کے رت جھکوں کی چٹکی کھا رہی تھیں۔
 ”تم جو کچھ بھی جانتے ہو بلا کسی جھجک کے سب کہہ دو۔“ غیب کے نوٹے لہجے میں صدیوں کی تھکن بول رہی تھی۔
 نوفل بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گیا، پھر تھوڑی دیر بعد گویا ہوا۔
 ”تو نے ماہم کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا“ اس وقت یہ فیملی نئی نئی ہمارے محلے میں آئی تھی، ہم لوگ بھی اچھی طرح ان کو نہیں جانتے تھے بظاہر اپنے شریف اور پڑھے لکھے لوگ تھے لہذا ہم نے بھی تجھے وہی بتایا جو بظاہر نظر آ رہا تھا، بعد میں آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ کیریکٹر وائز یہ لوگ ٹھیک نہیں ہیں لالچی اور دھوکے باز ہیں، کیونکہ ایک بار تو ایسا زبردست شور مچا ہوا یہ ستر گھروں سے لوگ باہر آ گئے پتا چلا کہ ماہم کا منگیتر ہونے کا دعویٰ دار ایک لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ آیا تھا، اس کا کہنا تھا کہ ماہم سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا شادی سے پہلے اس نے تین لاکھ سے اوپر کی شاپنگ ماہم کے ساتھ مل کر کی تھی جس میں سے دو ڈھائی لاکھ کا صرف زیور تھا، اس کے علاوہ پچاس ہزار نقد اس نے ماہم کو الگ دے دیے تھے جو اس نے اپنی کوئی مجبوری بتا کر ایک ہفتے کے لیے مانگے تھے وہ زیور رقم اور دوسرے قیمتی کپڑے وغیرہ لے کر یہ فیملی شادی سے دو ہفتے پہلے غائب ہو گئی۔ وہاں بھی یہ لوگ کرائے پر مقیم تھے، کسی کو کچھ علم نہ تھا کہ یہ کہاں گئے، بقول اس لڑکے کے بڑی مشکل سے وہ ان کا سراغ لگا کر یہاں تک پہنچا ہے، اس کا کہنا تھا کہ اس کا زیور اور رقم یہ لوگ واپس کر دیں، بقول اس کے دوستوں کے وہ اپنے دوست کی سچائی کی گواہی دینے کو تیار ہیں، کیونکہ اس مشکلی میں وہ لوگ شریک تھے پھر انہوں نے مشکلی کے فوٹو گرافس بھی دکھائے مگر آج کل۔“
 نوفل نے بولتے بولتے ذرا ٹوک کر دم لیا اور اپنے سلسلہ کلام کو دوبارہ جوڑا۔

”مگر آج کل ایسے فوٹو گرافس تیار کرنا بھی کچھ مشکل نہیں ہے، بہر حال کسی کا بھی اعتبار کرنا مشکل ہے، ماہم کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ یہ شخص زبردستی ماہم کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور کوئی اچھا لڑکا نہیں ہے اس سے جان چھڑانے کے لیے انہوں نے اس علاقے سے گھر بدل دیا تھا۔ اب یہ یہاں آکر انہیں تنگ کرنے اور ذلیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اللہ جانے کون جی بول رہا ہے اور کون جھوٹ۔“ نوفل نے کندھے اچکا۔
 ”وہ لڑکا کچ کہہ رہا ہے۔“ غیب کی آواز جیسے کسی گہرے اندھے ننوں سے نکلی تھی۔
 ”تمہیں کیسے پتا؟“ نوفل اچھل پڑا۔
 ”میں نے اپنی بیوی اور ساس کی گفتگو اتفاقاً سن لی تھی۔ اسی لیے میں تم سے پوچھنے آیا تھا، بلکہ اپنے دل کا بوجھ لٹا کرنے آیا تھا، کیونکہ میں کسی سے بھی یہ باتیں نہیں کر سکتا، سوائے تمہارے۔“
 غیب کے منہ سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے، اس کی ساعوتوں میں وہ ساری باتیں ابھی تک گونج رہی تھیں اور دل و دماغ پر نقش ہو گئی تھیں۔
 اس دن وہ اپنا موبائل لینے لاؤنج کے دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے ماہم کی آئی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔
 ”ای! اس ظفر کینے کا تو کچھ علاج کریں، آج یہاں پہنچ گیا، کل کو میرے گھر پہنچ گیا تو؟ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”میں اس کا بندوبست کر رہی ہوں، تم فکر مت کرو، بات اگر کھل بھی گئی تو مانی تو تمہاری مٹھی میں ہے ہی، اس چغڑ کو تو لینا کوئی مشکل نہیں، ہاں البتہ وہ بڑھیا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، مگر خیر بڑے بڑوں کو بے وقوف بنایا ہے، اسے بھی ہینڈل کر ہی لیں گے۔“ اسی کے انداز میں بڑی لاپرواہی تھی۔
 ”فوٹو بتا رہی تھی کہ وہ دھمکی دے کر گیا ہے، زیور اور رقم کے لیے پولیس میں رپورٹ کرے گا۔“ ماہم کے لب و لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

”ارے ہٹاؤ، بہت دیکھے ہیں ایسے۔“ اسی نے ظفر کو ایک موٹی سی گالی دی۔ ”ہمارے بندے کیا کم ہیں پولیس میں، ایک فون کرنے کی دیر ہے اس حرام کے ملے کو اسی وقت اٹھا کے لانا نکا دیں۔“ اسی غصے میں بولیں، پھر چند لمحوں بعد پھر گویا ہوئیں۔
 ”تم اس کی فکر میں خود کو بھگان مت کرو، بس اپنے شوہر کی طرف توجہ دو، اچھا ہوا کہ اپنا سارا زیور تم نے یہاں لاکر رکھ دیا ہے، کوئی بات اگر ہوئی بھی تو زیور تو ہمارے ہی پاس ہو گا، تم یہ بتاؤ تم نے گھر کی کچھ سن سن لی، اس بڑھیا کے نام سے یا غیب کے؟ اگر تمہارے عاشق کے نام سے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہوگی، اپنے نام کروانے میں۔“
 ”میں نے باتوں باتوں میں پوچھا تھا مانی سے، گھر تو اس منحوس بڑھیا کے نام سے، ناگن بن کر بیٹھی ہے جائیداد پر، وہ مرے تو کچھ آسرا ہو۔“ ماہم کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ غیب کے لیے ایک لمحہ بھی رکنا محال تھا۔
 وہ اس گھر سے باہر نکل آیا مگر ان باتوں کو اپنے دل و دماغ سے کیسے نکالتا؟ اپنی زندگی اور دل سے اس شدید اور گہری محبت کو کیسے نکالتا جو ماہم کے لیے تھی، کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔
 سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں جھٹنے لگی تھیں، ناچار اس نے سب کچھ نوفل سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا۔
 مگر نوفل سے مل کر بات کر کے دل کا بوجھ کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اعتبار اور محبت دونوں کا ہی خون ہوا تھا اتنی جلدی اور آسانی سے نہ صبر آتا۔ نہ سہلنا ممکن تھا۔
 گھر آکر بھی وہ جیسے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ بیڈروم تو جیسے کٹ کھانے کو آ رہا تھا۔ ایک ایک شے سے اس کی محبت کی کوئی نہ کوئی بات، کوئی نہ کوئی یاد ابستہ تھی، گھر آکر وہ لاؤنج میں آکر لیٹ گیا۔
 داؤدی کو اس کی شکل اور حالت دیکھ دیکھ کر الگ تشویش ہو رہی تھی۔ کئی بار وہ پوچھ چکی تھیں اور غیب

موٹاپے سے نجات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی جڑ پیٹ کی خرابی ہے، موٹاپا اور پیٹ کا بڑھ جانا خواتین کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی طرح چہرے پر مہاتے کیل، جھانپیاں بھی پیٹ کی خرابی سے ہوتی ہیں۔ خواتین کے ان تمام مسائل کا حل موٹاپا، پیٹ کا بڑھ جانا، معدے گرانی وغیرہ اہمیت رکھتا ہے، چھپ، چھپ، جھانپیاں دور کر کے



نایاب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ

LAUHAR-E-HAZALI

واحد کا جوہر ہضم

قیمت = 80 روپے

کراچی	ریٹیم یارخان	لاہور
فون: 3333-233577 0314-2994207-45 WHL Herbale Lab Karachi-Pakistan	فون: 3333-233577 0314-2994207-45 WHL Herbale Lab Karachi-Pakistan	فون: 3333-233577 0314-2994207-45 WHL Herbale Lab Karachi-Pakistan

اور اگر یہ فیصلہ نہ بھی کرتا تو زندگی کے اس پل صراط پر چلنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا، جس پر ہر لمحہ اور ہر قدم عذاب تھا۔

طلاق نامہ اور حق مہر کی ایک لاکھ کی رقم کا چیک ماہم کے گھر پہنچ گیا تھا۔ سارا زور وہ پہلے ہی لے جا چکی تھی اور نہ بھی لے جاتی تب بھی نیب کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ اسے واپس لیتا کہ زندگی میں سب سے قیمتی چیزوں کا نقصان تو ہو چکا تھا، اعتبار کا، محبت کا، دل اور زندگی کا! ان نقصانات کے آگے ان مادی اشیاء کی کیا اہمیت تھی۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ دن میری زندگی کا بدترین دن تھا یا بہترین، جب تمہاری حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی، میرے دل میں خلوص اور محبت میں سچائی تھی۔ مگر کہیں نہ کہیں کچھ کھوٹ ضرور تھا، شاید تمہارے اندر یا شاید میرے نصیب میں، بہر حال تمہیں جس شے سے محبت ہے وہ تمہیں مبارک ہو، زیورات بھی، حق مہر کی رقم بھی اور وہ بھی جو ہمارے جوائنٹ اکاؤنٹ سے تم نے میرے علم میں لائے بغیر نکال لیا۔ زندگی میں تمہیں شاید سب کچھ ملے، مگر یہ دل اور یہ محبت شاید ہی کہیں ملے۔“

ماہم بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ نیب ساری اصلیت جان چکا ہے اور یہ کہ سب کچھ جاننے کے بعد وہ اتنی جلدی اور انتہائی قدم اٹھا لے گا۔

”اب کیا ہوگا؟“ ماں کے آگے وہ سوالیہ نشان بنی بیٹھی تھی۔

”مے دفع دور یہ مرد ہوتے ہی بڑے کہنے ہیں، فیصلہ کرنے کے بہانے چاہیں بس، ارے ہم سے بات تو کرتا، پوچھتا تو سہی، ہم کچھ نہ کچھ بات سمجھا پھر اگر اس کا غصہ تو ٹھنڈا کر دی دیتے، پھر اپنے باپ بننے کی خوش خبری سننا تو طلاق کی توقیت ہی نہیں آتی، اب

ہی میری دعاؤں میں شامل رہتے ہو۔“ دادی نے بے چین ہو کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”بناؤ گے نہیں کیا بات ہے؟“ چند لمحوں بعد انہوں نے پوچھا۔

”بنا دوں گا بس ایک آدھ دن رُک جائیے۔“ نیب ایک گہری سانس لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

رات میں پھر ماہم کا فون آیا تھا۔ نیب نے اینڈز کر لیا، کب تک گریز کرتا، سامنا تو بہر حال کرنا ہی تھا، اور فیصلہ بھی۔

”آپ کہاں ہیں، آج تیسرا دن ہے، آپ کو مسلسل فون کر رہی ہوں، مگر کوئی رسپانس نہیں، آپ مجھے لینے بھی نہیں آئے، میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ورنہ میں خود آ جاتی۔ آپ سے ایک بات کہنا تھی، مگر گھر اگر بناؤں گی، آپ لینے کب آئیں گے؟“ نیب کی مختصر سی بیلو کے جواب میں وہ ٹان اسٹاپ شروع ہو گئی۔

”مجھے بھی بات کرنی ہے تم سے، میں وہیں آ کر کروں گا۔“ نیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا، پھر کل آ رہے ہیں آپ؟“ ماہم نے اس کے سنجیدہ لب و لہجے پر توجہ دیے بغیر بے چینی سے پوچھا۔

”کل تو نہیں دو تین دن بعد آؤں گا۔“

”خیریت؟ کوئی مصروفیت ہے کیا؟“ ماہم چونک پڑی۔

”ہاں، آفس میں آج کل کام ہے، بہت دیر ہو جاتی ہے۔“

”اچھا، پھر آنے سے پہلے فون کر دیجیے گا، ٹھیک ہے۔“ ماہم کی آواز سے کچھ کچھ مایوسی جھلک رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ نیب نے مختصر جواب دے کر سیل آف کر دیا۔

فیصلہ وہ کر چکا تھا، یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایک آگ کا دریا تھا جو اس نے اس دوران عبور کیا تھا،

انہیں برابر مل رہا تھا۔

”ماہم سے کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ دادی کی سوچ اور اندازے کی اڑان یہیں تک پہنچ سکی تھی۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آفس کی کچھ پرابلیمز ہیں، اس لیے پریشان ہوں۔“ نیب نے تجسوت کا سہارا لیا، وہ ابھی دادی کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جب تک کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر لیتا، ان سے کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

پچھلے تین دن سے ماہم کا فون مسلسل آ رہا تھا، کبھی وہ اپنا سیل آف رکھتا، کبھی ان ہوتا تو فون کاٹ دیتا، مگر یہ سلسلہ کب تک ایسے جاری رہتا، ہو سکتا ہے کہ آج کل میں ماہم خود گھر آ جاتی، پھر بھی تو نیب کو کوئی نہ کوئی فیصلہ کن انداز اختیار کرنا ہی تھا۔

”بیٹے! کوئی پریشانی ہے تو اللہ سے مدد مانگو، فیصلہ کرنے کے لیے اس سے رہنمائی مانگو، اس سے بڑھ کر ہمارا خیر خواہ کوئی نہیں۔“ دادی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑی محبت اور دل سوزی سے کہہ رہی تھیں۔

نیب چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا، نہ جانے کیوں اس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

”میں نے بچپن سے تمہیں اپنے ہاتھوں سے پالا ہے، تمہیں کبھی اتنا پریشان اور غم زدہ نہیں دیکھا، تم اگر مجھے کچھ بتانا نہ چاہو تو تمہاری مرضی، مگر مجھے یقین ہے کہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنسے ہو اور اس کا تعلق تمہاری بیوی سے ہے، تمہاری مشکل کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی، بس دعا کر سکتی ہوں تمہارے لیے، جو کہ میں ہر وقت ہی کرتی ہوں، دادی بدستور اس کا سر سہلائی جا رہی تھیں اور بولتی جا رہی تھیں۔

نیب کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا۔

”میرے لیے بہت دعا کریں۔“ بدقت وہ بولا تو پھر بھی اس کا الجھ اور آواز دونوں بھلے ہوئے تھے۔

”کہنے کی ضرورت نہیں ہے میرے چاند! تم ہمیشہ

اس کو اپنی رپورٹ بھیج دو اور فون پر بات بھی کرو، نیچے کی ذمہ داری تو یاب رہی ہوگی، ہم کہاں سے اتنا خرچہ کریں گے۔“ ان کے لہجے اور آواز کی ساری شائستگی اور ملائمت ختم ہو کر اس کی جگہ کرنٹکی اور بد زبانی نے لے لی تھی۔

”بھی فون کرو اس خبیث انسان کو ذرا اسے بھی تو اس خوش خبری کے بارے میں پتا چلے۔“ امی کے زہریلے لب و لہجے میں نفرت اور عناد کے سانپ پھینکار رہے تھے۔

ماہم تابع داری کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ملال کے سائے تھے، مگر یہ ملال گھبراہٹ اور محبت کے کھونے کا نہیں بلکہ ان بادی فواند سے محرومی کا تھا جو غیب کی، ہم سفری میں متوقع تھے۔



اس بار سے چہرے پر خزاں سی مسکراہٹ

بچتی نہیں ہے

شہزائے بین دلیا اور ایک کے بعد ایک مسیحز بردستی جاری تھی اور مسکراتی جاری تھی۔

آنسوؤں کا نمک

محبت کی شیرینی میں

اچھا نہیں لگتا

سروبوں کی گرم دھوپ سی

کھلی کھلی لڑی

کیا بھی میرے بارے میں بھی سوچتی ہے؟
”جنا ب! کیا بھی آپ بھی سوچتی ہیں موصوف کے بارے میں؟“ شہزائے شرارت سے بہن کی طرف دیکھا۔

”یہ اوٹ پانگ باتیں تمہیں بہت اچھی لگ رہی ہیں، ادھر دو میرا موبائل۔“ عازنہ نے اس کے ہاتھ سے موبائل لینا چاہا، مگر شہزائے فوراً پیچھے کر لیا۔

”پڑھنے تو دو۔“ شہزائی توجہ پھر موبائل کی جانب ہو گئی۔

ان ستارہ سی آنکھوں میں کاش!

میرا بھی کوئی خواب ہے
”اوہ! شہزائے ہونٹ سیکڑتے ہوئے عازنہ کی طرف دیکھا۔

”پھر؟ دیکھا کوئی خواب؟“ وہ عازنہ سے مخاطب ہوئی۔

”ادھر دو میرا موبائل۔“ عازنہ نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

”وہیے فراز بھائی بھی پورے احمد فراز ہی نکلے۔“ شہزائے گئی۔

”احمد فراز نے اتنی اوٹ پانگ شاعری نہیں کی۔“ عازنہ نے جواب دیا۔

”مگر وہ منہ شک تو ہے نا!“ شہزائے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”کیا؟“ عازنہ جانے کن خیالوں میں گم تھی فوری طور پر اس کی بات سمجھ نہیں پائی۔

”احمد فراز کی شاعری اور فراز بھائی کی باتیں جو وہ کبھی اپنی زبان سے کہتے ہیں، کبھی مبالغہ ہے۔“

”ہوں۔“ عازنہ نے شخص ایک ہنکارا بھرے پر اکتفا کیا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ شہزائے دیر سے اسے گم صم دیکھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں۔“ عازنہ نے اسے ٹالنے کی کوشش کی، مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھی۔

”تم سے چھپاؤ کی؟“

”تم سے کچھ چھپا سکتی ہوں میں؟“ عازنہ نے الٹا اس سے سوال کیا۔

”نہیں، اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ کیا بات ہے؟“ شہزائے اطمینان سے بولی۔

”میں سوچ رہی تھی کسے۔“ عازنہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کہ فراز بھائی یا مانی بھائی کس کا انتخاب کریں؟“ شہزائے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔

”ہاں، یہ ہی بات ہے۔“ عازنہ نے ایک گہری

سانس لی۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ سوچ بچ محبت ہی تھی یا محض وقتی فیملنگز یا پھر شاید بتائیں کیا۔“ عازنہ بہت الجھ رہی تھی۔

”بھئی یہ ہی بات ایک خواب لگتی تھی، میں سوچتی تھی کہ اس خواب کی تعبیر اگر مل جائے تو شاید میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں، مگر اب جبکہ داوی رشتہ لانے کا عندیہ دے رہی ہیں، مجھے ویسی خوشی کیوں نہیں ہو رہی جیسی میں کبھی سوچا کرتی تھی۔ فراز کے متعلق سوچتی ہوں تو بھی کوئی خاص فیملنگز نہیں ہوتی، بس یہ ہے کہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے، اپنے دعویوں میں سچا اور پُر خلوص بھی لگتا ہے، مگر وہ تو اس کے نام پر بھی نہیں دھڑکتا، میں کیا کروں؟“ عازنہ دھیرے دھیرے بول کر اس سے اپنی الجھن شیر کر رہی تھی۔

”ایسا کرو، اس کرلو۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

”کیوں اس مت کرو۔“ عازنہ کو ہنسی آ گئی۔

”بھئی داوی نے شخص تمہاری مرضی معلوم کی ہے، ابو سے باقاعدہ بات تو نہیں کی تا جب پروپوزل دیں گی تب دیکھا جائے گا، ابھی سے کیوں پریشان ہو رہی ہو۔“

شہزائے اس بار یسٹینا، ”معقول بات کی۔“

”پروپوزل دے دیا تو معاملہ پیہر ہو جائے گا، ابھی تک تو یہ بات صرف مجھ تک ہی محدود ہے۔“ عازنہ نے ایک گہری سانس لی، داوی نے پرسوں ہی تو اس سے بات کی تھی، ان کی مختصر بات عازنہ کو من و عن یاد تھی۔

”بیٹی! میں تمہاری داوی ہی نہیں سہیلی ہوں، اسی لیے پہلے تمہاری مرضی معلوم کرنا چاہتی ہوں، مانی کی دوسری شادی ہے، اس کی بیٹی ابھی تو ماں کے پاس ہے، مگر وہ اپنی بیٹی کو ان لوگوں سے لے لے گا، چاہے عدالت کے ذریعے لے یا ان لاپچی عورتوں کا منہ دولت سے بند کر کے لے، تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“

انہوں نے اپنی بات کہہ دی تھی، اب عازنہ اسی

اوہڑ بن میں تھی کہ کیا فیصلہ کرے، فرازان کی خالہ کا بیٹا تھا، پچھلے چھ ماہ سے وہ عازنہ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا، خالہ کا جھکاؤ بھی اس طرف تھا، اس وہ اس انتظار میں تھیں کہ فراز سے بڑی بہن شازیہ کا رشتہ ہو جائے تو وہ باضابطہ طور پر فراز کا پروپوزل یہاں دے دیں۔

عازنہ شش و پنج میں تھی۔ غیب اس کی اولین چاہت، پہلا خواب تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا غیب کی شادی کے بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو اس خواب نگری سے باہر نکال لیا، یا پھر وہ جذبات اور احساسات ہی وقتی اور کمزور تھے جو بعد میں اس شدت کے ساتھ قائم نہ رہ سکے۔

ادھر فراز اس کی زندگی میں یوں اچانک سے داخل ہو گیا، نہ کھٹ شوخ مزاج اور پُر خلوص فراز جو اپنے دل میں اسے بسا کر زندگی میں بھی بسانا چاہتا تھا۔

”کیا کروں؟“ عازنہ مسلسل اسی موضوع پر سوچ رہی تھی۔

فراز اسے چاہتا تھا، اس نے کبھی غیب کو چاہا تھا، اب وہ کیا چاہتی ہے، نہیں معلوم، غیب نے کبھی ماہم کو چاہا تھا، اب علیحدگی کے تقریباً ایک سال بعد وہ کیا چاہتا ہے؟ عازنہ کو اندازہ نہیں تھا۔

”کیا شادی کے بعد وہ مجھ سے اسی طرح محبت کر سکے گا جس طرح ماہم سے کی تھی یا جیسی محبت مجھ سے فراز کرتا ہے۔“ عازنہ خود سے پوچھ رہی تھی، مگر اسے اپنے اندر سے بھی کوئی واضح جواب نہیں مل رہا تھا۔



میز پر ہمیشہ کی طرح بہت سے لوازمات تھے، مگر اس نے محض چند رقموں پر ہی اکتفا کیا اور کھڑا ہو گیا۔

”بس کھالیا؟“ داوی پچھلے ایک سال سے روزانہ ناشتے اور ہر کھانے کے بعد اس سے یہی سوال کرتی تھی اور پھر اصرار۔

”تھوڑا سا تو اور کھاؤ، تم نے تو کھانا پینا بالکل ہی

چھوڑ دیا۔“ داوی دکھ اور تاسف سے اپنے انتہائی لاڈلے پوتے کو دیکھتیں، جو کبھی بہت خوش خوراک تھا۔

”بیٹہ بھر گیا۔“ فیب نے سنجیدگی سے وہی جواب دیا جو وہ پچھلے ایک سال سے ہی دے رہا تھا۔
”بیٹہ جاؤ، مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔“ داوی نے اس کی طرف بغور دیکھا۔
”جی؟“ فیب بیٹھ گیا۔

”میں نے عازرہ کو سوچا ہے تمہارے لیے، پہلے بھی میرا ارادہ اسی کے لیے تھا۔ مگر تمہاری مرضی کچھ اور تھی۔ اب یہ ہے کہ جو کچھ نصیب میں لکھا تھا وہ تو ہو چکا، زندگی تو کسی طور گزارنا ہی ہے، اکیلے کب تک رہو گے؟ تم کو تو میں بات کروں؟“

”میں شادی کے لیے تیار ہوں، مگر عازرہ سے نہیں۔“ فیب سابقہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔
”پھر؟“ داوی نے حیران پریشان ہو کر اسے دیکھا۔
”ثروت آنٹی کی موش۔“ فیب نے اختصار سے کام لیا۔

”موش؟“ داوی کے لہجے میں ڈھیروں ڈھیروں حیرت سمٹ آئی۔ فیب خاموش رہا۔
”مگر وہ تو...“ داوی کچھ کہتے کہتے پھلا گئیں۔
”وہ بیوہ اور ایک بیٹی کی ماں ہے، اچھی طرح جانتا ہوں اور اسی لیے یہ شادی کر رہا ہوں، اگر اس بیٹی کو میری شکل میں باپ مل جائے تو ہو سکتا ہے قدرت مہربان ہو کر میری بیٹی کو بھی اس کے باپ سے ملا دے۔“ فیب نے بہت عرصے بعد ہوں ہاں سے ہٹ کر کوئی طویل بات کی تھی۔

”دوسرے کی اولاد کو اپنا اپنا بھائی بہت ہمت، حوصلے اور اعلا طرکی کا کام ہے، اتنی بڑی ذمہ داری نبھالو گے؟“ داوی نے سوال کیا۔
”جب ایک عورت دوسرے کی اولاد کو سینے سے لگا سکتی ہے تو موش بھی اتنے بڑے دل اور ظرف کا مالک ہو سکتا ہے، اور ویسے بھی میں کسی مجبوری میں نہیں، بلکہ اللہ کی رضا کے لیے یہ نیکی کر رہا ہوں، تاکہ وہ میری

مشکلات بھی آسان کر دے، مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ ذمہ داری اٹھانے کا اہل بنادے گا۔“
”تھکے تھکے انداز میں بولتا ہوا وہ بہت مختلف فیص لگ رہا تھا، بے حد سنجیدہ ذمہ دار اور پیچیدہ شخص۔“

داوی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی، جہاں اس کا پختہ عزم و ارادہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔
”انہوں نے ایک گہری سانس لی اور خاموش ہو گئیں۔“

بڑی پچھو اور چھوٹی پچھو چھٹی والے دن آئی تھیں۔ داوی نے بی بی انیس فون کر کے بلوایا تھا۔
”لو بھلا ہمارے نتیجے کے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ابھی بھی ایک سے ایک اچھی اور کنواری لڑکی مل جائے گی، میں ڈھونڈتی ہوں اس کے لیے لڑکی۔“
چھوٹی پچھو جوش کے عالم میں رہی تھیں۔
”یہ لڑکی تو نان اسٹاپ بولے ہی چلی جاتی ہے۔“

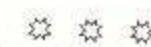
داوی نے اپنی چھوٹی بیٹی کو گھورا جو چار بڑے بڑے بچوں کی اماں ہونے کے باوجود ان کے لیے لڑکی بنی تھی۔
”اگر ہمارا بچہ ایک اچھا کام کر رہا ہے تو ضروری ہے کہ ہم اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے راہ میں روڑے نہ لگائیں۔“ داوی ذرا سخت لہجے میں بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

”میرا یہ مطلب تھوڑی تھا“ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اور بھی کوئی اچھی لڑکی مل سکتی ہے مانی کو۔“ بیٹی صاحبہ ذرا گڑبڑا کر بولیں۔
”موش بھی اچھی لڑکی ہے، اللہ سے بہتری اور خوشیوں کی دعا کرو۔“ اس بار داوی کالجہ رساں لیے ہوئے تھا۔

”ہاں دعائیں تو میں ہمیشہ ہی کرتی ہوں۔“ انہوں نے ہاں کو بڑبڑا کر انداز میں یقین دلایا۔
”ثروت کا فون نمبر چاہیے، جو نمبر میرے پاس تھا“ وہ تو نیکی بار ملایا، مگر شاید منہ پڑا ہے، ملا ہی نہیں۔“ داوی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

”میرے پاس سرور بھائی جان کا نمبر ہے اس پر ڈرائی کر لیں۔“ انہوں نے ثروت آنٹی کے شوہر کا نام لیا۔
”شکر ہے اللہ کا، یہ مشکل بھی آسان ہوئی، میں نے سوچا کہ پہلے فون پر بات کر لوں، یوں اچانک رشتہ لے کر جانا کچھ مناسب نہیں ہے، ہے نا؟“ داوی نے ان سے تصدیق چاہی۔

”ٹھیک ہے، پہلے فون پر ہی بات کر لیں۔“ بڑی پچھو نے بھی شکر اکر اپنا عندیہ دے دیا۔
”اللہ خوشیوں سے نوازے دونوں کو۔“ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے دعا بھی دے ڈالی۔
”آمین۔“ ان کی دعا کے جواب میں سب کی آمین مشترکہ تھی۔



گلابی اور سفید کے استراج کے ساتھ بہت ہی نفیس لباس، پتھو لوں کا زیور اور ہلکے ہلکے میک اپ میں وہ بہت جاذب نظر لگ رہی تھی، مضامنی کھلا کر سادگی کے ساتھ رشتہ طے کر رہا تھا، مختصر سے دورانے کی چھوٹی سی تقریب میں گئے تھے افراتفرے۔
”اللہ یہ رشتہ سب کو مبارک کرے خوشیوں سے نوازے اور سب کو ایک دوسرے کے حق میں بہترین بنائے۔“ داوی نے عازرہ کی پیشانی چومتے ہوئے بہت محبت اور دل سے دعائیں دیں۔

رات میں سب کے جانے کے بعد عازرہ چنچ کر کے میک اپ صاف کر رہی تھی کہ شہزائے اسے ٹوک دیا۔
”رہنے دو، اچھی لگ رہی ہو۔“
”کیوں، بغیر میک اپ کے اچھی نہیں لگتی کیا؟“ عازرہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔
”کسی کو اچھی لگنو نہ لگو، فراز بھائی کو تو اچھی لگتی ہو نا!“ شہزائے شرارت سے آنکھیں چھمکائیں۔

عازرہ خاموش رہی، مگر فراز کے نام پر اس کے لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ضرور بکھر گئی۔
”تم خوش تو ہو نا؟“ شہزائے کنسی کے بل نیم دراز

ہوتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔
”کیا میں خوش نہیں لگ رہی؟“ عازرہ نے الٹا اس سے سوال کیا۔
”لگ تو رہی ہو۔“ شہزائے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

”پھر پوچھ کیوں رہی ہو؟“
”یونہی تمہاری زبان سے اعتراف سننے کا دل چاہ رہا تھا۔“ شہزائے کالجہ بظاہر لا پرواہی لیے ہوئے تھا، مگر پردہ شرارت چھپی ہوئی تھی۔
”سن لیا اعتراف؟“

”ہاں!“
”نہی ہو گئی؟“
”ہاں!“

”اب سکون سے سو جاؤ۔“ عازرہ نے مشورہ دیا۔
”کہتے ہیں شادی اس سے کرنی چاہیے جو آپ سے محبت کرتا ہو، نہ کہ اس سے جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔“
”جس نے بھی کہا، صحیح کہا ہے۔“ عازرہ نے اقرار کیا۔
”تم نے کیا یہی سوچ کر فیصلہ کیا تھا؟“ شہزائے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے، بہنوں کے لیے
نیم ستر قریبی کے 3 خوبصورت ناول

ستاروں کا آئین قیمت - 400 روپے
توشیک سترہا قیمت - 300 روپے
میرے دل میرے مسافر قیمت - 250 روپے

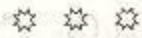
ناول بخانے کے لیے ایک نیا نیا 45 روپے

بھانسنے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216361

کے بجائے باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔
 ”ہاں“ کچھ اسی قسم کا ہی خیال آیا تھا مجھے اور اچھا ہی
 ہوا کہ وادی کا فون آنے سے پہلے ہی میں نے سوچ سمجھ
 کر فراز کے حق میں فیصلہ کر لیا تھا، وادی نے مجھے بتا دیا
 تھا کہ مالی کا فیصلہ اس بار بھی کچھ اور ہے۔
 ”ویسے موش بھابھی اور مالی بھائی کا کپل اچھا لگ
 رہا تھا نا!“ عازنہ کی باتوں کا رخ اب دوسری طرف مڑ گیا
 تھا۔

”ہاں“ ذمہ میں خاص طور پر دونوں بہت اچھے لگ
 رہے تھے۔“ عازنہ نے پچھلے ماہ ہونے والی تقریب کو یاد
 کرتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا۔
 ”ویسے ایک بات ہے مالی بھائی کا دل بہت بڑا ہے،
 ان کو اب بھی ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی تھی،
 مگر انہوں نے موش بھابھی کا انتخاب کیا، ابو تو ان کی
 بہت ہی تعریف کر رہے تھے، بے ساروں کا سہارا بننا
 بہت بڑی نیکی ہے۔“

”ہاں“ یہ تو ہے، بس اللہ تعالیٰ ان کی نیت قبول
 کرے اور ان کی ساری مشکلات آسان کرے،
 آمین۔“ عازنہ نے ہیڈ پر لپیٹے ہوئے گفتگو کا اختتام کیا
 اور آنکھیں موند لیں۔



عازنہ کا رشتہ کیا طے ہوا اسے تو ایسا لگا کہ دن بر لگا کر
 گزر گئے، ایک سال گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا، شادی
 کی تائن ختم ہوئی اور دونوں گھروں میں زور و شور سے
 تیاریاں ہونے لگیں۔

نومبر کی ٹھنڈی ہوائیں سردی کی لہر لے آئی تھیں،
 ان ہی ہواؤں کے دوران ایک نرم گرم دھوپ والے
 دن شادی کی تیاریاں مؤخر کر کے وہ دونوں وادی کے گھر
 جاری تھیں، موش اور فیب کو اللہ نے ایک پیارے
 سے بیٹے کی نعمت سے نوازا تھا۔

”پتا نہیں کس کی طرح ہو گا چھوٹا سا بھالو۔“ شہزا
 تصور میں بچے کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وادی بتا رہی تھیں کہ بالکل مالی بھائی ہے۔“ عازنہ
 مسکراتے لگی۔
 ”ویسے مالی بھائی کی بیٹی بھی بالکل ان ہی کی طرح ہی
 ہے، وہی آنکھیں، وہی چہرہ، اور تو اور مسکراتی بھی بالکل
 اپنے بابا کی طرح ہے، ہے نا!“ شہزا نے عازنہ سے
 تصدیق چاہی۔
 ”اللہ کرے سیرت میں بھی اپنے بابا پر ہی جائے،
 امی پر نہیں۔“

عازنہ سنجیدگی سے گویا ہوئی اور قریب سے گزرتے
 رکشہ کو ہاتھ دینے لگی، وادی کا گھر کوئی بہت زیادہ دور
 نہیں تھا، بس پندرہ منٹ لگتے تھے رکشہ پر نیکی میں۔
 وادی کے گھر جاتے ہوئے عازنہ سوچ رہی تھی کہ
 اللہ کتنا مہربان اور رحیم ہے، اپنے بندوں کی نیکی کا اجر
 خوب بڑھا چڑھا کر دیتا ہے، ماہم کہاں تو بیٹی کے خرچے
 کے نام پر فیب سے خیر رقم منور رہی تھی، مگر بیٹی دینے

پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر جب اسے اپنی خواہش اور ہوس
 کے مطابق ایک نیا شکار مل گیا تو وہ خود بخود بیٹی کو
 باپ کے سر پر رکھنے پر رضامند ہو گئی کہ اس کا ہونے
 والا شوہر بیٹی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور ماہم اس
 شہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہذا اس بچی
 کو فیب کے حوالے کر دیا۔ موش نے اس بچی کو اسی
 محبت اور متانے کے جذبے کے ساتھ سینے سے لگالیا، جیسے
 فیب نے اس کی سیم بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ شہزا نے بہت دیر سے
 خاموش عازنہ کو شوکا دیا۔

”بس یونہی، ماہم کا خیال آیا تھا میں سوچ رہی تھی
 کہ لالچ اور ہوس کتنے بڑے جذبے ہیں کہ جی بکھار
 متا جیسے جذبے پر بھی غالب آجاتے ہیں۔“ عازنہ نے
 تاسف سے ایک گہری سانس لی۔

ماہم نے بیٹی کو باپ کے حوالے کرنے کے عوض
 لالچ لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا، جو فیب نے بخوشی ادا
 کر دیے کہ اسے اپنی بیٹی دنیا جہان کی دولت سے زیادہ

عزیز تھی۔
 ”جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا، چھوٹو، دفع کرو، تم
 کیوں افسوس کر رہی ہو؟“ شہزا نے لاپرواہی سے
 بولتے ہوئے بات ہی ختم کر دی۔

دونوں وادی کے گھر پہنچیں تو وہاں پہلے ہی سے
 بارونق محفل جمی ہوئی تھی۔ بڑی پچھو اور موش کے
 گھر والے پہلے ہی سے موجود تھے۔ چھوٹی پچھو بھی
 بس ابھی ابھی ان دونوں کے آگے ہی پہنچی تھیں، اور
 اب سب کے ترغے میں سے نومولود مہمان کو نکال کر
 اپنی گود میں لیے باتوں میں مصروف تھیں۔

”چلو اللہ کا شکر ہے کہ بیٹیاں تو تھیں ہی، اس نے
 بیٹا بھی دے دیا، لڑکیوں کی فکر اور ذمہ داری ذرا زیادہ
 ہوتی ہے، لڑکوں کے لیے تو یہ دنیا بڑی نرم اور زندگی
 آسان ہوتی ہے، کیوں؟“ انہوں نے تائید طلب
 نظروں سے جملہ حاضرین کی طرف دیکھا۔

”ایسی بات نہ کریں پچھو، لڑکا ہوا تو لڑکی دعاؤں کی
 ضرورت تو ہر انسان کو ہوتی ہے، دل ٹوٹے یا گھر کا نہت
 لڑکے کے لیے بھی اتنی ہی ہے جتنی لڑکی کے لیے۔“
 فیب سنجیدگی سے کہتے ہوئے چند ٹائپے خاموش ہوا،
 پھر نکلے لگا۔

”آپ سب لوگ پلیز میری بیٹیوں کے ساتھ
 ساتھ میرے بیٹے کے لیے بھی اچھے نصیب اور
 خوشیوں کی دعا کریں۔“

”ٹھیک کہتے ہو بیٹا، بیٹی ہو یا بیٹا، دعاؤں کی ضرورت
 دونوں کو ہی ہوتی ہے، اللہ اس بچے کو نظر سے بچائے
 اور دنیا و آخرت دونوں میں علایت سے نوازے۔“
 موش کی امی نے فیب کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے
 کہا۔

”بھئی۔ مٹھائی کہاں ہے؟ اتنی دیر سے سوکھے منہ
 بیٹھے ہوئے ہیں۔“ شہزا نے ماحول کی سنجیدگی محسوس
 کرتے ہوئے اک نغمہ مستانہ بلند کیا۔

”ارے ہاں، تم سب ایسے آگے پیچھے آئے
 میرے تو ذہن سے ہی نکل گیا، جا بیٹی فریح میں مٹھائی





رُخسانہ نگارِ عَنان

حسرتِ خیرِ اسیر

قسط ۵۵

کوشش کے ساتھ قسمت کا کتنا عمل دخل ہوتا ہے۔ قسمت کے بغیر کوشش اکثر بے کار ہوتی ہے اور کوشش کے بغیر شاید قسمت بھی۔
 قسمت کو تو کسی نے نہیں دیکھا، لیکن کوشش۔ کم از کم اس کی کوشش قسمت کے ساتھ کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت بھی یہ ہی ہوا۔
 بالکل عین وقت یہ جبکہ شاید جمالیہ ہدائی کی آخری سانس اس کے گلے تک آچکی تھیں اور صوفے سے گرا آواہر بھی مزاحمت کرنا موقوف کر چکا تھا۔ اپنی طرف سے ثانیہ نے کمرے کا دروازہ بھی بند کیا تھا، پھر۔
 بس اصل جھگڑا وہی قسمت اور کوشش کے بیچ ہوا اور ہاتھ آئی بازی الٹ گئی۔
 یا شاید جمالیہ ہدائی کی موت کم از کم اس گھڑی نہیں گئی یا اگر گئی بھی تو ثانیہ مراد کے ہاتھوں نہیں تھی۔ پہلے ہلکے سے پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور میڈیا قوت کی خاص ملازمہ ثانیہ کے سامنے کھڑی تھی۔

تانیہ نے جھک کر ہاتھ سے پھیلا کشن نیچے سے اٹھایا اور خود بھی کھڑی ہو گئی۔
جہانگیر ہدائی کے تھنے اس فراوانی سے آسجین ملنے پر کھل کر سانس لینے لگے۔
تانیہ رخ پھیر کر اپنے تنفس پر قابو پانے لگی۔

”کمرے میں کوئی آیا تھا؟“ ملازمہ یقیناً ”خوب سرچھی تھی جو کڑے تیوروں سے پوچھ رہی تھی۔
”اس (مردود) کے علاوہ ہمیں کوئی نظر آ رہا ہے۔“ تانیہ نے ذرا سارخ پھیر کر درستی سے کہا۔
”کھانا لگا دیا ہے میں نے ساتھ والے کمرے میں، یا جہانگیر صاحب کے اٹھنے کا انتظار کریں گی؟“
”یقیناً“ کرنی اگر اس کے دنیا سے اٹھنے کی امید ہوئی۔ ”دل میں کلمستی وہ ایک نظرب زور زور سے خرائے
لیتے جہانگیر ہدائی کو دیکھ کر بولی۔

”نہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے، ابھی کھانا چاہوں گی۔“ وہ اس پہ ایک نفرت بھری نظر ڈال کر ملازمہ کے پیچھے
کمرے سے نکل گئی۔

ڈانگ روم میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔
”مڈم یا قوت کب تک آئیں گی؟“ لمبی چوڑی میز پر سجا کھانا دیکھ کر اس کی جانے کتنے دنوں کی سوئی بھوک
جاگ اٹھی تھی۔

”معلوم نہیں۔“ وہ دکھائی سے بولتی اس کے سر پہ ہی کھڑی رہی۔
تانیہ اگلا کوئی بھی سوال پوچھتے بغیر خاموشی سے بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔
بیرونی کسی کمرے میں پہلے ہلکی سی پچھل ہوئی اور پھر کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔
تانیہ پورے دھیان سے کھانا کھا رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے وقوع ہو جانے والی انہونی اس کے دماغ سے نکل چکی تھی کم از کم اس شیطان کا سرنا اس کے
ہاتھوں نہیں لکھا تھا۔

”الابی بی بی کدھر ہیں، وہ اسامہ صاحب آئے ہیں، پوچھ رہے ہیں، کیا بتاؤں؟“ دوسری ملازمہ اس پہلی والی سے
پوچھنے لگی۔

تانیہ کے ہاتھ وہیں رک گئے۔
دوسرے لمحے اسامہ کمرے میں داخل ہوا۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھٹک سے گئے۔
تانیہ کو بول لگا دیا بغیر میں اپنے وطن سے آئی ٹھنڈی ہوا کا کوئی معطر جھونکا لہجہ بھر کو یہاں آکر ٹھہر گیا ہو۔

”آپ یہاں کب آئیں؟“ وہ خوش گوار حیرت سے بولا۔
”آئیں بلایز، میرا ساتھ تو دس۔“ وہ ملازمہ کو دونوں کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔
”تو تھنکس۔ آپ کھائیں، میں ویٹ کر لیتا ہوں۔“ وہ ایک طرف بیٹھنے ہوئے بولا۔
”میں بھی کھا چکی۔“ وہ ہنسنے سے ہاتھ صاف کرتی کھڑی ہو گئی۔
”کافی ملے گی؟“ اس نے سر پر کھڑی اس مصیبت سے کہا۔

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی۔
”آپ پاکستان کب آئیں؟“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا۔
”آؤ گی ہوں، لیکن کیوں آئی ہوں بلکہ لائی گی ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ کمراسانس لے کر کچھ پریشانی سے

بولی۔

”کیا مطلب، آپ کو نہیں پتا؟“ وہ کچھ الجھا۔
”میں آپ کو شاید اپنے بارے میں تھوڑا بہت بلکہ کافی بتا چکی ہوں۔“ وہ جتا کر بولی۔
”جانتا ہوں میں۔“ کمرانجی جلدی آپ آ رہی ہیں اور ہر یہ مجھے انداز نہیں تھا۔“
”مجھے بھی نہیں تھا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

دونوں کچھ دیر کو خاموش ہو گئے۔
”آپ جن کی تلاش میں پاکستان آئے تھے وہ آپ کو ملے؟“ ذرا دیر بعد تانیہ کو خیال آیا۔
”ہوں!“ وہ کمراسانس لے کر بولا۔ ”یوں سمجھیں ملے بھی اور نہیں بھی۔“
تانیہ سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

”میرے پاکستان آتے ہی میرے فادر کی ہلٹھ ہو گئی اور۔۔۔ اور بس۔۔۔“
”وہ دیری سیڈ بہت برا ہوا یہ تو۔“

”معلوم نہیں برا ہوا کہ اچھا۔ بہت ساری چیزیں، بہت سارے واقعات جب وقوع پذیر ہوئے ہیں تو جیسے دھند
کے گمرے غبار میں لپٹے ہوتے ہیں۔ فوری طور پر ہم کچھ سمجھ نہیں پاتے، مگر پھر دیر سے دھیرے جب دھند چھٹتی
ہے تو۔۔۔“ اس کے سامنے عائشہ کا بے مروت چہرہ اُٹھیا، جس کی نظروں میں شناسائی بھی نہ رہی تھی۔
”کیا ان لوگوں نے آپ کو آسانی سے آنے دیا۔ بہت دیر بعد اسامہ کو خیال آیا۔

”یہ ہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے اچانک کیوں بلا لیا گیا، پھر میری اپنے بھائی سے بات بھی کرائی گئی
اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں، نئی ٹھنڈوں سے یہاں محسوس ہوں، جنہوں نے بلایا ہے وہ بھی موجود نہیں۔“
”کون؟“ اسامہ نا سمجھی سے بولا۔

”میرمیا قوت اس گورکھ دھندے کی آل ان آل۔“ وہ تلخی سے بولی۔
”اگر میں آپ سے نہ ملا ہوتا، آپ کی کہانی سن نہ چکا ہوتا تو شاید میں کبھی یقین نہ کرتا، کیا میرمیا قوت جیسی
ریفائنڈ لیڈی اس طرح کے گھناؤنے کام، تانیہ! آپ پولیس کی ہیلپ کیوں نہیں لیتیں؟“ اسے خیال آیا تو فوراً
بولی۔

”آپ پاکستان میں نہیں رہتے ہیں نا، اس لیے یہاں کی پولیس اور یہاں کے قانون کے بارے میں کچھ بھی
نہیں جانتے۔“
”یہاں ایسے لوگوں کی پشت پناہی ہماری پولیس، ہمارا قانون ہی تو کرتا ہے، چھوٹی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں، بڑے
مگر مجھ پھسل کر نکل جاتے ہیں، وہ کسی اور دریا میں جا کر پھر سے اپنے قدم جماتے ہیں اور پھر سے وہی دھندہ
شروع۔“

اتنے تھوڑے سے دنوں میں اسے اس گورکھ دھندے کی ساری تو نہیں تھوڑی بہت سمجھ آئی گئی تھی۔
”پھر اس کا کیا حل ہو گا؟“

”پتا نہیں۔ شاید میری موت یا پھر۔۔۔“
”یا پھر کیا؟“ وہ بے قرار سے بولا، جانے کیوں پہلے دن سے اس کا جی چاہ رہا تھا اس اچھی سی لڑکی کی مدد کرے
جو کہیں سے بھی اس فیلڈ کا حصہ نہیں لگتی تھی۔
”یا پھر میں کسی دور دیس، زمین کے اندر یا کسی دوسرے آسمان کے نیچے چلی جاؤں، چھپ جاؤں خود سے بھی۔

اور دیر بولنے کا خواب کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ آنکھیں بند کیے کھوئے ہوئے لمبے میں بولی۔
 دونوں پھر خاموش ہو گئے۔
 ”اگر لائبرے ہوتی تو وہ یقیناً“ آپ کی مدد کرتی۔“ ذرا دیر بعد اسامہ کو خیال آیا۔
 ”کون لائبرے؟“

”میڈم یا قوت کی بیٹی۔ شی ازوری نائس اینڈ پریٹی۔“ وہ آنکھوں کے سامنے لائبرے کا چہرہ لا کر جذب کے عالم میں بولا۔
 ”پریٹی۔“ تانیہ زیر لب یہی کہہ سکی۔ اس نے اسامہ کی آنکھوں میں بہت کچھ بڑھ لیا تھا۔
 ”انتہا جانتے ہیں آپ لائبرے کے بارے میں کہ وہ ضرور میری مدد کرتی؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولی۔

اسی وقت کافی آگئی۔
 دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔
 ملازمہ ان سے کچھ فاصلے پر پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی مگر انداز مستقل مگرانی کا تھا۔ دونوں شاید اس کے خیال سے خاموشی سے کافی پی رہے تھے۔
 ”آگے کیا سوچا ہے؟“ اسامہ آستنگی سے بولا۔
 ”کچھ نہیں کیا سوچنا ہے۔“ اسے پھر سے جاتگیز ہدانی کا خیال آگیا جو اٹھ کر آتے ہی اس کی جان مصیبت میں ڈال سکتا تھا۔

اسی وقت اسامہ کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔
 وہ موبائل سننے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”جی آئی بات کر رہا ہوں۔ جی میں تو آگیا تھا آپ کے کہنے کے مطابق آپ کہہ رہی ہیں، وہ اچھا تو پھر مرس تانیہ کو وہیں لے آؤں اپنے ساتھ۔ ٹھیک ہے آپ ویٹ کریں میں نکل رہا ہوں مرس تانیہ کے ساتھ۔“ اوکے“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون بند کر دیا۔
 ”آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا یا قوت آئی بلا رہی ہیں۔“ وہ تانیہ کے پاس آ کر جتانے والے انداز میں بولا۔
 ”تو آپ بھی؟“ تانیہ ششدر سی رہ گئی۔ (تو کیا اسامہ بھی ان ہی کا سا تھی ہے۔)
 ”پلیز ٹائم ویٹ نہیں کریں۔ میم انتظار کر رہی ہیں۔“ وہ غلبت بھرے انداز میں بولا۔ تانیہ نے ایک افسردہ سی نظر اس پر ڈالی اور اس کے ساتھ چل پڑی۔
 ملازمہ لحد بھر کو ٹوکھڑی رہی، پھر ان کے ساتھ چلتی باہر نکل گئی۔
 ذرا دیر میں اسامہ تانیہ کو لے کر گاڑی میں باہر نکل گیا۔



دائیم نے جراتی سے اپنے سیل فون کو دیکھا۔
 ”یہ اسامہ کیا بول رہا تھا اور اس نے میری ایک بھی بات نہیں سنی۔“ وہ حیران سا سوچتا رہ گیا۔
 اسے امید نہیں تھی کہ میڈم یا قوت اسپتال آجائیں گی، مگر جانے کیسے ان کے دل میں رحم آیا یا شاید دائیم کا خیال جو وہ اچانک آئیں اور لاوہر جو ان کے انتظار میں اپنی سانسیں گن رہا تھا وہی موجود نہیں تھا۔
 ”وہ بضد تھے گھر جانے کے لیے۔ انہیں یقین ہے عذہ گھری آئے گی تو آپ میرے ساتھ چلیں نا ان کے گھر

پلیز۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولا۔
 وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہیں۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ مجھے؟“

”تمہارے چہرے میں کسی اور کا چہرہ تلاش کر رہی تھی وہ بھولے بسرے، مگر خوب جانے بھالے خدو خال کہ اگر میری آنکھوں میں بصارت نہ بھی رہے تو بھی میں اس چہرے کو چھوئے بغیر پہچان سکتی ہوں۔“ وہ دل میں ہی سوچ کر رہ گئیں۔

”تم کیا سمجھتے ہو میں محمود عالم کا سامنا کرنے سے گھبرار رہی ہوں یا کرنا نہیں چاہتی؟“
 ”گھبرانے والی بات تو آپ جیسی برا اعتماد شخصیت کو دیکھ کر ایک دم جھوٹ لگے، ہاں سامنا نہیں کرنا چاہتیں اور کیوں نہیں کرنا چاہتیں، یہ سوال مجھے بھی اس ضد پہ اکسار رہا ہے کہ آپ کو میں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تو بالکل فکر مت کرو، سامنا کرنے سے نہ گھبرار رہی ہوں نہ کتھار رہی ہوں، ہاں تمہارے محترم انکل کی جو اس وقت تپلی حالت ہو رہی ہے، وہ یقیناً“ میرا سامنا نہیں کیا نہیں گے۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو ان کی بیوی۔۔۔ انہوں نے کہتے ہوئے دانت بچھنچھنے لیے۔ ”میں خود کو نہیں ان کو ٹائم دے رہی تھی ڈیر اڈر ان کا دل طاقت پڑے۔ ابھی تو کچھ معاملات رہتے ہیں ہمارے بیچ میں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولیں۔
 ”میں بھی دشمن کمزور ہو تو یا در مقابلے میں بھی مزہ نہیں آتا۔“ وہ مسکرا کر عامیانہ انداز میں دائیم کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”آپ ان سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟“ دائیم کو ان کے عراجم سے خطرے کی بو آئی تھی۔
 ”یہ میں نہیں تو کیا کسی کو بھی بتا سکتی، تھوڑا انتظار اور۔۔۔ ابھی تو مجھے لائبرے کی فکر ہے، جانے وہ کہاں ہے۔“ ایک دم سے انہیں یاد آگیا وہ جس کام کے چکر میں چکرا کر رہ گئی تھیں اب اوھر کھڑی محض ٹائم بریاد کر رہی ہیں۔

”لائبرے آئی تھنک شی از آل رائٹ۔“ دائیم کہتے کہتے رک گیا کہ لائبرے نے اسے سختی سے منع کیا تھا۔
 ”تم کہتے کہہ سکتے ہو یہ؟“ وہ شک بھرے انداز میں بولیں۔
 ”میں نہیں، میرا دل کہہ رہا ہے میم۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
 وہ اسے پہلے کی طرح یاد لٹائی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”پتا ہے دائیم! میں نے کیا سوچ رکھا ہے۔“ وہ ایک دم سے دوستانہ انداز میں بولیں۔
 ”صرف ایک بار تمہارے محمود عالم صاحب سے دو باتیں کرنی ہیں اس کے بعد لائبرے کے ملنے ہی وہ بھی ان شاء اللہ مجھے آج ہی مل جائے گی، اور پھر تمہاری سو کا لندہر کو دی گئی مملکت بھی سمجھو پوری ہو جائے گی تو پھر تم اپنے وعدے کے عین مطابق میرے ساتھ اور لائبرے کے ساتھ چلو گے۔ جہاں جانے کا میں نے سوچ لیا ہے اور ہم باقی کی زندگی وہاں جا کر خوب سکون اور خوشی سے بسر کریں گے، میں یہ سب کام سب کچھ چھوڑ دوں گی۔“ ان کی آنکھوں میں بہت سے جگنو بہت سے ستارے تھے۔

”کون سے کام؟“ دائیم نے بہت برا اور بہت بے وقت یہ سوال کیا تھا۔
 وہ سوال جو شاید اسے ان سے ملاقات اور ان کی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہونے کے ابتدائی دنوں میں پوچھ لینا چاہیے تھا۔

میڈیمیا قوت نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی اور نظریں پھیر لیں۔
 ”تم اب گھر جا کر ریٹ کرو۔ میں کل ان شاء اللہ خود ہی محمود عالم کے پاس پہنچ جاؤں گی ان کے گھر اور اگر باقی لوگوں کی طرح تمہیں بھی تجسس ہو کہ آگے کیا ہونے والا ہے، تو تم بھی چلے آنا اور آگے تو ضرور یہ تو میں جانتی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں مخصوص چمک بھر کر بولیں۔

اور اب وہ ان سے یہ سوال نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں اس کے آنے کا یقین کیوں ہے۔
 ”چلتی ہوں میں کل شام پانچ اور چھ کے درمیان محمود عالم کی طرف ملیں گے اپنا خیال رکھنا اور تیاری بھی تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔“ وہ اس سے خوب پکا عندلیبا چاہ رہی تھیں۔
 وہ خفیف سا سر ہلا کر رہ گیا۔

دوسرے لمحے وہ دیاں سے جا چکی تھیں۔
 ”اب انہوں نے محمود عالم سے کیا کہنا ہے۔“ فوری طور پر دائم کو اس سوال کا جواب نہیں مل سکا اور واقعی جانا تو اسے کل تھا۔ تجسس میں نہ سہی محمود عالم کی عیادت کو بھی۔
 وہ سر جھٹک کر اسامہ کا نمبر ملنے لگا اور اسامہ نے کچھ اور ہی اوٹ پانگ باتیں کر کے فون رکھ دیا۔

”دوبارہ فون کروں۔“ لمحہ بھر بعد اس نے سوچ کر دوبارہ سے نمبر ملایا۔
 ”دائم! میں تمہیں خود تھوڑی دیر میں کال کرنا ہوں، پلیز۔“ دائم کے کچھ بولنے سے پہلے میں اسامہ نے کہہ کر دوبارہ سے رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ کن چٹروں میں ہے اور یہ تانیہ نام بھی سنا سنا لگ رہا ہے۔“ وہ الجھتا ہوا باہر نکل آیا۔
 ”اور اسے میڈیمیا قوت کی چالاکی کہوں یا کہ ان کی قسمت کی خونی کہ انہوں نے مجھے باتوں کا ایسا پتھر دیا کہ میں پھر سے عزمہ کے بارے میں نہیں پوچھ سکا۔ اور محمود عالم کو اتنا یقین کیوں ہے عزمہ گھر میں آئے گی۔“
 اور وہ خود کہاں جائے یہ بات بھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”پاپا کے بغیر گھر گیا تو ماما کے سوال ختم نہیں ہوں گے اور دوبارہ سے ”عالم دولا“ جانا بھی اچھا نہیں لگتا۔“
 ”وہ عالی شان محل عزمہ کی موجودگی کے بغیر کتنا اجاڑ، کتنا ویران سا لگتا ہے۔“ اور وہ پہلی ملاقات یاد کرنے لگا جب عزمہ اس سے اسی گھر میں مل گئی تھی اور اس نے میگزین کے سروق کا حوالہ دیتا چاہا تو پہلی ہی ملاقات میں اس کا غصہ کتنا شدید تھا۔

لیکن اس سے پہلے تو ہم اس روڈ ایکسپریڈنٹ میں بھی مل چکے تھے جب اس کی فضول ڈرائیونگ کی وجہ سے مجھے میرا بیگ مل گیا تھا۔
 پھر ایک ایک کر کے عزمہ کی یادیں تھیں جو قطار باندھے چلی آئیں اور وہ سوچتا چلا گیا۔



”دیکھو مجھے ان دنوں۔ قید کر کے نہیں رکھنا“ مجھے جو مقصد چاہیے تھا وہ حاصل ہو چکا ہے، تم بے شک آٹو لاک باہر سے کھول دو پھر وہ دروازہ باہر سے کسی بھی عام کی سے کھل جائے گا۔ یوں سمجھو مجھے ان کی ضرورت نہیں رہی۔“ انہوں نے خاص گمن مین کو ہدایت دی، دائم سے مل کر آنے کے بعد وہ ڈرائیور کے لیے اپنے آفس آئی تھیں۔

انہیں جانے سے پہلے عائشہ بخاری سے بھی دو وہا تھیں کرنے تھے۔
 عائشہ کی کچھ خاص الخاص چیزیں ان کے پاس موجود تھیں جسے ایک بار اسے دکھا کر انہوں نے آمینہ دکھانا تھا۔

وہ عائشہ کو ایک بار پھر اپنے قدموں میں گر کر گڑ گڑاتے ہوئے معافیاں مانگتے دیکھنا چاہتی تھیں۔
 جانے یہ کیسا مزہ ہے کہ ہزار بار دہرائے گئے اس منظر کو پیروں کی ٹھوکریں مارنے کے باوجود بھی تسکین نہیں ہوتی۔

جب دل سنگناخ ہو جائے، شقاوت کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر ایسے مناظر اس شیطانی فطرت کو اور بھی شہرہ دیتے چلے جاتے ہیں جو ہر انسان میں بدرجہ اتم موجود ہے، کسی میں بہت کم اور کسی میں پوشیدہ اور کسی میں انتہا سے زیادہ، اسی لیے تو شاید چلیز خان کا کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کرنے کے باوجود انسانی لہو سے نہانے کی فحش ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔

کچھ ایسا ہی حال میڈیمیا قوت کا بھی تھا۔
 وہ ظلم سے سستے اختیار ملتے ہی ظلم کرنے کی کچھ بول عادی ہوئیں، جیسے کوئی پیشہ ور فحشچی۔ انہیں اس کمرہ کام میں انسانوں کو جھکانے مگرانے اور ذلیل و خوار کرنے میں لطف آتا تھا۔ کتے ہیں اللہ نے انسان کو اپنے عکس پر پیدا کیا ہے۔ ذرا سا اختیار مل جانے پر خود کو اپنے تخلیق کار جیسا اس کے ایک حصے کے برابر تصور کرنے لگ جاتا، شاید یہ اس عکس کا کمال ہے جو میڈیمیا قوت میں بھی پیدا ہو چکا تھا، بلکہ خود کو منواتے ہوئے ان کی پوری شخصیت پر چھا چکا تھا۔

”ہیم خفیہ کیسوں سے ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں یا مجھے اندر جا کر اور پتھل سینئر کرنے ہوں گے یا میں فلم کی مسکنگ سے اپنا کام کر لوں؟“
 تنزیل اور عزمہ کی فلم اس سارے ٹیم اس اتنے سارے کھیل کا واحد مقصد وہ شو بھی نہیں تھا، صرف ان دونوں کے انتہائی کلوز سینئر اور بس۔۔۔
 ”تم ان کیسوں پر ٹم سے کیا کچھ کر سکتے ہو؟“ ان کے بقول یہ مخصوص شیطانی مسکراہٹ تھی جو ان کی فحش علامت تھی۔

”سب کچھ۔“ ان کا یہ ماہر ترین کیسرو مین اپنے ہنر میں کیسا یکتا تھا اگرچہ انہیں اس سے یہ سوال کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔
 ”اوکے تو پھر تمہیں آن دی سپاٹ جانے کی ضرورت نہیں! انہی پر ٹم سے سب کچھ تیار کرو اور پھر میرے پاس لے کر آنے میں آپ کو کتنا ٹائم لگے گا۔“

”وان ویک میم!“
 ”اوکے مجھے بہت بے چینی سے انتظار رہے گا۔“ انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔
 پھر گھر فون کر کے لائے کے بارے میں پوچھا۔
 ”نہیں وہ تو نہیں آئیں۔“ ملازمہ کے جواب نے انہیں از سر نو فکر مند کر دیا تھا۔ خیر یہ کچھ ایسا مسئلہ نہیں تھا انہوں نے دوبارہ سے اپنے گمن مین کر نمبر ملایا۔

”تم اس لوکے تنزیل کو جو اپارٹمنٹ میں ہے اس کو نہیں جانے دینا، روکے رکھو بس پہنچ رہی ہوں۔“
 تنزیل سے لائے کو حاصل کرنا انہیں بچوں کا کھیل لگ رہا تھا۔
 ”جی میم! میں انھی شیرے کتا ہوں اور اس کی ڈیوٹی ہے۔“ اس نے سعادت مندی سے کہا اور فون بند کر دیا۔
 اور جہاں تک وہ الٹی گھر ہے یہ سن کر انہیں بے حد کوفت محسوس ہوئی تھی۔
 جانے کیا بات تھی جب سے انہوں نے دوبارہ محمود عالم کو دیکھا تھا۔ جہاں تک ہدائی کو دیکھتے ہی جس گھن اور

وہ بے بسی سے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پاس سے گزرتی عکسی کو روکنے لگا۔



”لیکن احسن آپ کو عالی بھائی کو دیکھنے جانا چاہیے۔ وہ ہر میں اماں جان نے گاڑی بھی بھیجی مگر۔ اور پھر سارہ بھی تو ہے اس کی طبیعت۔“ یا سمین کافی دیر سے احسن مراد کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ پہلے تو کوتم بدھ بنے خاموش رہے پھر ایک دم سے گرجنے پر نئے لگے۔

”میں اتنے سالوں سے بیمار ہوں گھر میں پڑا ہوں وہ کتنا مجھے دیکھنے یا پوچھنے آئے جو میں دوڑ دوڑ کر ان کی گاڑی میں بیٹھ کر جاؤں ان کی خیریت دریافت کرنے۔“ وہ آگ بگولا ہو کر بولے۔

احسن مراد کا ظرف ہی کم نہیں تھا ان میں معاف کر دینے کے گنجائش بھی بہت کم تھی۔

”مگر وہ آپ کے ہنوں کی۔“ یا سمین نے رشتے کی نزاکت کا احساس دلانا چاہا۔

”ہنوں کی سے زیادہ وہ ایک دولت مند صاحب ثروت، صاحب حیثیت انسان ہے اور میں ایک بے توقیر

بے ثروت کم حیثیت کا گھٹیا انسان ہوں تو یوں بھی میرا جا کر اس کی خیریت پوچھنا بنتا ہے۔“ وہ جل بھن کر بولے۔

احسن مراد کے دماغ میں حیثیت کا یہ فرق دن بدن کچھ زیادہ ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شاید سارہ کے مستقل

بے اعتبار رویے نے انہیں اس فرق کو زیادہ محسوس کرنے پر مجبور کیا تھا۔

”امیر ہو یا غریب عیادت تو سنت بھی ہے اور انسان کو پسند بھی ہے۔“ اب یا سمین نے اور طریقے سے قائل

کرنے کی کوشش کی۔

”تو کیا وہ ان احکام اور سنتوں کی پیروی سے مبرا ہیں؟ خود انصاف کرو، کبھی یہ مشرعی صاحب میری خیریت

پوچھنے چل کر آئے ہیں؟ جب میں بیمار ہوا اور بے ڈیرہ ماہ ہسپتال میں رہا یہ ایک دن بھی آیا؟“

”احسن پیاری میں بدلا۔“ یا سمین ذرا توقف کے بعد نرمی سے کہنے لگیں۔

ایک دم وہ غصہ میں بھر گئے۔

”دیکھو تم بہت نیک پروین مصورت کی پیاری بھی اور خدا کے احکامات پر عمل کرنے والی بھی۔ تم نے جھولی

بھر بھر نیکیاں کمالیں۔ ٹھیک کیا دولت مندوں کی انا کو خوب گھوڑے پر چڑھایا دنیاوی لحاظ سے بھی بہت کیا مگر ایک

بات تم بھول جاتی ہو۔“

غصے میں ان کا سانس پھول جایا کرتا تھا۔

”جس کام میں تمہارا شوہر تمہارا اجازتی خداراضی نہ ہو وہ خواہ صفا مردہ کے پھیرے ہی کیوں نہ ہوں یا سمین بی بی

قبول ہونے والے نہیں۔“ وہ عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولے تو یا سمین بے بسی انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

”میں تو اس سے بھی کہہ رہی تھی وہ سارہ نے۔“ یا سمین کو سمجھ میں نہیں آیا بات کیسے شروع کی

جائے۔

”اسی نے حکم دیا ہو گا بیگم صاحبہ نے کہ اس بڑھے کو بھی حاضر کیا جائے اس کی اور اس کا شوہر کی بیمار داری

کریں۔“ وہ طنز کے بغیر تو بات کر بھی نہیں سکتے تھے۔

”نہیں سارہ تو بہت خیال کر رہی تھی آپ کا کہ آپ کیسے آئیں گے ہسپتال۔“ یا سمین جلدی سے صفائی

دینے کو بولیں۔

”سارہ اور میرا خیال؟“ وہ ہنکارا بھر کر بولے۔ ”جائے دیا سمین بیگم اب ان سفید بالوں کے ساتھ ایسا

نفرت کا احساس ان کے اندر کروٹ لے کر جاگتا تھا کہ وہ اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

”جب سب کچھ طے ہو گیا ہے ہمارے درمیان جس نے جتنا لینا ہے تو اس کے بعد یہ ادھر کیوں پڑا ہے دفنان

کیوں نہیں ہوتا۔“ غصے میں ان کے جسم کا سارا خون چہرے کی طرف سفر کرنے لگتا تھا۔

”دیکھو اس جنا گئیر ہدائی کو اگر تو وہ ہوش میں ہے تو فوراً گھر سے نکال دو اگر نشتے میں مد ہوش پڑا ہے تو

ملازموں سے کہہ کر اسے ہر کمپس سڑک پر ڈال دو۔“ انڈر اسٹینڈ۔ ”انہوں نے دوبارہ سے گھر فون کر کے کہہ دیا۔

”مجھے اب جا کر اس تنزیل سے لائبہ کا ڈریس لینا چاہیے اور وہ تانیہ۔ اسے میں نے خواجہ خواجہ بلایا۔“ چند

لحے اس کے بارے میں وہ سوچنے لگیں اس کا کیا کریں۔

”پہلے لائبہ کو لے آؤں پھر اس کا کچھ سوچتی ہوں۔“ ایک دو ضروری فون کرنے کے بعد وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر

آفس سے نکل آئیں۔



ان دونوں کے سامنے گن مین کھڑا تھا۔

عزیز نے لاشعوری طور پر تنزیل کی آستین پکڑ لی۔

گن مین نے ان دونوں کو ایک بے نیازی نظر سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

اس بے نیازی نظر نے دونوں کو ایک دم سے بہادر بنا ڈالا دونوں تیزی سے لفٹ میں سوار ہو گئے۔

”ٹھیک ک گاڑا! آئی کانٹ بلو تنزیل! میں زندہ سلامت وہاں سے نکل آئی ہوں۔“ بلڈنگ سے باہر آتے ہی

بے یقین انداز میں عزیز نے سر اٹھا کر کھلے آسمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ وہ بے دھیانی سے بولا۔

”تھیں کیا ہوا ہے؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ روکھے پن سے بولا۔

”جس کام کے لیے اتنا پڑیلے وہ پھر بھی نہیں ہوں۔“ اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی۔

”تانیہ ابھی بھی وہیں ہوگی اور لائبہ نے کیوں خود کو مشکل میں ڈالا، مجھے ایک بار تو اسے روکنا چاہیے تھا۔ اس

نے میری خاطر کیا نہیں کیا۔ اپنی ماں سے ٹکری اور اب وہ جانے اس کا کیا حشر کرے! کاش وہ اس عورت کی بیٹی نہ

ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔“

وہ کسی اور ہی دھیان میں سوچے جا رہا تھا۔

”اگر وہ اس عورت کی بیٹی نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟“ کوئی معنی خیز انداز میں اس سے بولا۔

”کچھ بھی۔۔۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔“ اس نے افسردگی سے سوچا۔

”تنزیل! تم کہاں ہو؟“ عزیز کسی بچی کی طرح اس کے تحفظ کے سائے میں اس کے روکھے رویے سے کچھ بد دل

ہو کر اس کا بازو ہلا کر بولی۔

”تمہارے ساتھ تو ہوں۔“ وہ گہرا سانس کے کر بولا۔

”میرے ساتھ ہی رہنا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ہچکانہ پن سے بولی۔

”اور یہ سب حرکتیں کر کے سب کو پریشان کرتے نہیں ڈر لگتا تمہیں؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”اب تم مجھے سے لڑو گے۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

بے دھڑک جھوٹ تو نہ بولو۔

بہر حال احسن مراد کو کسی بھی بات پر قائل کرنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا کم از کم یا سمین کے لیے۔
”سارہ نے ایک تجویز پیش کی ہے۔“ احسن کی طنزیہ گفتگو سے بے زار ہو کر یا سمین نے دو ٹوک بات کرنے کا ارادہ کیا۔

”ظاہر ہے اس کی تجویز بھی تو حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم جیسے دو نکلے کے لوگوں کے لیے“ وہ ایک بھی نشانہ خطا نہ جانے دے رہے تھے۔

”وہ عزم کے گھر آنے پر۔“ یا سمین ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے بات مکمل کرنے کو بولیں۔

”وہ تو عمر بلی کی کہیں سیر پائے گئی ہوئی ہیں اور یہ ہوائی تو کسی دشمن نے اڑائی ہو گی کہ محمود عالم کی بیٹی شوہر کی چکا چوند کا حصہ بننے کو گھر سے بھاگ گئی۔“

”ف!“ یا سمین کا جی چاہا اپنا سراسنہ دیوار پر دے مارا۔
”احسن پلیر میمری بات تو سن لیں۔“ میں ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔ وہ عاجزی کی انتہا پر تھیں۔

”میں بھی بات باتی ہے تمہاری؟“
”عزم کے گھر واپس آنے پر سارہ عزم اور تنزیل کا رشتہ کرنا۔“

”کیا؟“ وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ یا سمین کا دل تو دل سارے گھر کے درو دیوار بھی دہل کر رہ گئے۔
”تمہاگل تو نہیں ہو گئیں؟“ وہ خوف ناک دھاڑ کے بعد گرجے۔

اور یا سمین کو واقعی وہاگل ہو چکی ہیں جو اس شخص کے ساتھ مغز ماری کر رہی ہیں۔
”اس میں یا گل پن کی کیا بات ہے؟“ وہ دھیرے سے معترض ہو گئیں۔

”ہاں تم تو فوراً“ مٹھالی بانٹنے پر اتر آئی ہو گی۔ لوہی کے بھاگوں چھینکاؤنا“ عزم بی بی گھر سے بھاگتیں نہ تمہارے کٹھن“ ناکارہ بیٹے کے بھاگ جاتے۔

”ف کس قدر منہ پھٹ اور بے دید شخص ہیں احسن مراد۔“ یا سمین واقعتاً اپنا سر پکڑ کر رہ گئیں۔
”پہلی بات تمہارا ایمنا لاکھ کٹھن“ ناکارہ، بد حرام سہی، تھوڑی بہت غیرت تو یقیناً“ اس میں بھی ہو گی ہاں اگر واقعی بے غیرت ہو اتو ایسی چھٹی ہوئی لڑکی سے رشتہ جوڑنے میں واقعی خرم محسوس کرے گا۔“

وہ تو ایک دم سے خود کو اس سارے قصے سے الگ کر کے بیٹھ گئے تھے۔
”تمہارا ایمنا۔“ بہت سال سے سن رہی تھیں مگر یہ دو لفظی طعنہ اس بری طرح سے انہیں پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

”تو میں سارہ کو جواب دے دوں۔“ وہ آنکھوں میں اترتی نمی کو چھپا کر بولیں۔
”وہ تو تم نہیں دے سکو گی، لکھو الو مجھ سے۔“ وہ چلیخ کرنے والے انداز میں بولے۔ ”یہی ہوتیں تم تو اس وقت اس کے منہ پر انکار کر کے آتیں مگر تم میں ایسی جرات ہی نہیں، اب نہ آئندہ کبھی ہو گی۔“

وہ طعنہ باز عورتوں کی طرح بولے۔
”آپ کی ہمن ہے وہ۔“ یا سمین نے گویا پھر سے یاد دہانی کروائی تھی۔

”تھی۔“ انہوں نے فوراً ”تھیج کی۔“ اس محمود عالم خطی کی دوست کی ہوس میں سارہ نہ کسی کی ہمن رہ سکی نہ

بی بی۔ اماں جان کے ساتھ اس کا سلوک اتنے سالوں میں کیا کسی سے ڈھکا چھپا ہے۔
”کھوڑے انسان میں سچائی بھی بہت ہوتی ہے۔“ یا سمین نے دل میں اعتراف کیا۔

”میں کیا کہوں سارہ کو؟“ یا سمین زرد اور بعد پھر بولیں۔
”مجھ سے پوچھتی ہو تو صاف جواب ہاں تم اگر لالچ میں آچکی ہو اپنے اکلوتے بیٹے کے جس پر تمہیں ہاں بہت تھا۔ ہاتھوں سے گونا گونا چاہتی ہو تو بعد شوق ہائی بھر لو کہ پھر وہ ادھر کا رخ کرے والا نہیں۔ سارہ تم سے رشتہ نہیں جوڑنا چاہ رہی، تمہارے بیٹے کے دام لگانا چاہ رہی ہے۔ ورنہ رشتہ تو اس کا پہلے بھی تم سے تھا، کتنا بھایا اس نے؟“

وہ جیسے ہاتھ میں آئینہ لے کر بیٹھ گئے۔
اور پہلی بار یا سمین احسن کی دلیلوں کے آگے لا جواب سی ہو کر رہ گئیں، ورنہ تو ہمیشہ وہ ان کے غصے کو بے وجہ اور ان کی جھگڑا الو طبیعت کا شاخسانہ سمجھتی تھیں۔

”تو پھر جوڑی رشتہ سارہ بیگم سے؟“ وہ ان کا چہرہ بڑھ رہے تھے۔
”اماں جان سے بھی سارہ شاید بات کر چکی ہیں۔“ یا سمین نے احساس دلایا۔

”بات تمہارے بیٹے کی ہو رہی ہے اماں جان کے نہیں۔“ وہ پھر سے جتا کر بولے۔ یا سمین کو غصہ سا آگیا۔
”آپ کا بھی تو ہے۔ مسلسل تمہارا تمہارا کیے جا رہے ہیں۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”اس کے مفادات تم مجھ سے بہتر جو سمجھتی ہو۔“ وہ مبہم انداز میں بولے۔
”پھر ابھی تو صاف انکار کرنا بھی مناسب نہیں۔“ اور وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔

”پاکل ہو تم یا سمین بیگم! پاکل ہی۔“ وہ پہلی بار نرمی اور اپنائیت سے بولے، وہ ہونق پن سے ان کی شکل دیکھنے لگیں۔
”حق تو کی موجود نہیں۔ گھر آتی ہے یا نہیں پہلے یہ مسئلہ تو حل ہو جائے۔ اس کے بعد اس رشتے کا سوال اٹھے گا اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں، چاہو تو لکھ کر رکھ لو یہ جو محمود عالم ہے نا، یہ کبھی بھی نہیں چاہے گا کہ یہ رشتہ ہو، پھر اس کی بیٹی چاہے گناہ کی دلدل سے نہادھو کر بھی نکل آئے تو بھی نہیں۔ اور بہتر ہے تم یہ خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“

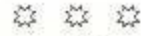
اور یا سمین کتنی دیر کچھ بول ہی نہ سکیں۔
ان چند گفتگوں میں واقعی ان کے دل نے دھیروں دھیر خواب دیکھ لیے تھے۔ تنزیل کے روشن مستقبل کے حوالے سے۔

عزم جیسی بھی سہی، کم از کم تنزیل کے حق میں یارس ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں تنزیل کا مستقبل سیٹ ہونے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، پھر جس طرح کی وہ پر اسرار سرگرمیوں میں آج کل گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ انہوں نے تو ان چند گفتگوں میں سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی سارہ کے گی، وہ فوراً نکاح کر کے دونوں کو باہر بھجوا دیں گی۔ ایک بل کی بھی دیر نہیں لگائیں گی مگر خواب۔

غریبوں کے خواب بھی ان کی طرح غریب ہوتے ہیں، سر ڈھکو تو پاؤں ننگے پاؤں ڈھانچو سر ننگا۔
وہ احسن مراد سے مزید کچھ بھی کہے بغیر ایک سرد سی آہ بھر کر خاموشی سے باہر آئیں۔

”اور یہ بات تو احسن کی بھی غلط نہیں۔ سارہ صرف اپنے مطلب کے لیے ٹھٹھی ہوئی ہے اور محمود بھائی کبھی نہیں مانیں گے۔ دونوں کے درمیان ایک نئی اور شدید جنگ چھڑ جائے گی اور شاید اس کی لپیٹ میں تنزیل اور ہماری پوری فیملی بھی آجائے، نہیں اس کا آسان حل خاموشی ہے، جب تک سارہ اور محمود دونوں خود سے یہ رشتہ نہ نکلیں۔“ انہوں نے ————— پاکل فیصلہ کر لیا۔

”یہ ربیعہ اور سیدہ کہاں ہیں ذرا جوا نہیں ہوش ہو کہ رات کے کھانے کا کچھ ہوا یا نہیں۔“ وہ کڑھتی ہوئی اٹھ کر کچن میں جانے لگیں تب ہی بیرونی دروازے کی بیل پورے زور سے بج اٹھی۔
 ”یہ تیزبل ہو گا اور آج یہ مجھ سے نہیں بچے گا“ اس نے کیا طریقہ اپنا رکھا ہے دن بھر رات بھر غائب رہتا۔ آج یہ احسن سے نہیں مجھ سے ٹھک ٹھاک نئے گا۔“ وہ غصہ میں بھری دروازے تک آئیں۔
 اس دوران میں دوسری بار گھنٹی بج چکی تھی۔
 ”یہ طریقہ مجھ سے گھنٹی بجانے کا“ دونوں گھر سے غائب رہنے کے بعد ایسی ہڈھٹائی کے ساتھ۔“ زور سے کہتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھول دیا اور دھک سے رہ گئیں۔
 ان کے سامنے تانہ کھڑی تھی۔



”کیا بات ہے“ کیا تکلیف ہے؟“ کسی نے شاید نشے کی حالت میں جمانگیر ہمدانی کو سخت ہاتھوں سے باقاعدہ اٹھا کر کھڑا کیا تھا۔

وہ غصے میں بمشکل آنکھیں کھول کر غرایا۔
 ”چلو نکلو ہر شاہباش۔“ یا قوت کا خاص گمن میں چنگی بجا کر اسے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ اپنا بازو چھڑا کر زور سے اسے سینے پہ مکا مار کر دھکیلتے ہوئے غصے میں بولا۔
 ”مطلب ہا ہر۔ گھر سے باہر۔“ وہ پھر اسے باہر کی طرف دھکیل کر بولا۔
 ”دباغ خراب ہے تمہارا، جانتے ہو کس سے؟“ اس کے لیے میں بات کر رہے ہو؟“ وہ غرا کر بولا۔
 ”جانتا ہوں میں، مگر صرف ایک بات، وہ ہے مالکوں کا حکم۔ ہم اپنے مالکوں کے گھر کے باہر بیٹھے کتے ہیں، صرف ان کے حکم پر دم ہلا کر حکم پورا کرتے ہیں، چلو شاہباش، باہر کا رستہ پکڑو۔“
 وہ پھر اسے اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

”تمہیں یہ سب یا قوت نے کہا ہے؟“ جمانگیر کا تمام تر نشہ ہرن ہو چکا تھا۔
 مالک کون ہے؟ اور وہ کس کی بات کر رہا ہے اسے سمجھ میں آنا جا رہا تھا۔
 ”ظاہر ہے مجھے کوئی خواب میں تو بشارت نہیں ہوئی کہ گھر کو گند سے پاک کیا جائے۔“ وہ کرمہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ اور جمانگیر ہمدانی کا خون کھول اٹھا۔
 جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور میڈم یا قوت کا نمبر ملائے لگا۔ دوسری طرف سے جمانگیر کا نمبر دیکھ کر فون کاٹ دیا گیا۔

دوسری بار تیسری بار اور پھر چوتھی بار!
 ”بس کرو اب اس سے زیادہ اور کیا جوتے کھا کر نکلو گے۔ میڈم جی فون کاٹ رہی ہیں تو کیا مطلب ہے۔ وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہ رہی، چل شاہباش۔“
 ”میں اس سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“ جمانگیر ہمدانی کا بس نہیں چل رہا تھا، اس ملازم کے ٹکڑے کر ڈالے۔

”ٹھیک ہے، گھٹ کے باہر بیٹھ کر شوق سے انتظار کرو، جب وہ آئیں تو بات کر لینا، ابھی تو ہمیں حکم کی تعمیل کرنی ہے۔“ وہ ایک سی بات پر ہنسنے لگا۔

”میری گاڑی کی چابیاں اندر سے منگواؤ۔“ وہ ذرا سوچ کر بولا۔

”تمہاری گاڑی؟“ وہ اچھٹے سے بولا۔

پھر اس نے اس کھڑی ملازمہ کو چابیاں ملانے کا اشارہ کیا۔

”میڈم جی کا حکم تھا، اگر یہ گاڑی لے کر جاتا ہے تو جانے دینا۔ بعد میں منگوا لوں گی، مگر میرے آنے پر اسے گھر میں موجود نہیں ہونا چاہیے۔“ چابیاں دیتے ہوئے اس نے بڑا احسان جتا کر کہا۔

جمانگیر ہمدانی چابیاں لیتے چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ وہ پھر سے بازو پکڑ کر اسے باہر کرنے لگا۔

جمانگیر نے جھٹکے سے بازو چھڑایا اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔

نشے سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، مگر اس وقت اس کے پورے وجود میں شدید غصہ اور نفرت چنگاریاں اڑا رہے تھے۔

”تم بہت پیچھا تو لگی یا قوت! اپنے اس سلوک پر مجھ سے معافیاں مانگو گی، مگر تم جانتی ہو جمانگیر ہمدانی کسی پر ترس تو کھا سکتا ہے، مگر اپنی انسلٹ کرنے والے کو معاف نہیں کر سکتا۔“

وہ شدید غصے میں گاڑی اڑاتا چلا جا رہا تھا۔

”اور تم یہ نہ سمجھنا، یہ صرف میری گیدڑ دھکی ہے، مجھے اب کیا کرنا ہے تمہاری دم کے کس تازک حصے پر پاؤں رکھنا ہے، سب مجھے پتا ہے، بس اب تم انتظار کرو، اپنی موت کی دعا مانگنے کا۔“

اس نے SMS سینڈ کر کے موبائل ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔

اس کی گاڑی اڑی جا رہی تھی۔



”دیکھو واٹم! حد ہوتی ہے کسی بات کی؟“ وہ ابھی کمرے میں پہنچ کر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ رخشندہ غصے میں بولتی ہوئی آگئیں۔

”کیا ہو گیا ام؟“ وہ حیرانی سے بولا۔

”تمہارے پیانے اور تم نے جو روٹین شروع کر رکھی ہے، میں کیا ہوں تم دونوں کی نظر میں فالتو، بے کار۔“ وہ غصے میں تپ رہی تھیں۔

”ہام! کیا ہو گیا ہے، اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے آپ کو؟“ وہ انہیں بازو سے پکڑ کر اسے پاس بٹھا کر بولا۔

”نہ آتے ابھی بھی تم کب آئے تھے گھر آخری بار ہیں۔“ وہ تشریح کر بولیں تو وہ مسکراتے لگا۔

”نیکو اس کر رہی ہوں میں۔“ اس کی مسکراہٹ بڑھ اور بھی تپ گئیں۔

”آپ غصے میں کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ مجھے پہلے پتا نہیں تھا۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بولا۔

”تم توور نہ ہر وقت مجھے ستایا ہی کرتے جیسے آج کل ستا رہے ہو۔“

”چلیں ہام! برداشت کر لیں، پھر شاید آپ کو کوئی ستانے والا ہی نہ رہے۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”واٹم! ایسی باتیں کر رہے ہو؟“ وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

”تو اور کیا کہوں؟“ وہ مایوسی سے بولا۔

”کیا ہو گیا ہے، کچھ بتاؤ مجھے۔“ وہ بے چین ہو کر بولیں۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

”واٹم! اپنی پراہم؟“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

”آپ نے ایک وعدہ کیا تھا نا مجھ سے، خود سے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ رخشندہ ابھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگیں۔

”کون سا وعدہ؟“ یاد نہ آنے پر بولیں۔

”مٹی جلدی بھول گئیں آپ؟“ وہ تاسف سے بولا۔

”واہم! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور پریشان نہیں کرو۔“ وہ جھنجھلا کر بولیں۔

”آپ نے میڈم یا قوت کے بیٹے کو ڈھونڈنا تھا۔“ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”اور آپ بھول گئیں بھول گئیں کہ اگر آپ اسے نہیں ڈھونڈ سکیں تو پھر آپ کو مجھے کھونا ہو گا۔“

”واہم!“ وہ تڑپ کر رہ گئیں۔

”میں نے وعدہ کیا ہے نا“ وہ جلدی سے بولیں۔

”نام! اس وعدے کی لمٹ اس پتے ختم ہو جائے گی، مگر شاید آپ کو یاد نہیں، مگر مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، اگر ہم اس

عورت کے بیٹے کو نہ ڈھونڈ سکے تو پھر مجھے اس کے ساتھ جانا ہو گا۔ آپ سے پہلے بھی میں نے کہا تھا کہ میں مرکز بھی

اپنا وعدہ نبھانے لگا۔“ وہ زور دے کر بولا۔

رخشندہ ڈیٹائی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

”تم سے یا قوت نے کچھ کہا؟“

”یہ کہ میں صرف یاد دہانی کرواؤں۔ وہ دو چار دنوں میں مجھے لے کر یہاں سے چلی جائیں گی اور میں۔ میں انکار

نہیں کروں گا۔ آپ کی غلطی کا کفارہ ہر حال مجھے تو ادا کرنا ہی ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

رخشندہ اسی طرح بیٹھی رہ گئیں اور کچھ دنوں سے تو وہ واقعی سب کچھ بھول چکی تھیں۔

”نہیں واہم! میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ زور سے سر جھٹک کر بولیں۔

”محمود اب ٹھیک ہوتا تم؟“ مصطفیٰ اس کا ہاتھ دبا کر نرمی سے بولے۔ انہوں نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر

ہلایا۔ پھر گھڑی دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی، پھر خاموش ہو گئے۔

”گھر جانا چاہتے ہو؟“ محمود کمزور آواز میں بولے تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ، پہلے ہی میں نے تمہیں بہت پریشان کیا؟“ وہ ذرا سا مسکرا کر آہستگی سے بولے۔

”یہی باتیں نہیں کرو یا را!“

”میرا خیال ہے محمود ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اب آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔“ اندر آکر سارہ جتا کر بولی۔

محمود عالم نے سارہ کو کھانچا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”بالکل بھلا بھی! میں بس نکل ہی رہا تھا۔ نرس موجود ہے محمود کو دیکھنے کے لیے اور آپ بھی ہیں۔“ وہ جلدی

سے کھڑے ہو کر محمود کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر تیزی سے باہر نکل گئے۔

”تم میری جان نہیں چھوڑ سکتیں، اگر کچھ دن اور زندگی مل گئی ہے تو مجھے سکون سے جی لینے دو۔“ وہ تنہی سے

منہ پھیر کر بولے۔

”ہاں ساری دنیا میں ایک میں ہی تو ہوں آپ کی بے سکونی کی وجہ، ورنہ تو ہر شخص سے آپ کو سکون اور خوشی

ملتی ہے۔“ سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی درشت لہجے میں بول گئیں۔

”اور اس ساری دنیا میں ایک بس تم نہ ہوتیں تو شاید یہ دنیا جیسے جانے کے قابل ہوتی، یا اس کا ساتھ ہوتا۔“

بے اختیار ان کی آنکھوں کے سامنے یا قوت کا چہرہ آگیا، انہوں نے آنکھیں بند کر لیں، آنسو پکڑوں پہ چپکنے لگے۔

”بس تم اب جاؤ۔“ وہ گیٹ کے سامنے آکر رکے ہی تھے کہ عزنہ نے پیچھے مڑ کر ساتھ آگے تنزل سے رکھائی

سے کہا۔

وہ لمحہ بھر کر یونی کھڑا رہ گیا۔

”میں آتا ہوں نا تمہارے ساتھ۔“ وہ ذرا دیر بعد بولا۔

”نہیں۔“ وہ سختی سے بولے۔

”میں جانتی ہوں تمہیں میرا اس طرح کہنا برا لگا ہے، مگر تنزل! اندر جا کر میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے یہ میں

بھی نہیں جانتے اور اس کے بعد۔“ وہ رگ گئی۔ ”صبح کا اجالا میرے لیے کیا پیغام لے کر آتا ہے، موت کا یا زندگی

کا۔ مجھے سب کچھ اکیلے فیس کرنے دو، یہاں سے جانے کا فیصلہ بھی میرا اپنا تھا، سو اس کے نتائج مجھے بھگتنے ہیں،

پلیز۔ تم جاؤ۔“ تنزل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”میں ایک بار تمہارے ساتھ۔“ اوکے میں چلتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے رگ گیا۔ اور ہاتھ ہلا کر پیدل ہی

اندھیری سڑک میں کچھ دیر بعد گم ہو گیا۔

ہلکی سی دستک پر ہی گیٹ واہو گیا تھا۔

گاڑے نے اس کی شکل دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا تھا، صرف رستہ دیا تھا۔

وہ ٹھہر ٹھہر کر قدم رکھتی گھر کے اندر وہی حصے کے دروازے پر آ گئی۔

”اگر پاپا نے مجھے ملے جانے کو کہہ دیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ یہاں سے جا رہی تھی اس وقت نہیں سوچا تھا کہ

اگر میڈم یا قوت نے مجھے دھکا کر دیا تو کہاں جاؤں گی، مجھے یقین تھا کہ میں یا آسانی یہاں واپس آ جاؤں گی۔ مگر کیا

واپس آنا اتنا آسان ہوتا ہے۔“

اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی دھند چھانے لگی۔

”اور اب تو میڈم یا قوت کا اصل چہرہ بھی میں دیکھ چکی ہوں، ان کا پیار ان کی محبت، لگاؤ سب فریب تھا۔

ایک جال، ایک پھندہ اور میں اس میں پھنسی چلی گئی۔ کاش! میں نے ذرا سی دیر کے لیے کسی اور کے لیے نہیں

صرف اپنے بارے میں سوچا ہوتا۔“

وہ ادھ کھلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے رستے کے بچ کھڑی تھی۔ لاؤنج میں اندھیرا تھا۔

گھر کی مین لائیں بجھ چکی تھیں۔

”پہلے تو رات کے اس پیر یہاں روشنیاں رہا کرتی تھیں، کوئی جاگ رہا ہوتا یا نہیں، گھر کی لائیں آدھی رات

کے بعد تک روشن رہا کرتی تھیں اور آج۔ شاید میں اس گھر کی روشنی بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔“

وہ آہستگی سے اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

پھر ایک ایک کر کے اس نے سب کمرے دیکھ ڈالے۔

سارے کمرے میں زیر و بالا پر لمب جل رہا تھا۔ سارہ دیوار کی طرف کروٹ لیے شاید سوچتی تھیں۔

وہ کافی دیر وہاں مبہوت سی کھڑی رہی۔

”نہیں، پہلے مجھے پاپا کا فیصلہ معلوم کرنا ہو گا۔ شاید پاپا میرے حق میں فیصلہ دے دیں، لیکن اگر پاپا نے مجھے قبول

نہیں کیا تو۔ پھر ما بھی کچھ نہیں کر سکیں گی۔ اور پاپا۔ انہوں نے سالوں پہلے اس لڑکی نیلم کے جرم کو معاف

نہیں کیا تھا تو میں۔۔۔

ہست سے دوسرے تھے اور ہست سے خوف اور خدشے قدم قدم پر اس کے پیر جکڑ رہے تھے۔ وہ ہست روی سے چلتی ساتھ والے کمرے کا ادھ کھلا دروازہ ذرا سادہ کھیل کر اندر داخل ہو گئی۔ اندر کا منظر اس کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔

محمود عالم بیڈ پر سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے، لمبی روشنی میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ ان کے بیڈ کے ایک طرف لگاؤ پر اسٹینڈ اور بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر لگاواؤں کا ڈھیر مرت کچھ کہہ رہا تھا۔ ”کیا پایا بیار ہیں؟ کیا پایا اسپتال میں رہ کر آئے ہیں۔ میری وجہ سے؟“ اتنی دیر سے رُکے اس کے آنسو روانی سے بہنے لگے۔

وہ بے چارہ قدموں سے چلتی ان کے بیڈ کے پائنٹی کی طرف آگئی۔

”اگر مجھے دیکھ کر پایا کو شاک لگا اور یہ شاک ان کے لیے اچھا نہ ہوا تو۔۔۔“ وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں اٹھانے لگی تھی کہ خیال آیا۔

وہ بے بس آنسو بھری نظروں سے بیڈ پر لیٹے اس نحیف شخص کو دیکھتی رہ گئی جو چند دن پہلے ایک غرور کے عالم میں زمین کو کس زعم سے دبا کر چلا تھا۔

اس کی قابل رشک صحت اور کوفہ کے سامنے کوئی دوسری مثال نہیں تھی اور اب۔۔۔ اب وہ بے بسی کی تصویر لگ رہا تھا۔

وہ بے دم سی ہو کر ان کے بازو کے پاس بیٹھ گئی۔ آہستگی سے انگلیاں ان کے ہاتھ کو مس کرنے لگیں۔

محمود عالم کے ہاتھوں سے کرنٹ کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔

”کک۔ کک۔ کک۔ کون۔ کون ہے؟“ وہ بے اختیار اٹھے۔

وہ جلدی سے پیچھے ہوئی۔

”سارہ سارہ اعزہ آئی ہے، دیکھنا۔ ادھر بیس پاس کمرے میں۔“ وہ ذرا سا سر اٹھا کر بے چین نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔

اور یک دم ان کی نظر اپنے بائیں پیلو پر ٹھک کر رہ گئی۔ وہ ان کے اتنے قریب تو بیٹھی تھی۔

”عزہ! ان کے لب کپکپائے۔“

”پاپا۔ پاپا۔! مجھے معاف کروں پاپا!“ اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ بے اختیار ان کے بازو پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

محمود عالم بے بس نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

”تم۔۔۔ تم سب آلو کے بیٹھے ہو۔“ مارے طیش کے ان کا دل غصے سے لگا تھا۔

”میم! میں نے تو اوپر جا کر شیر کو بتا دیا تھا۔“ نیچے والا گارڈ جلدی سے صفائی دینے لگا۔

”اس وقت تک وہ دونوں میرے قریب سے گزر کر جا چکے تھے۔ پہلے تم نے ہی کہا تھا کہ میم کا حکم ہے، نہیں جانے دو۔“ شیر تیزی سے بولا۔

”ہاں تو میں نے خود سے تھوڑی کہا تھا وہ تو۔۔۔“

”بند کرو اپنی بکواس اور دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ وہ طیش میں چلاؤں، تو دونوں ایک دم خاموش ہو کر

آہستگی سے وہاں سے چلے گئے۔

”اب لائبرے کا کیا کروں؟“

وہ پریشانی سے کھڑی سوچتی رہ گئیں۔

کچھ سوچ کر پھر لائبرے کا نمبر ملانے لگیں۔

اور ان کے لیے یہ لہجہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ لائبرے نے ان کی کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہام! میں بالکل ٹھیک ہوں اور ادھر اپنی ایک دوست کی طرف ہوں، صبح آجاؤں گی۔ پلیز مجھے دوبارہ ڈسٹرب مت کیجیے گا۔“ رکھائی سے کہہ کر اس نے میڈیم پائوت کی بات سے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

”دوست! اس کی یہاں ایسی کون سی دوست؟“ وہ پریشانی سے سوچنے لگیں۔ ”یہ سب اس تنزیل کی پرکھائی پٹی ہوگی۔“ وہ ادانت پس کر رہ گئیں۔

”صرف آج کی رات تنزیل کل اگر لائبرے مجھے ملی تو تمہارا گھر تمہارا وہ ننگلا بے حس باب تمہاری ماں اور بہنیں سب کی سب راکھ کا ڈھیر بن جائیں گی۔ صرف آج کی رات مزے کر لو۔“

وہ غصہ میں دل میں پختہ ارادہ کر کے باہر نکل آئیں۔

جما ٹیکر کے مسلسل آنے فون انہوں نے ڈس کنیکٹ کیے تھے اور اب آنے والا میسج انہیں بتا گیا۔

”تو تم مجھ سے انتقام لو گے بڑھے شرابی! پولیس کی ایک لٹ نہیں سہہ سکو گے۔ پلو م بھی آج کی رات عیش کرو، کل تمہیں بھی فارغ کر دوں گی، جانے سے پہلے تمہارا بندہ دست تو کرنا پڑے گا۔“

ان کی گاڑی اب گھر کی طرف جارہی تھی، جہاں انہیں تانیہ کے ذریعے تنزیل سے لائبرے کا ایڈریس لیتا تھا، ورنہ۔۔۔ تانیہ تو تھی نا!

دونوں بچہ کے بٹ کی طرح سناکت بیٹھی تھیں۔

تانیہ نے دونوں ہاتھ ان کے آگے جوڑ رکھے تھے۔

”مجھے معاف کروں امی! اگر اس میں میرا کچھ قصور نہیں تھا، آپ جانتی ہیں اچھی طرح سے تنزیل کے لیے، اس کی خاطر۔۔۔“

تزاخ سے یاسمین کا ہاتھ اٹھا اور تانیہ کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

”کیا سمجھا تھا تم نے اس عیش پرستی کو، آڑہا کر تم ہم سب کو بے وقوف بنا لو گی۔ اور تنزیل کا نام مت لو۔“ وہ نفرت سے اسے دیکھ کر بولیں۔

تانیہ گال پر ہاتھ رکھے ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔

”تم کہاں تھیں، کہاں رہیں اتنے مہینے کیا کرتی رہیں؟ کچھ حساب ہے تمہارے پاس؟“ تانیہ گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔

یہ حساب کتاب تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اسے تو صرف ماں، باپ اور گھر والوں سے ملنے کی پیاس تھی، وہ اتنا عرصہ کہاں رہی، کیا کرتی رہی، وہ کیسے بنا سکتی تھی۔

”ہے جواب تمہارے پاس؟“ یاسمین نے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔

اور ایسا کام بھی تو اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

”اگر جواب نہیں تھا تو یہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ اسے خاموش بیٹھے دیکھ کر حقارت سے بولیں۔
 ”می! مجھے معاف کر دیں۔ میں۔۔۔“
 ”میں تمہیں معاف بھی کر دوں تو کیا یہ دنیا ہمیں معاف کر دے گی؟ کیا سمجھا تھا تم نے۔“
 ”می! میں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔
 ”تو پھر کیا کرتی رہیں اتنا عرصہ اس کے پاس؟“ وہ جملہ پورا نہیں کر سکیں۔
 ”می۔۔۔“

”بس تانیہ! اور کچھ مت کہو۔ ہماری برداشت اور ہماری عزت کا اور امتحان مت لو۔“
 ”اب تم ہی نہیں صرف۔۔۔ ربیعہ اور سنیحہ کی زندگیوں کا بھی سوال ہے، تمہیں یہاں آنے سے پہلے یہ بات سوچ لینی چاہیے تھی۔“
 وہ بہت تپ تول کر بول رہی تھیں۔
 اور جب سارہ نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر تانیہ گھر آجائے تو وہ کیا کریں گی تو یاسمین کا دل لمحہ بھر کو موم ہوا تھا کہ وہ تانیہ کو سینے سے لگا لیں گی، ساری دنیا سے چھپا لیں گی۔
 سینے سے لگانا اور دنیا سے چھپانا آسان تو نہ تھا۔ یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔
 ”می! میں مجبور تھی۔ ان لوگوں نے میری واپسی سے تمام رستے بند کر دیے تھے، میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔“ ان کی بات ماننے کے سوا۔۔۔ وہ نظریں جھکا کے انک انک کر بولی۔

یاسمین پھر نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔
 ”می! میں نے بہت کوشش کی۔ میں کسی طرح ان کے جال سے نکل آؤں۔“
 ”اور تم نے یہاں اگر ہمیں نئی مصیبتوں کے جال میں پھنسا دیا، یہ سوچا تم نے؟“ وہ بے دید لہجے میں بولیں۔
 ”میں کہاں جاؤں می؟“
 ”تمہارے خیال میں وہ لوگ تمہیں یہاں رہنے دیں گے۔ وہ تمہارا پیچھا کرتے یہاں تک نہیں آئیں گے اور جب یہاں تک آئیں گے تو۔۔۔“ وہ جیسے دہل سی گئیں اس سے آگے سوچ کر ہی۔

”می! مجھے کچھ دن رکھ لیں۔ چھپا لیں اپنے پاس، می! میرا پورا وجود زخم زخم ہے۔ ای! کچھ دنوں کے لیے پلینز میں خود خود چلی جاؤں گی۔ اچھا صرف آج کی رات، می! میں کہاں جاؤں، می! میں تھک چکی ہوں، میں بالکل اکیلی ہوں، تمہارا ہر کالی سیاہ رات، می! یہ اندھیرے بولتے ہیں، مجھے۔ اتنے مہینوں سے مجھے دس دس کر انہوں نے نیل ونیل کر دیا ہے، می! آپ تو میری ماں ہیں، مجھے چھپا لیں، می! مجھے مارویں، قسم سے ای! مجھے مارویں، زہر۔۔۔ کچھ بھی دے دیں، وہ ایک دم سے جو اس باختہ سی ہو گئی تھی۔
 اور یاسمین کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

”اب کچھ بھی ہو یہ دنیا کچھ بھی کہے، میں تانیہ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، وہ لوگ آئے بھی تو کیا کر لیں گے؟ میں۔۔۔ پولیس کو بلاؤں گی۔ جب یہ اس خبیث سے طلاق بھی لے چکی ہے تو۔۔۔ لمحے بھر میں انہوں نے بہت آگے تک کے فیصلے کر لیے۔

”می! ای! مجھے رکھ لیں گی نا، بس آج کی رات، صرف آج کی رات، کل صبح میں خود ہی کہیں بھی چلی جاؤں گی، پلینز۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔
 بے اختیار ان کا ہاتھ اس کے سر پر ٹک گیا۔
 ”می! وہ بے قرار ہو کر ان کی بانہوں میں پھل گئی۔

”یاسمین! اس سے کہو، ابھی اور اسی وقت یہ یہاں سے چلی جائے، جس طرح سیاہ اندھیری رات میں آئی ہے، اسی طرح اس اندھیرے میں یہاں سے چلی جائے۔ اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، رات بھر کے لیے نہ لحد بھر کے کیے، احسن مراد دروازے میں کھڑے سفاک لہجے میں کہہ رہے تھے، وہ ششدر سی باپ کو دیکھتی رہ گئی۔



وہ جوں جوں ڈائری بڑھتی جا رہی تھی اس کی آنکھیں حیرت، خوف اور الجھن سے پھیلتی جا رہی تھیں۔
 ”رک رک کہ وہ نیکم اور یا قوت کے درمیان موجود رشتے کو سوچتی اور ان میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔
 ”تو یہ ماں تھیں، اور میرا باپ محمود عالم، اگر ماں نے دوسری شادی نہیں کی، جو کہ یقیناً نہیں کی۔ اور ماں نے مجھ سے سب چھپائے رکھا اور اب یہ ڈائری جو کہہ رہی ہے اور یہ وہی ڈائری ہے جو انہوں نے مجھ سے چھپنی تھی؟ تو انہوں نے خود یہ کہانی اس میں لکھی کہ میں بڑھ لوں۔“ وہ سوچتی جا رہی تھی۔
 ”اور وہ خود غرض، ظالم شخص میرا باپ تھا، جسے شاید میرے وجود کی خبر بھی نہیں اور وہ بچہ جو ماں کے پلو سے چرایا گیا، ان کی ہمدرد کا اتنا گھٹاؤنا کردار کیا کوئی ڈاکٹر ایسا بھی کر سکتی ہے؟“ لحد لحد حیرت اس پر اتر رہی تھی، رات بچھتی جا رہی تھی۔

اس نے پوری ڈائری بڑھ ڈالی۔
 ”اس سب کا مطلب کیا ہے کہ ماں کا اس سارے گورکھ دھندے میں کوئی قصور نہیں۔ ماں بس یہ چاہتی تھیں کہ میں انہیں بے قصور سمجھوں۔“ وہ سوچنے لگی سوچتے سوچتے اس کی جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔
 بے آہستہ آواز کمرے کا دروازہ آن لاک ہوا۔
 نور کوئی آہستگی سے اندر آگیا، موٹی ہوئی لائبرے بے سدھ تھی۔
 ایک ہاتھ آہستگی سے اس کے منہ اور ناک پر آکر رک گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

- ☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
- ☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
- ☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

مکتبہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

بُشری سَیّد

سِقَالِ لَکڑی

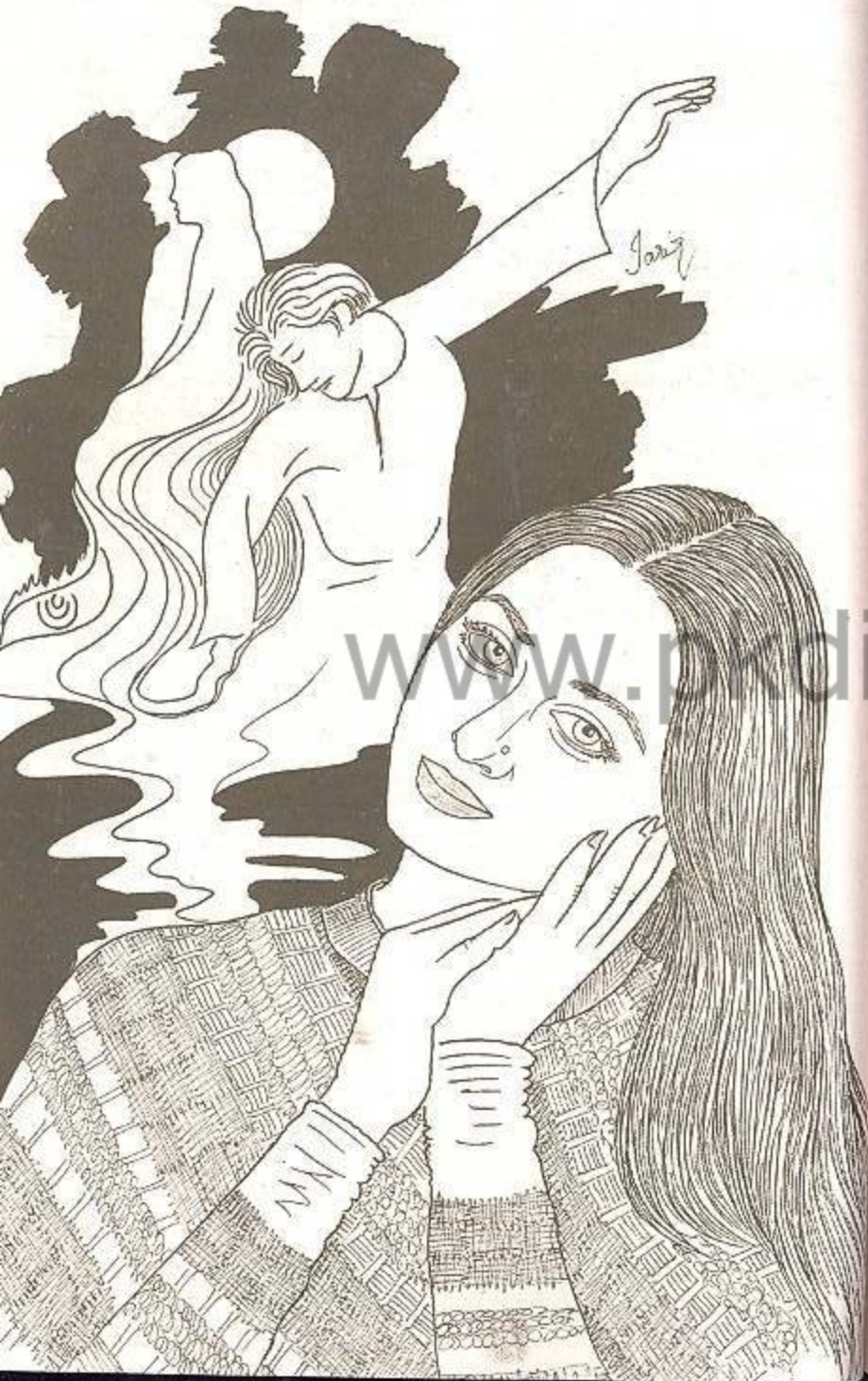
دھرتی ایک سرمئی بانٹ کی مانند بچی تھی اور رات ایک مشک فام نرمی تھی جو اس سرمئی بانٹ پر چنے تلے قدموں سے ناچتی تھی۔ روشنیوں کے زیورات سے بچی خوشبوؤں میں بسی اس سیام رنگ رقاصہ کے ہر غمزے میں ایک بھید تھا۔ شہر اس کے کانوں میں شد کے چپتے کی طرح بھنبھناتا تھا۔ اس مصروف سڑک پر وہ یوں قدم گھسیٹ رہی تھی جیسے اس کے پاؤں کیلی روٹی سے بنے ہوئے ہوں۔

بار سے نکلتے ہوئے تین کورین لڑکوں کو دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچے تو اس نے اپنی دلکش ترین مسکراہٹ چہرے پر تالی اور مخمور آواز میں پکار کر انہیں متوجہ کیا۔

”کیا ارادہ ہے؟ ایک گھنٹے کے پچاس Bucks خیال برائے نہیں کیا سوچتے ہو؟“

وہ چند ثانوی خاموشی سے اسے گھورتے رہے پھر

سکالوٹ



ان تینوں نے آپس میں سوالیہ نظروں کا تبادلہ کیا اور اتنی شدت سے ہنسے کہ ان کی چندی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

”اگر پچاس اپنی جیب سے ہمیں دو پھر بھی تم منگی ہو۔“

ان میں سے ایک زرد روڑے کے جس کے دانتوں پر برسبز Braces لگے تھے ہنسی کے دوران ہنسنے لگا۔

”تم ہمارے فلموں میں قسمت آزماؤ۔“ وہ بے تحاشا ہنسنے چلے گئے۔

وہ بت دینی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ یہ دو سری بار ہوا تھا!

اس نیلے میکسکین نے بھی اسے بد صورت کہہ کر دھتکار دیا تھا اور تب اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ وہ نشے میں تھا لیکن کورین لڑکوں نے بھی وہی بات کہی تھی جس نے پرس سے آئینہ نکالا اور دیر تک اپنے عکس پر نظرس جمائے رہی۔ کیس کچھ غلط نہیں تھا۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، وہی ہی رنگت، اس کے سارے نقوش ہمیشہ کی طرح ہی تھے۔ پھر اس کے ساتھ دوبارہ ایسا کیوں ہوا تھا۔

کیا اس کی ساعت اسے دھوکہ دے رہی تھی یا شاید وہ خود نشے میں تھی۔ مگر کس شے کا نشہ۔۔۔ ان پانچ سگریٹوں کا جو پچھلے ایک گھنٹے میں اس نے پھونک ڈالے تھے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ چھٹا سگریٹ سلگ کر اس نے ایک گہرا کھس لیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دھلتی عمر کے سپانوی مرد سے مخاطب تھی جو پارکنگ لاٹ سے گاڑی باہر نکل رہا تھا۔

”بیس Bucks جواب دینے سے پہلے سوچو کہ اس سے کم میں تم کیا خرید سکتے ہو۔ شاید چند ہاٹ ڈاگ۔“

کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے اس نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

وہ خاموش رہا اور ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

”پندرہ۔“

اس نے ایک کوشش اور کر دی تھی۔
”اگر تم دنیا کی آخری عورت ہو تو بھی میرا جواب ناں میں ہو گا۔ تم نے اپنی شکل دیکھی ہے۔ تم عورت نہیں عفریت ہو۔“

اس پر گویا کسی نے تیزاب ایزیل دیا ہو۔ اس کی گھبراہٹ خوف میں بدل رہی تھی۔

مجھے جرمن اور اس کے ایشیائی ساتھی کے پاس جاتے ہوئے اس کی ٹانگیں کچکپا رہی تھیں۔

”دس Bucks تم دونوں کے۔“

”Hassliche Fratze۔“ جرمن نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”اس نے کیا کہا ہے؟“ وہ اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ چلائی تھی۔

”وہی جو تم ہو۔“ ایشیائی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”ڈراؤنا چہرہ“

اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اس کے کانوں میں باتوں بجا رہا تھا۔

”Hassliche Fratze۔“ ڈراؤنا چہرہ عفریت۔

وہ بھاگتے ہوئے سڑک کے برے کنارے پر پہنچی اور لوگوں کے چروں کو کھونچنے لگی۔ وہاں ہر نسل، ہر رنگ اور ہر عمر کے مرد تھے مگر اسے ایک بد صورت مرد کی تلاش تھی جس کی شکل اتنی گھناؤنی ہو کہ کوئی عورت پیار کرنا تو کجا ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتی ہو۔

پھر وہ اسے مل گیا تھا۔

وہ ایک سیاہ فام تھا جس کا ہونٹ نصف سے زائد کٹا ہوا تھا اور اوپر ہی جڑے کے پہلے دانستہ کھائی دیتے تھے۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کے بدن میں ایک پھریری دوڑ گئی تھی۔ وہ گھٹ شاپ کے دروازے میں کھڑا دنڈ چائیز کو اپنے بھدے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے چھیڑ رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی اس نے سیاہ جینے لگا رکھے تھے۔

”تمہارے لیے صرف پانچ Bucks۔“ حروف اس کے تالو سے چٹ گئے تھے۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرایا شاید اسے وہم ہوا تھا۔ اس کے کٹے ہوئے ہونٹ نے ایک لبدی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چسپاں کر رکھی تھی۔

”ایک بات ایمانداری سے بتاؤں۔“ اس نے سانس روک لیا تھا۔

”میں نے اتنا خوفناک چہرہ اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔“

وہ دوبارہ دنڈ چائیز سے کھیلنے لگا تھا۔

وہ کسی کانگائی کا بوس (جرمن مصنف فریڈرک کاؤکا کے تخلیق کردہ دہشت ناک خواب) میں جھلا تھی اور اس بھانک خواب کا کوئی اختتام نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگ کر کاؤنٹر پر پہنچی اور سیلز گرل کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر چلانے لگی۔

”مجھے دیکھو کیا میں بد صورت ہوں۔ دیکھو میرا چہرہ کیا تمہیں مجھ سے خوف آ رہا ہے۔“

”نفع ہو جاؤ۔ باؤلی کیا۔“

وہ اس سے اپنا بازو پھرانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔

”شراب پینے سے پہلے خود کو کمرے میں بند کر لیا کرو۔“

”اس شہر کا سب سے بد صورت مرد مجھے بد صورت کہتا ہے۔ اسے دیکھو کیا وہ اس قابل ہے کہ کوئی عورت اس کے قریب جائے۔ وہ مجھے بد صورت کہتا ہے۔“

”یہ وہی بات مذاق کرنے کے لیے تمہیں میں ہی ملی ہوں۔ کیا میں نہیں جانتی وہ رحمتہ مادر زاد (پیدا انسی) اندھا ہے۔“

اسے لگا جیسے اس کا نیچلا دھڑمفلوج ہو گیا ہو۔ وہ گھٹنوں کے بل فرش پر ڈھسے گئی تھی۔ اس کا پورا بدن یوں لرزتا تھا جیسے آندھنی کی زد میں آیا ہوا خشک گھاس کا تکیا۔

اس صبح کا آغاز بھی دو سری تمام صبحوں کی طرح ہوا تھا۔ آج بھی اس کی آنکھ الارم کے شور کی بجائے اس ملائم آواز سے کھلی تھی جو روز اس کے کانوں کی لوٹوں کو بوسے دے کر اسے نرمی سے جگاتی تھی۔

”Twenty four robbers came knocking at my door“

وہ دیوانی بڑھیا روزانہ اس وقت بچوں کی ایک رسی پھلانگنے کے کھیل میں لگاتے ہیں (ایسا گیت جو بچے رسی پھلانگنے کے قریب سے گزرتی تھی۔

اس نے ادھ مندی آنکھوں سے لی وی اسکرین کی طرف دیکھا جس پر مسلسل جھماکے ہو رہے تھے۔

رات کو وہ ٹیلی ویژن چلتا ہوا چھوڑ کر سو گئی تھی۔ تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر اس نے ریڈیو کنٹرول ہاتھ میں لیا، ٹیلی ویژن آف کیا اور پاؤں سیلیروں میں ہیشہ پڑے ہوئے ان مائے جی سے اٹھ کر ٹوائٹ کی جانب بڑھ گئی۔

بڑھیا کی ڈوبتی آواز کھڑکی کے کنارے پر پھیلی ہوئی سبز ٹیل کے چھینے پتوں سے پھسل کر کمرے کے فرش پر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے آسیر سلیم قریشی کے 3 دیکھ ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ بچہ لی دیوانی سی	450/- روپے
آرزو بھگوانی	400/- روپے
تھوڑی دیر سا تھ چلو	400/- روپے

ناول نگار نے نئے نئے کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

سکھنا کا پتہ:

کتبہ عمران 13، گسٹ: 37، ادوارہ کارامی، فون نمبر: 32735021

سر کے بل گرتی تھی اور معدوم ہو جاتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ باہر آئی تو اس نے وہ بوسیدہ اسکرٹ پہن رکھا تھا، جس کا رنگ مسلسل دھلائی اور مٹیالے وجہوں کے باعث ایسا ہو چکا تھا کہ کوئی بھی اس کی اصل رنگت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اچھے بالوں میں انہی سیدھی انگلیاں چلاتے ہوئے بیڈ کے نیچے سے مٹ میلے بھورے جوتے کا ایک پاؤں برآمد کیا اور دوسرے پاؤں کی تلاش میں دائیں بائیں نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ ڈسٹ بن میں پرانے اخباروں کے پلندے تلے ٹھسا ہوا ملتا تھا۔ بائیں پنڈلی کے گرد جوتے کا اسٹریپ لپیٹتے ہوئے اس نے ایک نظر رست و لاج کو دیکھا تھا۔ اسے معمول سے کچھ بیڑہ کر دیر ہو چکی تھی لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ اس کے سب ہی اساتذہ اس کے در سے بچنے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ کسی دن اگر وہ جلدی کلاں روم میں پہنچ جاتی تو وہ پریشان ہو جاتے یہ اور بات تھی کہ اب تک ایسا دن ظہور نہیں ہوا تھا۔

اب اس کی تیاری کا ایک ہی مرحلہ باقی تھا جو سب سے کٹھن بھی تھا۔ اسے یاد کرنا تھا کہ کل اسکول سے واپس آکر اس نے اپنی سائیکل کہاں بھیجی تھی۔ شاید سڑک کے پار اس خشک باڑھ کی اوٹ میں جسے مسز برگنڈامیکر گریور گرمیوں کے موسم میں اپنے کتے کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتی تھی یا شاید موٹر کمینک انٹھونی جڈ کے گیاراج میں کھڑی اس سبز ”جیگوار“ کے پہلو میں جو رشتہ دو ہفتوں سے وہیں موجود تھی اور جس کی پیچرز سیٹ پر رکھا ہوا بڑا سا جلے زرد رنگ کا ”ٹیڈی بیئر“ وہ اسکول سے واپسی پر اس روز خاموشی سے اٹھ لائی تھی جب پہلی بار وہ اسے نظر آیا تھا۔

یا پھر سائیکل پڑوس میں رہنے والا جمبول سالو کا میل اس سے مانگ کر لے گیا تھا جو گرانٹ کی غیر موجودگی میں کئی بار دروازے پر دستک دیتا اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی شے مانگتا۔ اس نے ایک دوبار مہیبل کو اندر آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن وہ اندر آنے کے

بجائے دروازے میں کھڑا مختلف چیزیں مانگنے پر قناعت کرتا۔ اکثر وہ ایسی چیزیں طلب کرنا جن کی اسے قطعاً ضرورت نہیں تھی جیسے کہ کبھی کبھار وہ اس کی بائیکل ادھار لے لیتا حالانکہ وہ اسے چلا نہیں سکتا تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ گھٹنے کے جوڑے سے کٹی ہوئی تھی۔

مہیبل کے بارے میں سوچتی ہوئی وہ اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی جس میں وہ سوائے اشد ضرورت کے کبھی داخل نہیں ہوتی تھی اور اس وقت بھی ایک ضرورت اسے یہاں تک لائی تھی۔ دروازے پر دباؤ ڈالنے سے وہ چڑچاہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا۔ گرانٹ کبھی بھی سوتے ہوئے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کرتا تھا۔

وہ فرش پر اونڈھالینا تھا اور اس کے چاروں طرف کھردرے خاکستری قالین پر سگریٹوں کے اوندھلے ٹوٹے، ایک ٹوٹی ہوئی بوتل کا کالج اور بے شمار کاغذ، کچھ آدھے لکھے، کچھ بالکل کورے، ملے ہوئے کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ایک نسبتاً کم چلا ہوا اسکرٹ کا ٹکڑا ہونٹوں میں دبایا اور گرانٹ کے پھیلے ہوئے ہاتھ تلے دالا سڑو انگلیوں کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ کھسکا کر قریب کیا۔ وہ فرش پر گھٹنے ٹیک کر چند لمحوں کا زوا دحوال حلق سے نیچے دھکیلتی رہی تھی۔ پھر اس نے نیچے ہوئے آتش دان کے قریب پڑی ہوئی ”واڈا“ کی بوتل اٹھائی تھی جس میں چند ٹھونٹ باقی تھے۔ ایک جبرے سے ایک سانس اور حلق سے معدے تک دھکتی ہوئی تنگی۔ خالی بوتل واپس اسی جگہ رکھ کر سگریٹ کا ٹکڑا آتش دان کی بھیجی ہوئی راکھ میں اچھالا اور گرہ پائی سے چل کر باہر آگئی گرانٹ اب تک ویسے ہی بے سدھ رہا تھا۔

سڑک کے کنارے منگو لیا کے پیڑ سے ٹیک لگائے مہیبل اور سائیکل دونوں موجود تھے۔ مہیبل اس پر نگاہ پڑتے ہی باغچیں پھیلا کر بٹھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھری تھی اور مونے ہوئوں پر سفید پٹریاں تھیں۔ شاید وہ بستر سے نکلتے ہی اس کا انتظار کرنے

یہاں آگیا تھا۔ وہ قریب پہنچی تو اس نے پہلے سے پھیلے ہوئے ہونٹوں کو کچھ اور پھیلا دیا۔ گرانٹ کی جھلکت بھری پکار برہہ رک کر مڑی تھی۔

وہ سوئچن زوہ آنکھوں، سرخ ناک اور ننگے پیروں کے ساتھ ہاتھ میں ایک لفافہ اور کچھ ریزگار لپے لیے تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔

”اسکول سے واپسی پر پوسٹ آفس چلی جانا۔“ لفافہ اسے تھماتے ہوئے گرانٹ کی انگلیاں اس کی ہتھیلی سے مس ہوئی تھیں۔ گرانٹ کا ہاتھ حرارت سے جھلس رہا تھا۔

”لاہر واپسی کی منت کرنا۔ تم اکثر بھول جاتی ہو۔“ وہ خاموشی سے اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے رستے خون کو دیکھ رہی تھی شاید کالج کا کوئی ٹکڑا اسے چھب گیا تھا۔

”گرو سری اسٹور سے کچھ تازہ سبزیاں اوکرا“ پارشپ اور۔۔۔

اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ نیچے چند ہفتوں سے اس لیے ہی کھانسی، ہنسنے، تھوکنے، آنکھ میں جلنے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر دم اس کے ماتھے اور اوپری ہونٹ پر پسینے کی کھسکی ہوئی بوندیں چمکتی دکھائی دیتیں اور چروکی ان دیکھی آگ کی حدت سے دکھاتا رہتا۔

اس نے سائیکل پر سوار ہو کر پیڈل پر پاؤں دھرا اور کھانسیا ہوا گرانٹ بولا۔

”رہنے دو سبزیاں تم مت لانا اور اسکول سے پہلے پوسٹ آفس چلی جاؤ۔ چند منٹ لگیں گے۔ بعد میں چھپیں یا درہے یا نہیں۔“

جاتے ہوئے اس کی توجہ مہیبل کی جانب منعطف ہوئی تھی۔ وہ اب تک مسکرا رہا تھا۔ اس کے بے ڈھب مگر سفید دانت بھدے ہوئوں سے جھانک رہے تھے۔

صنوبر کے دیو قامت درختوں کی آخری پھنسیں

سر مئی بادلوں میں مدغم تھیں۔ سرد ہوا میں پیڑوں کی سبز خوشبو پھلتی تھی اور سنگلاخ سڑک بل کھاتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ اس نے تیزی سے پیڈل چلاتے ہوئے لفافے کو ایک نظر دیکھا تھا۔ اس پر سرخ روشنائی سے لکھا ہوا وہ مانوس پتا موجود تھا جو اب اس زبانی یاد ہو چکا تھا۔ اس لفافے کے اندر کیا تھا اس بارے میں اسے کوئی یقین نہ تھا۔ پڑھے بغیر بھی وہ جانتی تھی۔ خط میں لکھی گئی ہر ایک بات، ایک ایک حرف سے وہ آشنا تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہر خط میں ایک پھول بھی ہوتا تھا۔ ہر بار مختلف رنگ اور مختلف قسم کا پھول۔

جب وہ اس چوراسے پر پہنچی جہاں سے ایک سڑک پوسٹ آفس کی جانب جاتی تھی تو اس نے پیڈل چھوڑ کر دونوں بائیں فضا میں پھیلا دیں۔ لفافہ اس کی دو انگلیوں میں انکا ہوا تھا۔ پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے انگلیاں کھول دیں اور لفافے کو ہوا کے سپرد کر دیا تھا۔

مٹی پر سے دھوپ سڑک کر آنگن میں اتر آئی تھی اور وہ کل پوٹا کو تر جو دوپہر سے مٹی پر سرسبز ڈائے بیٹھا تھا، اب گھسندی سے اڑتا ہوا مسجد کے سنہری نکس کے گرد چکریاں کاٹ رہا تھا۔ وہ اس کے چکر گھٹنے لگا لیکن چند ہی لمحوں میں بیزار ہو گیا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے چکر کے آغاز اور اختتام میں تیز کیسے کرے۔ وہ ایک بار پھر کان کن کی اس شاخ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

سفید پروانوں ایسی گلیاں جن کے مکھ پر ارغوانی بند کپیاں تھیں، وہ پھولوں کو گمن کر توڑتا رہا مگر یہ کھیل بھی اس کے دل کو بھانپ نہیں رہا تھا۔ اس کا دھیان بار بار حکیم بیگم کی طرف بھٹکتا اور وہ کتنی بھول جاتا۔ وہ اسکول سے واپس آیا تھا تو وہ چوتھے کی لپائی کر رہی تھی اور اب تک وہ اسی کام میں ججی تھی۔

چوتھے تقریباً ”مکمل ہو چکا تھا اور حکیم بیگم اب نگاری

کے کنارے پر کھینچ (مٹی اور گھاس) سے تھڑے ہاتھ ٹکائے ہائے رہی تھی۔ بالوں کی چند سفید لٹیں چادر سے نکل کر اس کے دھوپ جلے چہرے سے چٹنی تھیں۔ پسینے کی دھار پنشنیوں سے کانوں کی ٹوٹوں پر گر رہی اور پیشانی سے ناک کی پھینک پر پھسلتی۔ دھوپ کی تمازت سے سرخ آنکھیں جب بھی اسے دیکھتیں اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔

”کہیں بے جی کو پتہ نہ چل جائے“ اسے بکان کے ٹھونڈوں کی گنتی بھول جاتی۔ اس کا دل اتنی اونچی آواز میں دھڑک رہا تھا کہ اسے پورا یقین تھا اگر وہ حکیم بیگم کے قریب سے ایک دفعہ بھی گزر گیا تو وہ آواز اسے سنائی دے جائے گی۔

اس نے بکان کی شاخ کو دور اچھال کر مسجد کے گٹ کو دیکھا۔ اب وہ کیوڑ وہاں نہیں تھا۔ سنہری کلس دھوپ میں ایسے چمکتا تھا کہ اس پر نظر لگانا مشکل تھا۔ اس کے بستے میں پڑا ہوا وہ قلم بھی تو ایسا ہی سنہرا اور اتنا ہی چمکتا تھا۔ اس کا دل اتنی شدت سے دھڑکا کہ بے اختیار گھبرا کر اس نے دونوں ہاتھ سینے پر زور سے باندھ لیے۔

حکیم بیگم ہاتھ میں بدھنا لیے آب گہر پر چڑھ کائے پانی کے چھپا کوس سے بالوں اور پیشانی پر لگی مٹی دھو رہی تھی۔ اس کی چادر اور ٹیٹس کی آستینوں پر بھی کچھ لگا تھا۔

”کاکا! آکے کروا (بدھنا) ہی پکڑ لے۔ تو نے آج ساری دھوپ (دھوپ) سر میں رسائی (برسائی) ہے۔ جے (اگر) ہمار ہو گیا تے (تو) فیر (پھر) میری تے اک نہیں سندا (منستا) وہ دھیلے قدموں سے چل کر جب تازہ لپے ہوئے چوڑے کے قریب پہنچا تو اس کا جی مچلا اور وہ جست لگا کر اسے پھلانگنے لگا مگر اسے اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی تھی۔ چوڑے اس کی استطاعت سے زیادہ چوڑا تھا اور اس کے دونوں پاؤں نرم گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے۔

”گندہ“ چوڑے۔ ”حکیم بیگم نے قبران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے جب بہت غصہ آتا تھا تو وہ یہی

دو گالیاں دیتی تھی۔ اس کے سوا اسے کوئی گالی آتی ہی نہیں تھی۔ شرم کے مارے اس کی نظریں گارے میں کبھے اپنے پیروں پر جم گئیں۔ حکیم بیگم کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

”میں نے تیرا کیا بڑا کیا ہے۔ کیوں مجھ نمائی نال (کے ساتھ) دشمنی کرتا ہے۔ ساری دوسرے تیرے سامنے میں اس چوڑے کے واسطے کھلتی رہی، تجھے بھورا (ذرا) ترس نہیں آیا میری بدمذہبی جان پر۔“

وہ ہنوز سر جھکائے چوڑے کی گلی سطح میں دھنسا ہوا کھڑا رہا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس کا بازو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لے کر اسے چوڑے سے اُٹار لیا۔

”میرا دل کرتا تھا بے جی۔“ اسے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ ”ٹھوس“ وجہ سوچھی تھی۔

”جی کروا (کرتا) ہے تیرے دل نوں (کو) سوکھلے (جو تے) ماروں۔ سارے بھیلے (برے) کم (کام) کرنے نوں کروا ہے تیرا دل۔ چل بن (اب) پیر تے دھولے۔ میں نے وی (بھی) نہیں ٹھیک کرنا چوترو۔ تجھے نہیں چاہی دا (چاہیے) تے بھوئی نہیں چاہی دا۔ گلی مٹی دا (کا) نشان ہے۔ آئی پکا ہوا جائے گا میرے کوئی پچھے (پوچھے) نے آنکھیں (کہنا) دل کروا تھا میرا۔“

حکیم بیگم نے ناراضی سے کہا اور اس کے پاؤں دھلانے لگی۔

وہ خاموشی سے چوڑے پر کبھے ہوئے اپنے پیروں کے نقوش دیکھتا رہا۔ کوئی اور وقت ہو تا تو وہ سوطر کی باتوں سے حکیم بیگم کا دل بہلا دیتا۔ اسکول کے لطیفے سنا کر، ہم جماعت لڑکوں کی شرارتیں اور غصے میں ذانت ڈیٹ کرتے ہوئے ماسٹری کی نقل اتار کر اسے ہنسایا مگر آج ہنسنا بولنا تو کجا اس کے ساتھ ایک ایک پل بیتانا کٹھن تھا۔

”اگر باتوں کے دوران وہ بات میری زبان سے پھسل

جی تو۔“ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اشد ضرورت کے سوا حکیم بیگم سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ اس کے پیروں پر آخری بار پانی بکرا کر حکیم بیگم نے اس کی ٹیٹس کا دامن پکڑ کر ذرا سا کھینچا تھا۔

”تو نے وہ دیکھا۔ پتہ نہیں کی (کیا) ہے۔“ وہ آنگن کے کنارے لگے انار کے بوٹے کی جانب اشارہ کرتی ہوئی تھی۔ اس نے بھی حکیم بیگم کی نظروں کا تعاقب کیا تھا اور گلابی ٹھونڈوں سے لدے انار کے بوٹے کے قریب زمین پر پڑی اس چمکیلی شے کو دیکھ کر اس کا سانس حلق میں اٹک گیا تھا۔

وہ وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ اس نے تو بستے کو چھوٹی کوٹھڑی میں کھیسوں کے نیچے چھپا کر رکھا تھا۔ پھر اسے یاد آیا تھا کہ اسکول سے آکر محض میں قدم دھرتے ہی وہ بڑی سی زرد تیزی کے پیچھے بھاگتا ہوا انار کے بوٹے تک گیا تھا اور تب بس اس کی بغل میں دیا تھا اور شاید قلم اس سوراخ میں سے پھسل کر گر گیا تھا جسے رفو کرنے کے لیے کل حکیم بیگم چاہے صدیق کی ہٹی سے کپے بھاگے والی ٹکلی خرید کر لائی تھی۔

وہ اب اس ”شے“ کو ہاتھ میں لے کر اس کی جانب مستغرق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے تھوک نگل کر کھلے کوڑیا اور لرزتی آواز میں بولا۔

”ماسٹری کا ہے۔ میز پر پڑا رہ گیا۔ میں نے سوچا کل واپس کروں گا۔ سچی میں نے چوری نہیں کیا۔ میں کروں گا واپس ایمان سے۔“

وہ چند لمحوں میں کھڑے اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے چلتی ہوئی آئی اور اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

وہ بے یقینی سے اس کی ہتھیلی پر دھری ازار بند ڈالنے والی شہرے رنگ کی تیلی کو دیکھنے لگا جو شاید کوئی کوا ان کے صحن میں گر آیا تھا۔

پسینے کی بوندیں اس کی گردن کی پشت سے کمر پر رینگنے لگیں۔

”بس نہ کدھر ہے تیرا؟“ حکیم بیگم نے دھمی آواز

میں پوچھا۔

جواب ”اس نے سرگوشی میں بتایا تھا اور میں دھوپ سے جھلے فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کھلے دروازے سے باہر بھاگ جائے مگر وہ بیٹھا رہا اور حکیم بیگم کے کوٹھڑی سے نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے دل میں اللہ سے شکایت پیدا ہوئی۔

”تو مجھ سے پیار نہیں کر تا اسی لیے میرے عیب کو نہیں چھپایا۔ لوگ اتنے برے کام کرتے ہیں تو نے ان کو کبھی نہیں پکڑوایا۔ پرسوں ابھی نے آصف کی کاپی چُر کر پہلا ورق (ورق) پھاڑ دیا اور اپنا نام لکھ کر کاپی چھپا دی۔ ماسٹری نے سارے ہستوں کی تلاشی لی۔ سارا کمرہ جھان مارا پر ان کا دھیان اپنی میز کی دراز کی طرف نہیں گیا۔ ابھی کھڑا ہوتا رہا۔ تو نے اس کا پردہ رکھ لیا تو میرا کیوں نہیں۔ وہ تو باز بھی نہیں پڑھتا اور اپنے ابا کا کتا بھی نہیں مانتا۔ تجھے اس سے زیادہ پیار ہے نا۔“

حکیم بیگم نے چند لمحوں بعد اس کے بستے سے وہ قلم برآمد کر لیا تھا مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس کی چاپ سے عمر کا دل ڈوبتا تھا۔

اور بولی۔

”چل وضو کرے (کریں)۔“

اس نے پوچھا جاہا کہ عصر کی اذان ہونے میں تو ابھی بہت وقت باقی تھا۔ پھر وضو کس لیے مگر اپنی موجودہ ”حیثیت“ کو بد نظر رکھ کر خاموش رہا۔

وضو کرتے ہوئے اس نے ڈرتے ڈرتے حکیم بیگم کی جانب نظر اٹھائی اور فرو ترین آواز میں منمنایا۔

”میرا دل کرتا تھا۔“

حکیم بیگم نے ہونٹوں پر انگلی دھر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ وضو کے دوران باتیں کرنے سے منع کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ چپ چاپ وضو کرتا رہا مگر جیسے ہی کلمہ شہادت پڑھ کر حکیم بیگم نے چادر کو سر اور کندھوں پر پھیلا دیا وہ پھر بولنے لگا۔

”اس نے میری دونوں تیلیوں (ہتھیلیوں) پر توت

کی پانچ پانچ پھلیں۔ ماریں اور مجھے گالی بھی دی۔ وہ بہت بری بات تھی میں بتائیں سکتا۔

یہ بات اس نے حکیم بیگم کے دل میں تجسس ابھارنے کے لیے کہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار وہ بات اس نے سن لی تو وہ اس کی ہم خیال بن جائے گی اور ماسٹر جی کا قلم اٹھانے والی حرکت کو بالکل برا نہیں جانے گی۔ مگر وہ کچھ پوچھنے پر آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ اب وہ شہادت کی انگلی سے اس کے گرد زمین پر ایک مدھم لکیر پر جی دائرہ کھینچ رہی تھی۔

”اس نے مجھے۔۔۔“ وہ ایک لمحے کو ہچکچایا۔

”یکینو گھیساری (کمارن) کا بچہ اور۔۔۔ حرامزادہ کہنا۔ وہ روزی مجھے ساری جماعت کے سامنے حرامی کہہ کر بلاتا ہے۔“

وہ اب بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دائرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور تعویذ پڑھنے لگی۔

”میرے کچھ کچھ (پچھے) پڑھ۔“

وہ حیران ہو کر چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور پھر پڑھنے لگا تھا۔

تسمیہ پڑھنے کے بعد اس نے سورۃ فلق اور سورۃ ناس کی تلاوت کی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ وہ ہر اتار با مگر اس ساری کارروائی کا مقصد اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔ وہ نہایت جذب سے کچھ مانگ رہی تھی لیکن الفاظ عمر کے کانوں تک نہ پہنچتے تھے۔

”میں نے تیرے دوا لے (گرد) نور کا گھیرا کر دیا ہے۔ انشاء اللہ اب تو چوری نہیں کرے گا۔ یہ دل بڑا چندرا ہوتا ہے بیباں کی ہر بات من (مان) لیں تیرے گل وچ (گلے میں) کتے والا پنہ ڈال کر اپنے پیچھے بھگاتا ہے۔ جیہ لنگ آتی ہے۔ ڈیلے پھٹ پڑتے ہیں پر اس ڈاڑھے (زبردست) دی (کی) من مرضی فیڑی پوری منیں ہوندی (ہوتی) تجھے اس بات کا برا ڈر تھا کہ بے جی توں پتہ نہ لگ جائے پر اللہ سے ڈر نہیں لگا جس توں (سے) تیرا کوئی کم نہیں تک چھپ سکتا (سکتا)

انگلی وار (بار) جد (جب) تیرا دل کوئی پٹھی (الٹی) مت دے تے یاد رکھیں (رکھنا) کہ اللہ تجھے ہر ویلے (وقت) دکھاتا ہے۔ اس سے شرم کرنا رکھ۔ بندوں کے سامنے کچائی (شرم) دا کی فیدا (فائدہ) یہ تو آپ بڑے وچارے (بیچارے) ہیں۔ تیرا کی (کیا) وگاڑیں (لگاڑیں) کے۔“

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ پھر حاجت سے بولا۔

”مارے گا اللہ اب۔ مجھے آگ میں ڈالے گا۔ میں نے چوری چوکی ہے۔ وہ تو بہت ناراض ہو گا۔“

حکیم بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک طویل سانس بھری۔

”تو معافی منگ (مانگ) لے۔ اسے پتہ ہے کہ تو شرمسار ہے۔ اور ایک بات بتاؤں تجھے؟“

”ہاں بے جی!“

”وہ تجھ سے بڑا پیار کرتا ہے۔“ اس نے حیرت سے حکیم بیگم کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”اس نے تیری چوری پکڑا دی۔ جے مجھے پتہ ہی نہ لگدا اور تو پکا چور بن جاند (باتا) فیڑی مارے (کے) سو طریقے ہوتے ہیں اور اس انداز میں توں لہکلا (انوکھا) ہے۔“ عمر کا دل سینے میں بے قرار ہو گیا۔ اس کے پیٹ سے ایک گولا سا اٹھا اور حلق میں آکر انک گیا۔ اس نے دھنڈلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”لے دس (لو بتاؤ) تجھ کو یاد ہی نہیں میں نے تیرے لٹی (لیے) روے (سوچی) کو حلوا بنایا ہے اور سن۔۔۔ تیرے نی صلی اللہ علیہ وسلم نوں وی لوک گالیاں دیتے تھے۔ وہ کیا کرتے تھے بھلا۔“

اس نے آنکھیں ہٹیلی کی پشت سے پونچھ کر صاف کیں۔

”معاف کر دیتے تھے۔“

”سویرے جا کر ماسٹر جی نوں قلم واپس کرے گا ناں اور معافی وی مانگے گا۔ میں تیرے ساتھ چلوں گی۔“

”کروں گا۔ پر مجھے حلوا تو دے۔ بھوک سے جان نکل رہی ہے۔“

وہ شدت سے روتے ہوئے بولا تھا۔

حکیم بیگم اس کا سر گود میں لے کر بہت دیر تک تسلی دیتی رہی تھی۔

اگلی صبح جب وہ فجر کی نماز پڑھنے کے لیے صحن میں آیا تو کچھ خیال آنے پر چوڑے کی طرف آ نکلا۔

اس کے پاؤں کے نقش اب پختہ ہو چکے تھے۔

”اگر بے جی اتنا غصہ نہ کرتی اور اسی وقت دوبارہ لپائی کر دیتی تو چوترا تانا خراب تو نہ بنتا۔“

اس نے لمحے ہوئے بچوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے تاسف سے سوچا تھا۔



صبح کی سروس میں شرکت کرنے کے بعد وہ کھینچا ہوا دل کے مرکزی دروازے سے باہر نکلی تو آسمان پر بادلوں کے دھبے بکھر رہے تھے۔ ہوا کی خوشگوار ٹھنڈک کو محسوس کرتے ہوئے وہ پارک کی سنگلاخ روش پر بے مقصد مٹنے لگی۔ چھٹی کان تھا مگر ابتدائی پھر ہونے کے باعث اکاؤ کا لوگ ہی پارک میں دکھائی دیتے تھے جن میں سے اکثریت ایک گوشے میں تعمیر کردہ مصنوعی جھیل کے گرد جمع تھی۔ جھیل میں تیرتے بطنوں کے غول کی جانب ڈبل روٹی کے ٹکڑے اور مٹھی ہوئی مکئی اچھالتے ہوئے بچے اور بڑے یکساں طور پر حلق سے پرجوش بے معنی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔

ارغوانی پھولوں کے تنخے میں سے گزرتی روش پر وہ اس لمحے ٹھنک کر رہی تھی عجیب اس کے عقب میں آئی بھاری بوٹوں کی چاپ ٹھم گئی تھی اور کسی نے گیسٹر لیمے میں پکارا تھا۔

”کارا!“

وہ قطعی غیر ارادی طور پر مڑی اور اس چھ فٹ سے نکلتی ہوئی قامت کے شخص کو دیکھا جس نے جلابانی میپل کے پتوں والے نمونے اور گہری سبز زمین کے

ساتھ کمونو پین رکھا تھا جو بمشکل اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ بدرنگ جینو بوسیدگی کے باعث جھربھری ہو چکی تھی۔ اس کی قومیت کے بارے میں وہ فوری طور پر کوئی اندازہ نہیں لگا سکی تھی کیونکہ اس کا چہرہ رنگین چھپیوں سے مزین مٹھوئے (ماسک) کے پیچھے چھپا تھا۔ ہاتھوں اور بالوں کی رنگت سے وہ ایشیائی لگتا تھا تاہم لہجہ اسے یورپین ثابت کر رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کاسنی رنگت کا پھول تھا اور کسی سنگ تراش کے شاہکار جیسا وہ ہاتھ اس لمحے اس کی جانب بڑھا ہوا تھا۔ وہ کئی ٹٹائیے اس کے ہاتھوں کو پلکیں جھپکائے بنا گھورتی رہی۔ اس نے اتنے بڑے ہاتھ آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

”Cara mia! vieni al Parco di domani۔“

بولتے ہوئے وہ اس قدر قریب آ گیا تھا کہ اس کی سانسوں کی حدت اور وجود کی مردانہ پاس کو تن سے لپٹتا محسوس کر کے وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

الفاظ کا مغربوہ وہ نہیں جان سکتی تھی۔ جانے وہ کون سی زبان تھی۔ شاید اطالوی کیونکہ اتنا اسے معلوم تھا کہ cara اطالوی زبان میں کسی عورت کو پیار سے مخاطب کرنے کے لیے کہا جاتا ہے لیکن وہ اسے کیوں مخاطب کر رہا تھا اور وہ تھا کون۔ اس نے دل کی دھڑکن کو کانوں میں گونجتے ہوئے سنا۔ خدا جانے کس جذبے کے ہاتھوں پسپا ہو کر اس نے وہ پھول لے لیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اس سے کیا چاہتا تھا مگر پھول اسے دینے کے بعد نہ تو اس نے کچھ کہا اور نہ ہی وہ ٹھہرا تھا۔ اسے آواز دینے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے وہ اسی جگہ کھڑی اسے لمبے لمبے ڈگ بھر کر خود سے دور ہوتے دیکھتی رہی تھی کہ وہ آراکشی بوڑوں کی ایک لمبی قطار کے پیچھے کھو گیا۔ وہ جانے کتنی دیر اور وہیں جی رہتی اگر وہ یورپی بوڑھا اسے چونکا نہ دیتا جو برام میں چھ سات ماہ کے بچے کو لٹائے اسی روش پر چمپل قدمی کر رہا تھا۔

”میں پچھلے پانچ منٹ سے یہاں کھڑا ہوں۔“

”معاف کیجئے گا۔“

اس نے غائب دماغی سے بوڑھے کی بات سنی۔
”تم نے میرا راستہ روک رکھا ہے۔“
”اوہ۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا۔“

وہ بدحواسی میں معذرت کرتے ہوئے روش کے ایک طرف ہو گئی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں۔“

بوڑھے نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پرانے دھکیلا اس کے قریب سے گزر گیا۔ چند قدم آگے جا کر اس نے گردن موڑی اور مسکرایا۔

”تم اسے کل پارک میں ملو گی نا۔“

اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بنا وہ بوڑھا ہاتھ ہلا کر رخصت ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحوں پہنچ کر کچھ سوچتی رہی پھر ہڑتالے نصب چوٹی پہنچ کر ایک طرف بڑھ گئی۔ سچ بڑھ کر اس نے وہ ریشمی موباف پتوں والے کاسنی پھول کو اس نے رکھا تھا۔ نمٹلیں پتوں والے کاسنی پھول کو اس نے موباف میں احتیاط سے پیٹ کر پینڈیک میں رکھا اور بالوں کی لکیوں سے سلجھاتے ہوئے سوچا۔

”میں اسے پہچانوں گی کیسے۔ کاش میں نے اس کا چہرہ دیکھا ہوتا۔“
پھر ایک خیال آنے پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔
”اتنے بڑے ہاتھ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔ میں اسے لاکھوں کے ہجوم میں بھی شناخت کر سکتی ہوں۔“

”پرناں! تم بتاتی کیوں نہیں ہو کہ اتنی صبح تم اس ویران پارک میں کیا لینے آئی ہو۔“
داؤد نے ہنسی لیتے ہوئے گھڑی دیکھی۔

”غضب خدا کا ابھی چھ بجے ہیں۔ تمہارا دماغ تو درست ہے؟ اب تک تو پرندے بھی سو رہے ہوں گے۔“

وہ اس کی مسلسل خاموشی سے سخت جھنجھلایا ہوا لگتا تھا۔

”مجھے معلوم نہیں یہاں مجھے کتنا وقت لگ جائے گا، ورنہ میں تمہاری گاڑی لے آتی۔ تمہیں میری وجہ سے بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

وہ ڈور ہینڈل کی طرف ہاتھ بدھاتے ہوئے بولی۔
”بھاڑ میں کئی زحمت اور معذرت۔ میں نے تم سے ایک نہایت سادہ اور آسان سوال پوچھا ہے اور میں دس بار اس سوال کو وہرا چکا ہوں۔ آخر تم بتا کیوں نہیں دیتیں یہاں تمہیں کس سے ملنا ہے اور۔۔۔“
اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پرناں کی غیر معمولی تیاری کا جائزہ لیا۔

”تم نے جتنی محنت سے سنگھار کیا ہے۔ لگتا نہیں کہ رات کو سونے کے لیے تمہارے پاس کچھ وقت بچا ہو گا۔“

نیند کے خمار نے اب تک اسے اس پہلو پر دھیان دینے کی مہلت نہیں دی تھی۔

زنگاری رنگ کے اس شخص ناباؤے میں کانوں میں جھولتے برف ایسے سپید آوازوں کے ساتھ وہ بہت چوتھالی نظر آ رہی تھی۔ بالوں کی گتھا حواٹ صاف بتاتی تھی کہ اس بیچیدہ مگر خوشنما چٹیا کو بنانے میں طویل وقت اور محنت صرف ہوئی تھی۔

وہ چند لمحوں چپ چاپ داؤد کے سوال سننے چہرے کو دیکھتی رہی اور نہایت آہستہ آواز میں ”شکریہ داؤد“ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی۔

اسے ایک ناراض نگاہ سے نواز کر وہ زنانے گاڑی نکال لے گیا تھا۔

وہ کیونکر اسے بتاتی کہ وہ اس پارک میں ایک ایسے اجنبی سے ملنے آئی تھی جو عجیب وضع کا کوئی پینتا تھا جو اس کے بڑے شکوہ بدن کو پوری طرح ڈھانپ نہ پاتا تھا اور چہرے کو بھڑکے رنگوں سے سجے کھوٹے سے چھپاتا تھا اور اس غیر معمولی طبع میں سنبل کا پھول معلوم ہوتا تھا۔ ایک وقت رعنا اور کدھب۔ اور جو اطالوی نے تھا مگر اطالوی بولتا تھا اور اسے ”مارا“ کہہ کر پکارتا تھا۔ جس کے ہاتھ اتنے بڑے تھے کہ انہیں

دیکھ کر مائیکل اینجلو کے شاہکار مجسمے موسز کا خیال آتا تھا۔ وہ اس کاسنی پھول کے بارے میں کیسے بتاتی ہو اس کے پینڈیک میں ایک ریشمی موباف میں لپٹا ہوا کل سے موجود تھا۔ وہ یہ ساری باتیں داؤد کو کیسے سمجھا سکتی تھی۔

پارک میں دم سادھے خاموش درختوں، کسی کینچنے کے مانند ریختی سرو ہوا، مصنوعی جھیل میں رک رک کر تیرتی ہوئی بٹھوں اور پتوں کی شاخوں میں بھدکتی چند گوریالوں کے علاوہ صفائی کرنے والے عملے کے افراد اور صبح کی سرکھ آتے ہوئے دو بوڑھے تھے۔ آہستگی سے چلتی ہوئی اس چوٹی پہنچ کر ایک طرف ہو گئی۔

سنگی روش کے قریب رہنے کے بیڑے تلے بچھا تھا۔
ہوا نہایت دھیمی رفتار سے بہتی تھی اور اس کی خشکی دھیرے دھیرے دن کو چھوٹی تھی۔

وہ سچ پر قدرے سکر کر بیٹھ گئی اور بیگ سے ایک رسالہ نکال کر سامنے پھیلا لیا۔ کچھ دیر وہ ایک مقالے کو پڑھنے کی سرگرمی کر رہی تھی مگر لکھاری نے جانے کون سی زبان استعمال کی تھی۔ الفاظ اس کی آنکھوں کے لیے قطعی نامانوس تھے خاصاً دیر تک وہ یہی افذ نہ کر سکی کہ مقالہ کس موضوع پر تھا۔ ہر دو سطروں کے بعد بس کی نظر پر پارک کے داخلی راستوں میں بھٹکتے لگتیں۔

سات بج گئے۔ آسمان کی ملگجی سیاہی اجلی نیلاہٹ میں بدل رہی تھی۔ اس نے گردن اٹھا کر رہنے کے بیڑے کو دیکھا۔ پھولوں کے جھرمٹ یوں دکھائی دیتے تھے جیسے گلابی ٹکلیوں کے غول ریختے کی ڈالہوں پر اترے ہوں اور کسی سحر کے اثر سے وہیں منجمد ہو گئے ہوں۔ اس کے عین اوپر ایک خمیدہ شاخ پر سرخ سینے والی روین چڑیا بیٹھی تھی۔ اس نے روین چڑیا کے بارے میں بہت سی دیوالائی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس نے انہیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر ایک بھی دیوالیہ اس کے ذہن میں نہ آ سکی۔ ہاں روین چڑیا کے سینے کے سرخ پتوں کو دیکھتے ہوئے ایک رٹنلن کھوٹا اس کی نظروں میں مرتسم ہونے لگا تھا

اور اس کھوٹے میں روین چڑیا کے سینے کا رنگ خاص طور پر نمایاں تھا۔
”اٹھ بچے تک کوئی بھی پارک میں نہیں آیا تھا اور صفائی والا عملہ جا چکا تھا جبکہ وہ دونوں بوڑھے اب کیاری کے قریب بیٹھے خوش بگپوں میں مگھے تھے۔ وہ اٹھ کر ٹھٹھنے لگی۔

نوبے تک اسے یہاں آنے پر افسوس ہونے لگا تھا۔

اور دس بجنے سے قبل وہ بیچ پر گھنٹوں میں سر دیے بے خبر سو رہی تھی۔

جانے وہ بیچ کی جانب بھاگ کر آتے ہوئے بچوں کے شور سے جاگ اٹھی یا اس جوانی کے لوج میں جھپکے نسوانی قہقہے سے جو عقب میں بلند ہوا تھا۔ گلابی رنگت کی چند ”قتلیاں“ اس کی گود میں اتر آئی تھیں اور ایک ٹکلی اس کی چٹیا سے آزاد ہونے والی لٹ میں ابھی بھگورے لے رہی تھی۔

”cara mia!“
وہ ایک جھٹکے سے اٹھی، مڑ کر آواز کی سمت دیکھا اور ساکت ہو گئی۔

وہ نسوانی قہقہہ ایک بار پھر اٹھا اور اس قہقہے کا رنگ گلابی تھا۔
سنہری ریشم کے لچھوں جیسے بالوں والی، وہ دلی تلی لڑکی کاسنی پھول کی نمٹلیں پتوں کو ہونٹوں سے لگائے مسلسل ہنس رہی تھی۔

آج بھی وہ اسی طبع میں تھا اور اپنی بلند قامت کے ساتھ اس بے حد شوخ اور ناگفتی کو نو اور دھوپ میں چمکتے بھر کد رانگوں والے کھوٹے میں کسی پگڈا (بڈھ) مت میں ایک مقدس عمارت کی مانند نظر آتا تھا۔
معاذ اس نے پگڈا کو اپنی جگہ سے سرکے دیکھا۔ وہ اس کے قدموں پر قدم رکھتے ہوئے چلنے لگی۔

دوپہر ہونے تک اس نے چار فوجوان لڑکیوں کو پھول دیے اور وہ ایک مخصوص فقرہ کہا جو کل صبح سے پرناں کے کانوں میں ایسے سنا تھا جیسے وہ صدیوں سے سنتی آرہی ہو۔ ان میں سے ایک اداس کھوٹی ہوئی سی

لڑکی نے پھول نہیں لیا تھا اور اسے گلی دی تھی مگر جو لیا وہ کچھ نہیں بولا تھا اور نئی ”منزل“ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا تھا۔

جب تھکن اس کے متحرک قدموں کو بوجھل بنانے لگی اور پریناں کو یقین ہو گیا کہ اس کے پاس موجود تمام کاغذی پھول ختم ہو چکے تھے تو وہ نرم گھاس پر سوجھ بوجھوں کو دھرتی اس کے قریب چلی آئی۔

وہ ایلوسٹونیا *Alstonia* کے تنے سے پشت لگائے، ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ کے گھٹنے پر ٹکائے کٹن کنسیا بنا کر کھڑا تھا اور اس لمحے پریناں جانتی تھی کہ چاہے وہ اجنبی شام تھا یا نہیں مگر وہ راہب ضرور تھی جو بے خود ہو کر اس کی اور کچھ چلی جاتی تھی۔

”یہ سینڈوچ ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر اس کا ذائقہ اتنا خراب نہیں ہے۔“

بیک سے سینڈوچ نکالتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ اس نے کل شام کٹی کا ایک مک زبردستی حلق میں اندھیلنے کے بعد اس وقت تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک تھی ہی کہاں جو وہ کچھ کھاتی۔

”سینڈوچ کھالو۔ مجھے معلوم ہے تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔“

اسے خبر نہ ہوئی اس کی آواز مرتعش تھی یا نہیں مگر اس کا برہما ہوا ہاتھ بری طرح کپکپا رہا تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا اور چہرے سے کھوٹا پڑا۔ تب پریناں نے جانا کہ اس کے پاس جوگ مایہ تھی۔ وہ کوئی بھی روپ بدلنے پر قادر تھا۔

ایک زندہ پتوڑا۔

راہب کا من، بیسا شام۔

اور اب۔۔۔ پریناں کی گمانیں کا ایک کردار۔

وہ سائنت پلکوں کے ساتھ سانس روکے اسے دیکھتی رہی۔ جانے کب تک اس کی آنکھیں اس نظارے پر جم رہیں۔ شاید ایک قرن یا اس سے کچھ زیادہ۔

”میں تمہیں جانتا ہوں؟“

اس نے وہ بڑا سا ہاتھ برہما کر سینڈوچ لے لیا۔

”سینڈوچ کے لیے شکریہ۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ اگر ہم پہلے مل چکے ہیں تو مجھے اپنی یادداشت سے شکایت ہے۔ اتنی خوب صورت لڑکی کو بھولنا تو گناہ ہے۔“

وہ بھڑکھڑی لے کر جاگی۔

”میں۔۔۔ پریناں آنرک ہوں۔ پاکستان سے یہاں اپنے چچا کے گھر رہتی ہوں۔ وہ چرچ میں Elder ہیں۔ طب کی طالبہ ہوں اور کل تم مجھے ہمیں ملے تھے۔ تم نے ہی تو مجھے دوبارہ ملنے کا کہا تھا۔“

”میں نے؟“ مجھے تو بالکل یاد نہیں ہے۔“ اس نے سینڈوچ کا کوٹا کرتے ہوئے بایاں ابرو اچکایا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمت بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

”یاد کرو۔ کل ہی کی تو بات ہے۔ میں صبح چھ بجے سے اس بیچ رہ رہ جوریٹھے کے درخت کے نیچے ہے۔“

اس نے بیچ کی سمت اشارہ کیا۔

”وہاں بیٹھ کر تمہارے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ تم کیسے بھول سکتے ہو۔“

وہ روہنے کو تھی۔

”اور تم نے یہ پھول بھی مجھے دیا تھا۔“

اس نے ہینڈ بیک سے موباف نکالا اور تمہیں کھول کر اس کے سامنے پھیلا دیا۔

”یہ دیکھو۔ اسے تو پہچانتے ہو تم۔“

”اوہ۔ میں سمجھ گیا۔“

اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”تم نے اس بات کو اتنی سنجیدگی سے لیا لیکن۔“

اس نے خاموش ہو کر پریناں کے زرد چہرے کو تشویش سے دیکھا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ اور تم اٹالوی جانتی ہو۔“

”کیا ہم بیٹھ جائیں۔“

”ہاں ضرور۔ بیٹھ کر ہم یقیناً زیادہ آرام دہ طریقے سے بات کر سکتے ہیں۔“

وہ دونوں آنے کے سامنے گھاس پر راجان ہوئے۔

”تم جس بھی وجہ سے مجھے ملی ہو۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔“

وہ گویا ہوا تو پریناں مجسم ساعت بن گئی۔ کسی دھارک ہاتھ شلالیں بیٹھے ہوئے دیکھ کر بھی کی طرح موڈب اور ہمہ تن گوش۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دن تم اس ملاقات پر فخر کرو گی اور اپنے جانے والوں میں نہایت غور کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا کرو گی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ انجانے میں تمہاری ملاقات مستقبل کے عظیم اداکار سے ہو گئی ہے۔ ایک ایسا ازال فکرا جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔“

اس کی آواز میں شوخی رہنے لگی تھی۔

”تمہیں آؤگراف چاہیے تو آج لے لو کیونکہ اگر تم نے کل کا انتظار کیا تو ہو سکتا ہے تمہیں ایک طویل اور نہ ختم ہونے والی قطار میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے اور میں تمہیں اس کوفت سے بچانا چاہتا ہوں۔ تمہارے پاس کاغذ ہے۔“

اس نے پوچھا تو پریناں کی گردن نفی میں تھی۔

”کوئی بات نہیں۔ ہاتھ لاؤ۔“

مائیکل اسٹیلر کے موسم کا ہاتھ برہما اور اس کا سر د ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔

وہ کس دیکھتا ہوا انگارہ تھا اور پریناں کو یقین تھا کہ اس کا ہاتھ جل جائے گا۔

وہ جینز کی جیب سے قلم نکال کر اس کی ہتھیلی پر کچھ لکھنے لگا تھا۔ پریناں نے نہیں دیکھا کہ اس نے کیا لکھا تھا۔

”میں بھی پاکستانی ہوں۔ وہیے تو میں اسپرنگ فیلڈ میں پیدا ہوا اور کبھی پاکستان نہیں گیا۔ مگر میرے والدین پاکستان سے تھے۔ میں اردو بھی بول سکتا ہوں مگر تھوڑی بہت۔“

خیر میں بتا رہا تھا کہ اداکاری میری محبوبہ ہے۔ میرا خواب ہے۔ ابھی تک مجھے روپے پر اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کا موقع نہیں مل سکا مگر ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو پھر کوئی بھی میرا راستہ روک نہ پائے گا۔

میری منزل بہت آگے ہے۔ میں ہالی وڈ کے آسمان کا جگمگا ستارہ بنوں گا۔ ایسا ستارہ جس کی ضیاء کے سامنے سورج بھی ماند ہو۔ اپنی منزل کو پانے کے لیے میں گھر چھوڑ کر لاس اینجلس کی سڑکوں پر بھٹکتا پھر رہا ہوں لیکن اب تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔ مجھے اپنے کیریئر کا پہلا کردار مل گیا ہے اور اسی کردار کی وجہ سے تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ دراصل یہ ایک قاتل کا کردار ہے جو پوری فلم میں صرف دو مرتبہ نمودار ہوتا ہے اور دونوں مرتبہ اس کا چہرہ ظاہر نہیں ہوتا۔

پہلا منظر ایک ”ہیلوین“ پارٹی کا ہے اور قاتل جس نے کمونو پینا ہے اور چہرے پر ماسک لگا رکھا ہے، فلم کی ہیروئن کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پھول دیتا ہے اور اٹالوی میں کہتا ہے ”کل مجھے پارک میں ملو“

”ہیروئن اسے اپنا محبوب سمجھتی ہے کیونکہ قاتل آواز اور لہجہ بدل کر بولتا ہے۔“

دوسرے منظر میں ہیروئن پارک میں اپنے محبوب کی منتظر ہے۔ اچانک قاتل ایک بیڑے کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور پشت سے ہیروئن کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیتا ہے۔ یہاں بھی اس کا چہرہ پوشیدہ رہتا ہے۔ وہ ہیروئن کو گلا گھونٹ کر مار دیتا ہے۔ قاتل کی شناخت فلم کے اختتام پر ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا چہرہ نہیں دکھایا جاتا اور یہی اس کردار کی سب سے بڑی خرابی ہے۔ میں ایک بار بھی ناظرین کو دکھائی نہیں دوں گا۔“

اس نے ایک طویل سانس لیا۔

”لیکن عظیم مقاصد کے لیے قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ چونکہ اپنی زندگی کے پہلے کردار کو میں یادگار انداز میں ادا کرنا چاہتا ہوں اس لیے اس ہونق حملے کے ساتھ پارک میں اپنے طور پر رہ سہل کر رہا ہوں۔“

پچھلے تین دن سے۔ اب تو تمہاری آنکھیں دور ہو گئی ہو گی۔“

پریناں نے بڑا غفش کی مانند سر ہلا دیا۔ جانے اس کی آنکھیں دور ہوئی تھیں یا بڑھ گئی تھیں۔ وہ تو اس کے ہاتھوں کو کھور رہی تھی جنہیں وہ بات کرتے ہوئے

مسلحہ حرکت میں رکھتا تھا۔ ان ہاتھوں میں یقیناً قتل کرنے کی صلاحیت تھی۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے؟ بالکل خراب ہے؟“

”کیا ٹھیک نہیں ہے؟ میرا کردار؟“

”نہیں یہ کمونو، شہیں معلوم نہیں ہے شاید یہ زنانہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے جھینپ کر استفسار کیا۔

”آستینوں کی ساخت سے صاف ظاہر ہے۔“

مروانہ اور زنانہ کمونو میں بنیادی فرق آستینوں کی بناوٹ کا ہی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ”اولی“ یعنی مخصوص طرز کا کر بند ضرور ہوتا ہے جو تم نے نہیں

باندھ رکھا۔ کمونو کے ساتھ سینے کے لیے جوتے بھی

مخصوص ہوتے ہیں مثلاً ”Zori“ اور ”Geta“

وغیرہ اور اس کا ڈیزائن بھی موسم کے لحاظ سے منتخب کیا

جاتا ہے۔ مہبل والا نمونہ سرا کے لیے موزوں ہے۔

شہیں ضرورت ہے ایک عدد ”Yukata“ کی۔“

وہ چیچی سے سن رہا تھا۔

”تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں۔ کیا تم کمونو پر

کوئی تھیسس وغیرہ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟ تم تو ڈاکٹر

بننے والی تھیں نا؟“

اس کا جواب محض ایک مدہم مسکراہٹ تھی۔ وہ

اسے کیا بتاتی کہ کل ڈاکٹر کی ملنے والی ایک جاپانی لڑکی

کے ساتھ دو گھنٹے اسی موضوع پر بات ہوئی تھی۔

”میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں نے اتنی گہرائی میں

نہیں سوچا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں جس فلم میں

کام کر رہا ہوں وہ تیسرے درجے کی پروڈکشن ہے اور تم

سمجھ سکتی ہو ایسی پروڈکشنز میں ہر بات پر سمجھوتہ کیا

جاتا ہے اور خاص طور سے معیار پر۔ اسٹنٹ

ڈائریکٹر نے کہا ہے کہ اسٹوڈیو کے وارڈروب میں کمونو

نہیں ہے۔ اس کا بندوبست مجھے خود کرنا ہو گا۔ میں نے

کہا بھی کہ قاتل کو کمونو پہنانا ضروری نہیں ہے اسے

ایک سادہ پتلون قمیض یا عام سے گاؤں میں ماسک

لگائے ہوئے دکھا کر گزارہ کیا جاسکتا ہے اور اسٹنٹ

ڈائریکٹر نے نہایت حقارت سے جواب دیا ”گزارہ تو

تمہارے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔ تخلیق کاروں کی حس

جمال کو تم جیسا چھوٹا انسان کیسے سمجھ سکتا ہے۔“ اسے

بچھٹانا پڑے گا ایک روز۔ میرا وعدہ ہے یہ۔ میں نے

استعمال شدہ ملبوسات کی ایک سستی دوکان سے یہ

کمونو کرائے پر حاصل کیا ہے کیا کروں، اس نام نہاد

حس جمال کے حامل ڈائریکٹر سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا

کہ قاتل جاپانی نہیں ہے تو کمونو کیوں پہنتا ہے اور

کمونو پہنتا ہے تو جاپانی کیوں نہیں ہے اور بالفرض اگر

جاپانی ہے تو اٹالوی کیوں بولتا ہے۔“

وہ ہنسنے لگا۔

”تم پھولوں کی زبان سمجھ سکتی ہو؟“

اس کا سوال سن کر وہ حیران ہوئی۔

”ہاں پھولوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور مزے

کی بات یہ ہے کہ میں اس زبان سے واقف ہوں۔ میں

نے جو پھول تمہیں دیا تھا وہ Gloxinia ہے اور

Gloxinia علامت ہے۔ پہلی نظر میں محبت کی

پر نیاں کا سفید چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے کسی نے

دوہ میں لال روشنائی کا قطرہ پکڑا دیا ہو۔

وہ جانتی تھی کہ اس نے ویسا ہی پھول اور لڑکیوں کو

بھی دیا تھا لیکن پھر بھی۔۔۔

وہ دونوں مختلف موضوعات پر بات کرنے لگے۔

پر نیاں کو کچھ خبر نہ تھی وہ کیا بولی تھی اور کیوں بولی

تھی۔ وہ تو بس اتنا چاہتی تھی کہ دنیا کی تمام گھڑیاں ٹھم

جائیں ان کی سوئیاں ایک ہی نکتے پر تھر تھرائی رہیں۔

پھر اس منظر میں سرخ جوتوں کا ایک جوڑا داخل

ہوا۔ وہ نوکدار جھیلے جوتے تک تک کرتے ان کی

جانب چلے آ رہے تھے۔ اس نے ذرا نظر اٹھائی تو ان

جوتوں میں زرد موم سے بنی ہوئی دو لال میٹکیں بھی

تھیں۔ وہ لڑکی ہسپانوی تھی جس کا قد عام ہسپانوی

عورتوں کی نسبت دراز تھا۔ اس کی رنگت اتنی زرد تھی

کہ دور سے دیکھنے پر وہ موی پتی معلوم ہوتی تھی۔ سیاہ

آنکھیں، باریک ہونٹ، ہلکی کی ہڈی ابھری ہوئی،

بالوں کو اس نے کسی عجیب سے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

اس کے جوتوں اور بالوں کا رنگ تقریباً یکساں تھا۔

قریب پہنچ کر وہ جھکی اور باریک ہونٹ اس کے گال

سے چپکا دیے۔

پر نیاں گنگ ہو کر وہ منظر دیکھتی رہی۔ اس کے حلق

میں آڑواہٹ گھلنے لگی تھی۔

”یہ البمار سیلو ہے اور الباس سے ملو۔ پر نیاں

آزک باستان سے۔“

وہ ہنسنی نہیں تھی۔ اس مختصر اسکرٹ میں اس کی

ٹانگیں بہت لمبی نظر آتی تھیں۔

اس نے پر نیاں پر ایک لالہ علق نگاہ ڈالی اور بولی۔

”جلدی سے اٹھ جاؤ۔ بہت سخت جھوک لگ رہی

ہے اور یہ بے ہودہ کمونو تار دو۔“

عام ہسپانویوں کی طرح وہ بھی ”ٹی“ کو ”تی“ اور ”

ڈی“ کو ”ڈی“ بولتی تھی اور ”آر“ کو ”رر“ اور ”اوا

کرتی تھیں۔

اس کی زرد موی ٹانگیں سورج کی نیکی شعاعوں

سے دکتی تھیں اور ان کی لشفک پر نیاں کی آنکھوں کو

غیر کر رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہڑبوا گیا تھا۔

”چلیں۔۔۔ مس بار سیلو۔“

جب وہ اسے لڑکے کے لیے ساتھ چلنے کی رسمی دعوت

دینے کے بعد سرخ بالوں والے موی مجسمے کا ہاتھ

تھاے رخصت ہوا تو وہ ہونٹ کھلتے ہوئے آنکھوں

میں تکی دھند کی چادر کو ہٹانے میں کوشاں تھی۔

”ہم پھر ملیں گے۔“

جاتے ہوئے اس نے کہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ

یہ ایک بے معنی فقرہ تھا۔ اس کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔

اس کی توجہ رہنے کے بیڑی جانب ہوئی، پیڑ تلے

مرہ گلابی تنگلیاں بکھری تھیں۔

وہ دونوں چھوٹے بچوں کی طرح اٹھکھلے

کرتے ہوئے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان

کی شوخ ہنسی ہوا میں علق رہ گئی تھی۔ ان لکھوں میں

وہ دنیا کی سب سے بد نصیب عورت تھی۔ اس سے

بڑھ کر کوئی تھی دماغ نہ تھا۔ ایک دیکھتے ہوئے لیس کے

سوا اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی کو

دیکھا اور اس کی سانس سینے میں اٹک گئی۔

بھونرے کو کچھ کی کے پھول سے ایسا عشق نہیں

ہو گا، جیسا حکیم بیگم کو مٹی کے باسنوں سے تھا۔ وہ

پہروں بیٹھی گیلی مٹی کے توڑوں سے الجھتی۔ انہیں اپنی

خوابوں کے قالب عطا کرنے کی کوشش کرتی۔ اپنے

خوابوں کو مٹی کے سانچوں میں ڈھالنے کی تدبیریں کرتی

۔ حکیم بیگم کی نگاہ میں مٹی نہیں تھی۔ اس کا عشق سچا

تھا۔ وہ ایک بچپوری کے ہاتھوں بے بس تھی۔

وہ بے ہنر تھی۔

اس کی انگلیوں سے تخلیق کے چشمے تو جاری ہوتے

تھے مگر وہ پہاڑی بھرنوں کی طرح منہ زور تھے۔ وہ حکیم

بیگم کے بس میں نہیں تھے۔ وہ آنسو بہانے لگتی تو

مندولابن جانا، صراحتی بنانے بیٹھی اور گاگر بنا ڈالتی۔

کوزے آڑے ٹیڑھے بنتے۔ برتن کی مگر یکساں نہ

رہتی۔ پینے چپے ہو جاتے۔ جب سے اس کے

ہاتھوں میں رشتہ اتر تھا معاملہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس

کی کا پتی انگلیوں سے لغزشوں پہ لغزشیں سرزد

ہوئیں۔ وہ کیڑے رنگ سے برتنوں پر گلی بونے

کاؤحتی اور لکیریں پھیل جاتیں۔ پتیاں اور ڈھل اک

دوے میں مدغم ہو کر بے معنی نقوش میں ڈھل

جاتے۔ یہ سب ناگامیاں اپنی جگہ مگر حکیم بیگم کے

استقلال میں کبھی فرق نہیں آیا تھا۔ ہر تربیت کے بعد

وہ نئے عزم سے برسرِ کار ہو جاتی۔

شروع شروع میں عراس کے پاس بیٹھ کر بڑی توجہ

سے گھومتے چاک اور قالب بدلتی گیلی مٹی کو نکالتا۔

وہ مشتاق نگاہوں سے منظر ریتا کہ اب مٹی کا بے

ڈھب تو کسی صورت میں ڈھلے گا۔ کوئی ناند، کٹورا،

کلسی یا ٹیبا۔ وہ حیرت سے مٹی کے مقدر کو بدلتے

ہوئے دیکھتا۔ پھر جب اس پر حکیم بیگم کے اناڑی پن کا

عقدہ کھلا تو اس کی دلچسپی خود بخود کم ہونے لگی۔ وہ اس

سے فرمائش کرتا۔

”بے جی! مجھے کجا بناوے میں اس میں ماسی چھوہاں

کی بلی کو دودھ پلاؤں گا۔“

وہ فوراً وعدہ کرتی اور جب آوا کھلتا تو ایک بینڈا سا برتن جو نہ مکمل گول ہوتا اور نہ پوری طرح چوکور اس کے ہاتھوں میں تھماتی اور اس کی طرف رائے طلب نظروں سے دیکھتی پھر اس کی آنکھوں میں مایوسی اور نا پسندی کی محسوس کر کے نادم سی ہو جاتی اور ایک لمبی آہ بھر کر اپنی تازہ تخلیق اس سے واپس لے لیتی۔ عمر سوچتا کہ وہ اب غدر ترانے کی۔ اپنی ناکامی کو بہانوں کی چادر تلے ڈھانپنے کی کوشش کرے گی جیسا اس نے جانی دینا پیش نہ کرتی۔ ہمیشہ بڑی سادگی سے اپنی شکست تسلیم کر لیتی۔

”اڑیا! ایس بڑی نکھی ہوں۔“

وہ سفید بالوں والے سرو کو تاسف سے ہلاتی۔

”میرا قصور ہے۔ سارا میرا قصور ہے۔ اللہ نے مجھے تھہ دیے۔ مجھے ان سے کم لینا ہی نہ آیا۔ پر میں پورا اٹل (زور) لگاتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں۔ جے ایک بھانڈا (برتن) وی ٹھیک بن گیا تے ساری کھچیل (مشقت) واسطہ مل جائے گا۔“

وہ حکیم بیگم کا ”اعتراف“ سن کر شرمندہ ہو جاتا اور اس کے نیلے ہاتھ ہاتھ کاٹتے ہیں بے جی۔ اس میں

تیرا کیا قصور۔“

وہ ہنس دیتی۔

”جیہڑی (جو) کو تابی آپ وچ ہو من لینی چاہی دی اے (چاہیے) اللہ بخشے میرا سو برا (سر) برائنامی کیار (کمبار) تھا۔ اس دے بنائے ہوئے بھانڈے دور دور پنڈوں سے لوک خرید کرنے آتے تھے۔ جد کوئی گاہک کسی بھانڈے میں نقص نکالتا یا کوئی بھانڈا پلا (کچا) نکل آتے میرا سو برا اکتا۔“

”میرے ہتھ کے گھرے ہوئے بھانڈے میں عیب نہیں ہو سکتا دیہ کیونے بنایا ہے چواری رکھ رہی ہے پر ہائی (ابھی تک) کم میں بچی ہے۔“ وہ جد بھانڈے بنا رہا ہوتا تے مجھے چاک کے نیڑے توں وی لنگھنے نہ دیتا

قریب پھٹنے نہ دیتا) اور ساری حیاتی اس نے مجھے ہنر نہ سکھایا۔ اللہ جانے کیوں۔ مجھے بڑا چاہ تھا اس کی شاگرد بنوں۔ ایک گل سن لے کا کا! میں تھہ ان ولی (اناڑی) سسی بے عقلی سسی پر میری نیت وچ کھوٹ نہیں میرے من وچ میل نہیں۔“

(میری نیت میں کھوٹ نہیں میرے من میں میل نہیں) یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور عمر کا دل ایک بے نام تاسف میں مبتلا ہو جاتا۔

اس کی مستقل مزاجی محض برتنوں تک محدود نہ تھی۔ کم و بیش سب معاملات میں وہ ایسی ہی تھی۔ اس کی اگلی بیٹی آمنہ جو عمر کی پیدائش سے بھی پہلے بیاہ کر امریکہ جا چکی تھی اور اپنے شوہر یوسف کے ساتھ جو رشتے میں حکیم بیگم کا گاہ بھانجا تھا، کبھی دو چار سال بعد اس سے ملنے آجاتی اور ہر تین ماہ بعد پھر رقم بھجواتی اور ایک خط بھی ہمراہ ہوتا جس میں چند مندرجہ نکلے الفاظ میں حکیم بیگم اور عمر کی خیریت دریافت کی جاتی اور اپنی خیریت سے آگاہی دی جاتی اس پر وہیں میں بسنے والی کے لیے وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس لیے نہیں کہ بیٹی کا جبر اسے رلاتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بیٹی بے اولاد تھی۔

عمر نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اسے ہر نماز میں روتے بلکتے دیکھا تھا۔ چاہے وہ دنیا کا ہر کام بھول جاتی پر آمنہ کی اولاد کے لیے دعا مانگتا نہ بھولتی۔ کبھی جب وہ اس کی زاریوں سے اوب جاتا اور اسے حکیم بیگم کی ”ڈھٹائی“ پر غصہ آنے لگتا تو وہ جھنجھلا کر پوچھتا۔

”آمنہ باجی کی شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں؟“ وہ پہلے انگلیوں کی پوچھ پر کتنی پھر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس دیوار کو دیکھتی جس پر وہ ہر سال محرم کی پہلی تاریخ کو کیوے رنگ سے ایک لکیر کھینچ دیتی تھی۔

”بارہ ورے (سال)۔“

”اچھا یہ بتا بارہ سالوں میں تو نے کتنی بار اللہ سے کہا ہے کہ وہ باجی کو بچہ دے دے۔“

”سدا ینا مجھ غنوار نوں اتنا حساب کتاب کتاب کہاں آتا ہے۔“

”اللہ نے تیری بات مانی ہوتی تو وہ اب تک مان گیا ہوتا۔ تو بھٹکتا ہے۔ وہ تو نہیں تو اتنی بار اسے کیوں یاد کراتی ہے اور تو بھٹکتی بھی نہیں۔“

وہ اسے یوں سمجھانے لگتا جیسے وہ کوئی نادان بچی ہو۔

”میرا کم اے مگنا۔ میں مانگتی رہوں گی۔ وہ دے نہ دے اس سوچنے کی مرضی میں اپنے کم وچ کو تابی کیوں کروں۔“ وہ اس کی کم عقلی پر کڑھتا رہتا۔

ایک دوسرے حکیم بیگم اپنے میں ات پت چاک سے انھی تو بہت مجبوش تھی۔ اس نے عمر کو بلا کر ایک نہایت خوب صورت پیالہ دکھایا جو اس نے ابھی ابھی چاک سے اتار کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھا تھا۔ پیالے کی بناوٹ میں ایسی عمدگی تھی کہ عمر کو تین ہی نہ آتا تھا وہ حکیم بیگم نے بنایا ہے۔

”جد آوے سے نکال کر پھیل بوئے بناؤں گی تو کیسا روپ لکھے گا۔ بس تو ایس وچ دودھ پیا کرنا۔ آج تو یوں کہ میں بچی (بے ہنر) نہیں۔“

خوشی کے مارے اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔

وہ ہانڈی پکانے چولے کے آگے جا بیٹھی اور عمر وہیں کھیلے برتنوں کی قطاروں کے قریب زمین پر کوسلے سے لکھنے لگا۔

معا ”موسم رنگ بدلنے لگا اور بادلوں کے سرمئی ہاتھوں نے سورج کا کندنی چہرہ ڈھانپ دیا۔ حکیم بیگم کی ہدایت پر اس نے ایک ایک کر کے سارے برتن احتیاط سے اٹھا کر چھپر تلے ترتیب سے رکھ دیے۔ چند لمحوں بعد آسمان کے پیالے سے کھٹی کھٹی بوندیں گریں جیسے حلوائی کے تھال سے چند نکھٹا کناروں سے لچھل چائیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا تھال الٹ پڑا۔ چھپر چھپر بارش کے جھینے دھرنی سے ٹکرا کر اچھلتے اور چھپر تلے رکھے گلی مٹی کے برتنوں پر دم دم نشان چھوڑ جاتے عمر کے دل میں جانے کیا آئی۔ اس نے اوک

میں بارش کا پانی بھرا اور اس کو زے میں چند قطرے گرا دیے جس کو بتا کر حکیم بیگم بجاطور پر نخر کے احساس میں گھری تھی۔

کو زے میں پانی کے قطروں نے چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنا دیے تو اسے یہ منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی اوک میں پانی بھر بھر کے کو زے میں انڈیلتا رہا پھر اس نے حکیم بیگم کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے وہ پیالہ اٹھا کر اوتی (پچھرا کنارا) تلے دھر دیا۔ بارش کی بوندیں اوتی سے چپکتی ہوئی پیالے میں گرتی رہیں اور چھوٹے بڑے گڑھے اور بہیم سی لکیریں بنتی جتی رہیں۔

اسے یہ کھیل بڑا دلچسپ لگ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ بعد میں ٹھیک کر ان نشانات کو مٹا دے گا جو بارش کے پانی سے کو زے کے بدن پر بن رہے تھے۔ پیالے کو دیکھتے ہوئے چھپر کی میسا بھی پر بازو پٹیت کر وہ گول دائرے میں گھومنے لگا اور سالوں کا ایک گیت گانے لگا۔ کچھ لمحوں کے لیے اس نے آنکھوں سے نظریں ہٹائیں اور جب دوبارہ اسے دیکھا تو ٹھنک کر چسکی سے ہاتھ ہٹا لیے۔ اب وہ بارش کی بوندوں سے پھسلنے لگا تھا۔

نیت بدل رہا تھا۔ اس کی صورت بگڑ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ وہ اسے نیت ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پچھڑ کے بے شکل لوٹھڑے میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے بے ضرر کھیل نے کیسا غضب ڈھایا تھا۔ اس کی دل گرفتگی بے انت تھی۔



صوفیہ پچھلے اندرہ منٹ سے نشست کے پتھر پر کہنی ٹکا کر اوتی اور تھیل پر چڑھتا ہے اوگھ رہی تھی۔ یوں تو اسے سب مضامین ناپسند تھے مگر کیکلکوس سے اسے خاص طور پر نفرت تھی۔

رجرڈ ایفلک جو اعداد اور علامات وائٹ بورڈ پر لکھ

رہا تھا، ان کی حیثیت صوفیہ کے نزدیک روشنائی سے بنائی گئی کپڑے کوڑوں کی شبیہوں سے زیادہ نہیں تھی۔ جب سے کلاس شروع ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی رچرڈ ایفلک کی مدغم آواز یا اس کے سرعت سے چلتے ہاتھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے جاگتے رہنے کی شعوری کوشش کی تو وہ ایسی گہری نیند میں چلی جائے گی کہ اس کے نشست سے گرنے کا بھی امکان تھا۔ ویسے بھی رچرڈ اسے کھلکھولس کا استاد کم اور ماہر نویت زیادہ لگتا تھا جو اپنے مریضوں سے خواب ناک آواز میں پرسکون ہو جانے اور نیند میں چلے جانے کی فرمائش دوہرا کرتا۔

”تمہیں نیند آرہی ہے۔۔۔ تم سونا چاہتے ہو۔۔۔ تمہارے اعصاب تھک چکے ہیں انہیں آرام چاہیے۔۔۔“

کھلکھولس کی کلاس میں سونے والی اور دیگر مصوفیات تلاش کرنے والی وہ تما نہیں تھی۔ پوری کلاس میں شاید ہی کوئی رچرڈ ایفلک کو دھیان سے سن رہا تھا۔ یوں بھی وہ جس پبلک ہائی اسکول میں پڑھتی تھی وہاں طلباء کی بڑی تعداد دوسرے اسکولوں سے نکالے گئے یا وہ تھے جنہیں کوئی اچھا اسکول قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بہت سے منشیات کے عادی اور سابقہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے بھی وہاں پڑھ رہے تھے۔ ایک معقول تعداد ایسے طلباء پر مشتمل تھی جو یا تو غیر شادی شدہ والدین تھے یا اس فہرست میں شمار ہونے کی توقع رکھتے تھے۔

اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی جسیکا عقب میں کیلی کے ساتھ مستقبل کے منصوبے بنات رہی تھی۔ اسے ان کے مستقبل یا منصوبوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے پروا تھی تو اپنی نیند کی جس میں وہ مسلسل غفل انداز میں رہی تھیں۔

”میں تو ہمیشہ سے ہارڈ لاء گریجویٹ بننے کے خواب دیکھتی رہی ہوں۔“ جسیکا نے ایک طویل آہ بھری۔

”مگر حسب سے ڈیڈی تیری بار جیل گئے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔“

”نکتے دکھ کی بات ہے۔“ کیلی نے آواز میں تاسف پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ پھر گفتگو میں ایسا موڑ آیا جب کیلی اپنے پرنگائی بوائے فرینڈ کے ساتھ تہائی میں ملاقاتوں کا احوال سرگوشیوں میں سناتے لگی اور ایسی ہی ایک ملاقات میں کسی ”شرارت“ کا ذکر چلا تھا کہ دونوں نے ایک آہنگ ہو کر بلند ققمہ لگایا جس نے رچرڈ کی توجہ ان کی جانب مبذول کروادی تھی۔ وہ وائٹ بورڈ سے ہٹ کر انہیں کلاس روم میں بیٹھنے کے اطوار اور اخلاقیات پر تفصیلی لیکچر دینے لگا تو مجبوراً ”صوفیہ کو بھی آنکھیں کھول کر اور قدرے سیدھا ہو کر بیٹھنا پڑا۔“

جسیکا نے رچرڈ کو کوئی اہمیت دیے بنا کیلی سے ادھوری بات پوری کرنے کو کیا۔

”آگے بتاؤ نا پھر کیا ہوا؟“

”بعد میں بتاؤں گی۔ اس کو اس نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔ صوفیہ!“ اچانک کیلی نے اسے پکار لیا۔

”تم نے کبھی نہیں بتایا کہ ہائی اسکول کے بعد تم نے کیا کرنے کا سوچ رکھا ہے۔ کیا تم بھی اپنی ماں کی طرح مشہور اور آکا رہنا چاہتی ہو۔“

اس نے مشہور کہتے ہوئے منہ کو جیسے لگاڑا تھا۔ اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ اس کی ماں کو کوئی رکیک گالی دے لیتی۔ وہ صوفیہ کو کبھی مخاطب نہیں کرتی تھی اور اگر کرتی تو صرف طنز کرنے کے لیے۔

صوفیہ نے اس کا فقرہ پورا ہونے سے قبل اسے اپنے متوقع مستقبل سے آگاہ کر دیا تھا اور جو کچھ وہ کرنا چاہتی تھی اسے سن کر ان دونوں کے منہ پسلے کھلے اور پھر غلے جڑے ڈھیلے ہو کر گر گئے۔

”کیلی! کیا اس نے حقیقتاً“ وہی کہا ہے جو میں سمجھ رہی ہوں؟“

جسیکا کے سوال کا جواب کیلی کی بجائے صوفیہ نے دیا تھا۔

”میں Hooker بنوں گی، یہی میری خواہش ہے۔“

شاید وہ مذاق کر رہی تھی۔ ان دونوں کو یہ خیال ایک ساتھ ہی سوجھا تھا مگر انہیں فوراً اسے رد کرنا پڑا۔ وہ جانتی تھیں، صوفیہ کبھی مذاق نہیں کرتی تھی۔

”لیکن کیوں؟“

”میں اپنے باپ اور اس کے خدا کو بتانا چاہتی ہوں کہ یہ میری زندگی ہے۔ صرف میری۔ اور میں اس کے ساتھ جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ ان دونوں میں سے کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“ کیلی نے الجھ کر استفسار کیا۔

ان دونوں کو حیران ہونے کا موقع دے کر وہ جیروم کی بات سننے لگی تھی جو اس کی طرف ایک تہہ کیا ہوا کانڈ بڑھا رہا تھا۔

”کیا ہے یہ؟“ اس نے کانڈ لیتے ہوئے اس سمت دیکھا، جیروم نے اشارہ کیا تھا۔

دروازے میں استاد کارل میکار تھی نے نظروں کا ملاپ ہونے پر آنکھ کا کونہ دبایا تھا اور ہاتھ ہلا کر پلیٹ گیا تھا۔

وہ کانڈ کی تحریر پڑھنے لگی۔

”ٹھیک بارہ بجے مجھے پروجیکشن روم میں ملو۔ لیٹ مت ہونا۔“

اس نے رسٹ وایج دیکھی۔ بارہ بجتے میں چند منٹ باقی تھے۔ رچرڈ ایفلک کا لیکچر انتہائی مراحل میں تھا۔

اس نے بیگ سے وکٹر ہیگو کا دی پنچ بیگ آف نوٹرے ڈیم نکالا اور درمیان سے کھول کر سطور پر سرسری نظر دوڑاتے لگی۔ اس نے یہ ناول پڑھ رکھا تھا اور ان لمحات میں ورق گردانی کا مقصد محض وقت گزاری تھا۔

کچھ دیر تک اور اراق پلٹتے رہنے کے بعد اس نے دوبارہ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو بارہ بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ ناول کو بیگ میں رکھتے ہوئے وہ نشست سے اٹھ گئی، کسی سے کچھ کہے بنا کلاس روم سے باہر نکلی اور

نہایت سست روی سے قدم گھسیٹتی ہوئی دائیں جانب بڑھنے لگی۔

پروجیکشن جیمبر، ڈیوڈ ایم ہال کے اوپر ایک مختصر سے کمرے میں بنایا گیا تھا۔ دروازہ کھیل کر صوفیہ اندر داخل ہوئی تو وہ ایک گوشے میں پڑی میز پر بیٹھا تھا اور خاصا برہم نظر آتا تھا۔

”تم بہت دیر سے آئی ہو۔ شاید تم نے میرا پیغام غور سے نہیں پڑھا۔“

”میں نے پڑھا تھا۔ میں جان بوجھ کر دیر سے آئی ہوں۔“ وہ حیرت سے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔

کارل میکار تھی مقامی کالج کی فٹ بال ٹیم کا کوارٹر بیگ تھا۔ پانچ فٹ دس انچ قد، مضبوط کاٹھی، چہرہ قدرے لمبوتر، رخساروں کی ہڈیاں ذرا سی ابھری ہوئی، گہری نیلی آنکھیں اور ٹھوڑی کے وسط میں زخم کا ترچھا نشان وہ لڑکیوں میں پُرکشش ترین مجرّم کے طور پر مشہور تھا۔

وہ کسی لڑکی کو دیکھ کر مسکراتا تو جواباً اسے ققمے سے نوازا جاتا۔ وہ ہاتھ ملانے کی بات کرتا تو لڑکیاں گلے لگنے کی کوشش کرتیں۔

وہ اپنی تمام خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ایسے میں صوفیہ جیسی خست حال لڑکی، جس کا کوئی بوائے فرینڈ یا گریل فرینڈ بھی نہ ہو، کا اسے جان بوجھ کر انتظار کروانا یقیناً باعث حیرت تھا۔ اگرچہ وہ بہت خوب صورت تھی لیکن یہ کوئی ایسی قابلیت نہیں تھی جس پر یوں اترا یا جائے اس کے علاوہ بھی بہت سی لڑکیاں خوب صورت تھیں۔

صوفیہ میں اس کی دلچسپی اس روز پیدا ہوئی تھی جب وہ ایک دوست کی طرف سے دی جانے والی Thanksgiving اپنی میں شریک تھا۔ اس نے صوفیہ کو میز کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں Pumpkin Pie کا ایک مختصر ٹکڑا رکھے فورک کی مدد سے اسے مسلسل کھتا رہی تھی اور ایک بار بھی ان کی گفتگو میں شامل نہیں

ہوئی تھی۔ کارل کا جی چاہا اور ہوا تو بولے اور اس نے کئی بار اسے بات چیت میں ٹھیسے کی کوشش بھی کی البتہ وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن جب وہ بولی تو بے اختیار کارل کو اپنی اس خواہش پر بچھتا ہوا ساری کے اختتام پر جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو کارل نے میزبان مارٹن پر احسان جتانے کے لیے کہا۔

”میں آج اونٹا ریو میں مدعو تھا۔ سلیپنا نے تھینکس گوٹ کے لیے صرف مجھے بلایا تھا اس کا واحد سہمان اس وقت۔“

صوفیہ نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

”کینڈا میں تھینکس گوٹنگ اکتوبر کے دوسرے ہیر کو منایا جاتا ہے اور آج نومبر کا آخری جمعرات ہے۔“

کارل کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ سب لوگ خاموش ہو کر اسے غور رہے تھے۔ اس کی بہت سی ہوئی تھی اس کے لیے وہاں مزید ایک لمحہ گزارنا دوبارہ ہو گیا تھا۔ وہ اسپورٹس کار سڑک پر لے کر آیا تو صوفیہ فٹ پاتھ پر بائیکل چلائی ہوئی نظر آئی۔ کارل نے اس کے برابر لاکر کار کو ذرا سا ہلایا اور ترچھا کر کے فٹ پاتھ پر چڑھا دیا۔ کار اسے چھو کر واپس سڑک پر آ گئی تھی۔ صوفیہ دھچکا لگنے سے گری ضرور تھی مگر اس نے اٹھنے میں اتنی پھرتی دکھائی تھی جیسے گری ہی نہ ہو۔ وہ بھاگتی ہوئی سڑک پر آئی اور کوئی وزنی شے کار کی جانب پوری قوت سے اچھال دی۔ شیشہ چھنا کے دار آواز سے ٹوٹ گیا تھا۔

کارل کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ وزنی شے دراصل سنگ مرمر سے بنا ہوا ایک آرائشی مجسمہ تھا جو مارٹن کے گھر سے آئے ہوئے صوفیہ نے سب کے سامنے ایسی ہشاری سے اٹھالیا تھا کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔

وہ کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکلا اور اسے گالی دینے کے لیے منہ کھول ہی رہا تھا کہ وہ برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی قریب آئی اور اس کے گال پر

زوردار تھپڑ مارنے کے بعد ایک لمحہ رکے بغیر پہلے سے بھی زیادہ رفتار سے دوڑ کر فٹ پاتھ پر پہنچی مگر یہ ہوئی بائیکل سیدھی کی اور چند لمحوں بعد اندھیرے میں کھو گئی۔ کارل نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہکا بکا وہیں سڑک پر کھڑا رہ گیا تھا۔

اس واقعے کے چند دن بعد اس نے صوفیہ کو ایک فٹ پاتھ اسٹور میں دیکھا تھا اور اس پر پہلی نظر پڑتے ہی کارل کو شک گزرا تھا کہ وہ خریداری تو کرنا چاہتی تھی مگر کسی کے علم میں لائے بغیر۔ وہ مختلف کاؤنٹرز کے درمیان گھومتے ہوئے بار بار کلوز سرکٹ ٹی وی سیٹ کی اسکرین کو جس انداز سے دیکھ رہی تھی وہ اس کے ارادے ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ وہاں کچھ چیزیں خریدنے آیا تھا مگر اس نے صوفیہ کی براسرار سرکرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے اس ارادے کو کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

کافی دیر ادھر سے ادھر پھرتے رہنے کے بعد صوفیہ کی نظر انتخاب چواری کے ایک کاؤنٹر پر ٹھہری۔ وہ لیڈر برہسلٹ نکلا کر دیکھنے لگی تھی۔ کارل اس کے قریب ہی ایک دوسرے کاؤنٹر پر مڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے جازہ لینے میں مصروف تھا لیکن اس کا دھیان پوری طرح صوفیہ کی جانب تھا۔ اس نے بی کیب ترچھی کر کے پیشانی پر ایسے جھکا لیا تھا کہ اس کی آنکھیں اور چہرے کا کچھ حصہ عجیب کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ ہمیں چاہتا تھا کہ صوفیہ اسے وہاں دیکھ کر چونک جائے۔

وہ اسے رکتے ہاتھوں پکڑوانے کا خواہاں تھا۔ وہ نہایت تحمل کے ساتھ صوفیہ اور سلیز گرل کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا اور صوفیہ کے برہسلٹ پر کھتے ہاتھوں کی ایک ایک جنبش دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد کارل نے اسے کچھ برہسلٹ ایک ساتھ کاؤنٹر سے اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ انہیں آنکھوں سے قریب لاکر ایسے اٹھا کر سے جانچنے لگی تھی جیسے ان کا مقابلہ ”موازنہ کر رہی ہو۔ اسی معانفے کے دوران اسے زوردار چھینک آئی اور کچھ برہسلٹ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گرے کارل یقین سے نہیں کہہ

سکتا تھا کہ وہ چھینک مصنوعی تھی۔ لیکن لاشعوری طور پر اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

”میں معذرت چاہتی ہوں۔ یہ بے ہودہ فلو۔“

صوفیہ نے ٹاک رگڑتے ہوئے باقی ماندہ برہسلٹ کاؤنٹر پر رکھے اور تیزی سے نیچے جھکی۔ اس نے سیدھا ہونے اور گرے ہوئے برہسلٹ سلیز گرل کے حوالے کرنے میں محض چند سیکنڈ صرف کیے تھے مگر یہ چند سیکنڈ ہر حال وہ کمرے کی آنکھ سے اوجھل رہی تھی۔ یہ سب اگرچہ بہت تیزی میں ہوا تھا لیکن کارل اس کے کارڈیگن کی آستین سے جھانکتا ہوا سنہری زنجیر کا سرا دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اٹھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں آ سکا۔“ وہ بیزار صورت والی سلیز گرل سے رخصت ہو کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھی تو کارل دانستہ اس کے راستے میں آ گیا۔

صوفیہ نے اس پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی اور کتراکر گزر گئی۔

”گتا سے بہت جلدی میں ہو۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ کارل نے اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کی۔

وہ یکدم ہچکری گئی۔

”دور رہو۔ میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔“

”وہ بات بھی نہیں جو۔ ایک سنہری برہسلٹ کے بارے میں ہے۔“ وہ چند لمحے کارل کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر اسے چھینک آئی جو فنی اعتبار سے پہلی چھینک سے زیادہ حقیقی محسوس ہوئی تھی۔

”تمہارے پاس رومال ہو گا؟“

کارل کے ہونٹوں پر زہرناک تبسم نے کروٹ لی۔

”یہ فلو بڑی لعنتی شے ہے۔“

وہ اپنے ٹراؤزر کی جیبیں ٹٹولنے لگا اور صوفیہ اس کے قریب آکر سرگوشی میں بولی۔

”اگر تم اپنی زبان بند رکھو تو میں اپنے سابقہ رویے کا لالہ کرنے کو تیار ہوں۔“

وہ بات کرتے ہوئے یوں اس کا کارل سنوارنے لگی تھی جیسے وہ دونوں گھرے دوست ہوں۔

”مجھے منظور نہیں ہے۔“ کارل اس کا ہاتھ جھٹک کر نخوت سے بولا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“

اس نے کندھے اچکائے اور تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے کی طرف چل دی۔

کارل کو اس کے پرسکون انداز نے سخت سلگایا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر گارڈ کو بکارنے لگا۔

کارل کے لگائے ہوئے الزام کی تصدیق کے لیے اسٹور کے فیچر نے صوفیہ کو تلاشی دینے کے لیے کہا۔ پہلے تو اس نے سخت احتجاج کیا اور کارل کو ایسی ایسی گالیاں دیں جنہیں سن کر کسی کو بھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ وہ صوفیہ جیسی عموماً اور معصوم صورت لڑکی کے منہ سے برآمد ہوئی تھیں۔

فٹ پاتھ اسٹور میں موجود تمام لوگ دیگر مصروفیات ترک کر کے اسی کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ جب وہ ہینڈ بیگ میں موجود سامان فرش پر ڈھیر کرنے لگی تو کارل نے گارڈ کو اشارے سے بتایا کہ برہسلٹ اس نے کہاں چھپایا تھا۔ جس پر اس نے جھنجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی اور قریبی کاؤنٹر پر موجود بھاری تن و توش والی سیاہ فام سلیز گرل سے صوفیہ کی تلاشی لینے کی درخواست کی۔ سلیز گرل اسے ساتھ لے کر لیڈر روم میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئیں اور سلیز گرل نے بتایا کہ اس سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا تو مغالطہ تازہ کا سلسلہ صوفیہ کی زبان سے جاری ہو گیا۔ اس نے منبر کی معذرت سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کارل کے کم و بیش سارے خاندان کا اس نے ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ بے اختیار وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اتنے گھناؤنے کروار شاید ابھی تک ہالی وڈ کی کسی فلم میں بھی تخلیق نہیں کیے گئے

ہوں گے۔ آخر کار میجر کو داخلہ کرنا پڑی۔
”آپ لوگوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہے تو یا ہر جا کر حل کریں۔ میں آپ دونوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسٹور سے چلے جائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔“

”تم بھی اس کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔ بوڑھے گدھ۔ میں تم پر ہتک عزت کا دعوہ کروں گی۔ میرے وکیل کی طرف سے لیگل نوٹس کا انتظار کرنا۔“
وہ میجر کو دھمکا کر ہٹا دیا۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد کارل باہر نکلا تو وہ اس کی منتظر تھی۔ فٹ پاتھ پر آتے ہوئے اسے محفوظ ہوتے ہوئے اس نے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ کارل کی جانب اچھالی تھی۔ وہ ڈھیلے قدموں سے چل کر اس کے قریب پہنچا اور چند ثنائے بغور اسے دیکھا رہا۔ وہ حیرت انگیز طور پر پرسکون نظر آتی تھی۔
”آخر تم کیا شے ہو؟“

کارل نے بے بسی سے شانے اچکائے۔
”میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن اتنا تو بتا دو کہ وہ ہسپتال تم نے کہاں چھپایا تھا۔ سیزرگزل کو کیوں نہیں مل سکا؟“

ایک پر اسرار مسکراہٹ نے صوفیہ کے چہرے کا احاطہ کیا۔

”وہ میرے پاس ہوتا تو اسے ملتا بھی۔“

”تو پھر؟“

”وہ تمہارا پاس ہے۔“

”میرے پاس؟“

کارل نے اچھے سے اسے دیکھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ وہ میں نے تمہارے سویٹر کے کارل میں اڑا دیا تھا۔“

اس دن کے بعد ان کے مابین تعلق ایک نیا رخ اختیار کر گیا۔ مختصر سی ملاقاتیں جن کے لیے خاص طور پر فرصت ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ سربراہ پہلو ہائے کبھی کبھار کارل اسے اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر اپنی اسپورٹس کار میں لفٹ دے دیتا اور وہ کوئی

عام اسپورٹس کار نہ تھی۔ اس میں بیٹھنا لڑکیاں اپنے لیے اعزاز گردانتی تھیں۔ صوفیہ کو خبر تھی کہ کارل کی گرل فرینڈ کی صحیح تعداد کسی کو معلوم نہیں تھی۔ تا حال وہ خود اس فہرست میں شامل تو نہیں ہوتی تھی لیکن اتنا بھی غنیمت تھا کہ کارل کے التفات کے باعث وہ دیگر لڑکوں کے لیے اہم ہو گئی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک خاص حد سے زیادہ میل جول رکھنے سے کارل کے ”درجات“ میں کمی واقع ہو سکتی تھی کیونکہ وہ اس ”معیار“ پر ہرگز پوری نہیں اترتی تھی جو کارل میکار تھی کی گرل فرینڈ ہونے کے لیے مطلوب تھا۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود وہ کارل کو آدھا گھنڈہ انتظار کروانے کے بعد پرو جیکشن جیمبر میں آئی تھی اور یہ بات اسے نہایت سرد مہمی سے بتا بھی رہی تھی۔

”لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟“

وہ اچھل کر میز سے نیچے اتر آئی تھی۔

”شاید وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہیں جرات کسے ہوئی۔“ صوفیہ نے ایک لمحہ اس کی سسکی ہوئی تھی۔

”بھنوں کو دیکھا اور ہمارے لیے میں بولی۔“

”تم میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد نہیں ہو۔“

یہ سفید جھوٹ تھا اور کارل کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے ان سے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ اس بات کی سچائی پر ایمان نہیں لایا تھا لیکن اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔

”میں عمر میں بھی تم سے بڑی ہوں۔ ہمارے گھر پلو حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ میری اسکول کی پڑھائی بہت دیر سے شروع ہوئی۔“

”تو؟“ کارل نے الجھ کر پوچھا۔

”تو یہ کہ میں ان معاملات کو تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ محبت کا کھیل میں نے بہت کھیلا ہے۔ میں جانتی ہوں تم نے مجھے کسی مستوران میں ڈنر پر کیوں نہیں مدعو کیا اور جارڈن ہائی اسکول کے دور افتادہ گوشے میں اس ساؤنڈ پروف، ٹھنڈے ذرا اور بوسیدہ

پرو جیکشن روم میں کیوں بلایا ہے۔“
کارل کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں سمجھتی ہوں کہ تم مجھ جیسی معمولی لڑکی کے ساتھ کھلے عام گھوم پھر نہیں سکتے۔ تمہاری شخصیت کی توہین کرنے کے مترادف ہو گا۔ لیکن تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہو تا کہ ایک لڑکی تمہاری زندگی میں آئے اور تمہاری فتوحات میں شمار ہونے سے رہ جائے۔ تم اس سے کچھ فیض نہ اٹھا سکو۔ تم ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہو مسٹر میکار تھی، لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے انتخاب کرنے میں غلطی کی ہے۔ میں ترنوالہ نہیں۔“

”بند کرو اپنی بکواس۔ تم بالکل ہو کیا۔“

کارل کے بھاری جڑے سختی سے بھجنے ہوئے تھے لیکن اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی پسینے کی بوندیں صوفیہ کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکی تھیں۔

”میں نے تمہیں اس لیے آدھا گھنڈہ انتظار کروایا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے تڑپ پیدا ہو۔ میں چاہتی ہوں میں تم سے جتنی بے نیاز ہوں گی اسی قدر تم میری طرف مائل ہوتے جاؤ گے۔“

یہ بات اس نے گرانٹ اور البارہ مار سیلو سے سیکھی تھی۔

اسے یاد نہیں تھا گرانٹ کی کوئی بھی دعا کبھی قبول ہوئی ہو مگر وہ ہر بار رد کے جانے کے بعد اور بھی شدت سے خدا کے سامنے گڑگڑاتا۔ بھکاریوں کی طرح فریادیں کرتا۔ جس قدر خدا اس سے بے نیاز تھا اسی

درجہ وہ خدا کے قرب کے لیے تڑپتا تھا۔

اور البارہ مار سیلو جو مرن گھڑی تک گرانٹ سے محبت کی بھیک مانگتی رہی۔ اس کی محبت کی جتنی تذلیل گرانٹ نے کی تھی اگر اس میں ذرا بھی عزت نفس ہوتی تو اس کے منہ پر تھوک کر اس کی زندگی سے نکل جاتی مگر ہر بار ٹھکرائے جانے پر وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ گرانٹ کو اپنی تذلیل کرنے کی دعوت دیتی۔

”ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟“

کارل کی آواز ایک بلی بلی غراہٹ سے مشابہہ تھی۔

”وہی بتانے لگی ہوں۔ دیکھو کارل تم پورے والٹس میں کیس بھی کسی کو بک کر دو گے تو وہ تم سے بیس سے تیس Bucks خارج کرے گی لیکن میں چونکہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں اور میں نے کسی سڑک پر آوارہ گھومتے ہوئے خود کو تمہیں پیش نہیں کیا اس لیے میرے وقت کی قیمت زیادہ ہوگی۔“

وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا کہ صوفیہ نے ہاتھ اٹھا کر ٹوک دیا۔

”میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی اور یہ بتانے کی زحمت بالکل نہ اٹھانا کہ تمہیں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں اور لڑکیاں تم پر رقم خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ میں ان تمام لڑکیوں سے مختلف ہوں اور تم مجھے کھوتا نہیں چاہتے۔ کسی اچھے رستوران میں دو لوگوں کے ڈنر کا جتنا ملتا بیٹا ہے۔ وہ تم مجھے دے دو لیکن رستوران کا انتخاب میں کروں گی اور ان سب معاملات کی قیمت بتا دوں گی۔“

”صوفیہ! تمہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ تم اتنے غصے میں کیوں ہو۔“

”میں غصے میں نہیں ہوں۔ دیکھو میں مسکرا بھی رہی ہوں۔“ اس نے ہونٹوں کو پھیل کر عجیب استنزاء سے کہا تھا۔

”اچھا تم بیٹھ تو جاؤ۔ میں نے ملاقات کے لیے کسی قدر روٹائی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ تم نے داد بھی نہیں دی۔ مجھے معلوم ہے تم مذاق کر رہی ہو اور وہ بھی اس صدی کا سب سے بھونڈا مذاق۔“

کارل اسے میز کی سمت لے جانے لگا تو صوفیہ نے اس کا ہاتھ سختی سے ہٹا دیا اور آگے بڑھ کر میز سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

کارل کو صوفیہ یقین تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی ہے لیکن اس نے ایک اور بینر ابلانے کا فیصلہ کیا چاہے وہ مختلف بھی اور اسے ہنڈل کرنا آسان نہیں تھا مگر وہ بھی کوئی آناڑی اور جذباتی قسم کا عاشق نہیں تھا۔ اسے

معلوم تھا کہ تعریف ایک ایسی آگ تھی جو پتھر سے بنی ہوئی عورت کو بھی موم کی طرح پگھلا سکتی ہے۔ وہ صوفیہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے گہری سانس لے لیا۔ آنکھوں کو قدرتی پھیلاؤ سے ذرا سناپا دھیرا پھیلا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کا یہ انداز لڑکیوں کے دل پر ہمیشہ بجلی بن کر گر جاتا تھا۔

”صوفیہ! میری آنکھوں میں دیکھو۔“

اس نے آواز کو گہرے بنا کر سرگوشی کی۔

”تمہارے منہ سے گھٹیا تمہا کو کی بو آرہی ہے۔“

صوفیہ کا جواب اس کے لیے طمانچہ تھا۔ لہجے میں اسے چند لمبے لگے تھے۔

اسی واہیات لڑکی سے زیادہ گھٹیا بھی کوئی شے ہو سکتی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ وہ کتنے منگے برائے کے سرگرم پیتا تھا اور اس کے ہونٹوں سے پھوٹی تہا کو کی مہک اس کی مردانہ دلکشی میں کتنا اضافہ کرتی تھی خیر۔ وہ کہ نہ کسی طرح اس دھچکے کو مسہا گیا۔ اپنے کھولتے ہوئے دماغ کو تھک کر بولا۔

”تم کو تو میں تمہارے جوتے اتار دوں۔ میں نے سنا ہے کہ ہسپانوی عورتوں کے پاؤں بہت حسین ہوتے ہیں۔ میں پر کھنا چاہتا ہوں کہ میں نے سچ سنا ہے۔“

”میری ماں ہسپانوی تھی۔ میں اپنی زندگی میں کبھی اسپین نہیں گئی۔“ وہ ایک ہنسنے سے سیدھا ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ صوفیہ پر پھپھو کی بارش کر دے۔

”ابھی تمہارے پاس کچھ رقم ہے یا ہم بعد میں ملیں۔“

وہ ناٹکس جھلاتے ہوئے شدید بیزاری کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”صوفیہ! یہ کیا ہے ہو دی ہے۔ میں بھی تمہاری طرح اسٹوڈنٹ ہوں اور میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہوتی۔ ڈیڑی مجھے بہت تھوڑے۔“

”تمہارے ڈیڑی جس لاء رقم میں پارٹنر ہیں وہ

کلائنٹس کو لوٹنے کے لیے بدنام ہے۔ تمہاری پھوٹی بہن جس پرائیویٹ اسکول میں پڑھتی ہے وہاں ماہانہ ٹیوشن فیس ایک سو پینتالیس ڈالر وصول کی جاتی ہے۔ اور تمہارے پاس جو۔۔۔ نینٹلے ہے۔ اس کی قیمت مارکیٹ میں ایک سو نوے ہزار ڈالر ہے۔“

کابل کو اس کی معلومات پر حیرت نہیں ہوئی۔ اس سے کچھ بھی بعد نہیں تھا۔

”تم چاکلیٹ کھاؤ گے؟ میرے بیگ میں ہے۔“

اسکول سے واپس آ کر وہ مہیپل کے پارٹمنٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑھڑانے لگی تھی۔

دروازہ جو خفیہ کھلا وہ مہیپل کو ایک طرف دھکیل کر اندر گھس گئی۔ وہ بہت غلٹ میں لگتی تھی۔

”مہیپل! یہاں آؤ۔ جلدی کرو۔“

مہیپل اسے تیزی سے جوتے اور جرابیں اتارنے کی کوشش میں ایک ٹانگ پر اچھلتے دیکھ کر پورا منہ کھول کر ہنسنے لگا تھا۔

”یہ دیکھو مہیپل۔“ وہ دائروں میں گھومنے لگی۔

پہلے خاموش ہو کر اسے گھورنے لگا تھا۔

”پہلے دیکھو میرے پاؤں۔“

وہ کسی نیلے رنگ کی طرح اسکرٹ کے دونوں کونے اٹھائے پاؤں کے بچوں پر گھوم رہی تھی۔

”تمہیں پتہ ہے ہسپانوی عورتوں کے پاؤں دنیا میں سب سے حسین ہوتے ہیں۔ دیکھو ناں پہلے میرے پاؤں کتنے حسین ہیں۔۔۔ تمہیں تو پتہ ہی نہیں میں بھی ہسپانوی ہوں۔۔۔ میرے پاؤں۔۔۔ آہ میرے پاؤں۔“

گھومتے گھومتے وہ دم سے گری اور یوں ساکت ہو گئی جیسے اس کے تن سے روح نکل گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

میکھ گھام (بادلوں کے باعث جس) درود پوار سے کسی خود رو جنگی تیل کی طرح پلٹا تھا۔ انار کی گلابی ہنسی شام کی دلیپ پر اپنی گہی۔ بکاٹن کے پھولوں کی کسبیلی مہک ہر آتی جاتی سانس کے گرد ایک پھندہ سا کس دیتی تھی۔

کالی۔ تیرا رنگ روپ ہی دکھارے ہم سے۔ میں کبج (کس طرح) لوگوں کی زبانیں پکڑوں کوئی کچھ بولے تے سن لیا کر چپ کر کے۔“

عمر نے ماتھے پر رکھا ہوا حکیم بیگم کا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھجھوڑا۔

”ماں کے بارے میں تو بتا۔“ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”کئی وار گا سوہنی تھی۔ سگھی (خوش اطوار) تھی۔ کدی کدی جو ڈا بناتی تھی۔ بیروں میں گر گالی پکتی تھی۔ جو رنگ وی پہن لیتی تھی۔ لاکھانہ متی نہ غانہ فیروی جھرمل جھرمل (جنگ) کرتا روپ تھا۔ رات کو جدہ چینٹ کی رضائی دج سوئی تے مجھے دیوا

بالے (جلانے کی) کوئی لوڑ (ضرورت) نہ رہتی۔“

”اسے دیوے کی لاث اچھی منیں لگتی ہوگی۔ تیل کی بو بری لگتی ہوگی۔ وہ شہر کی رہنے والی تھی۔ اسی لیے

نال۔“

عمر کی آواز میں اپنی ماں کے شہری ہونے کے وصف کا غور بولتا تھا۔

”منیں سدا یا (دوانہ) حکیم بیگم نے اس کے بال سنوارتے ہوئے ماتھے پر ہولے سے چھلکی دی۔

”اس دا اپنا جانن ہی اتنا تھا کہ جیویں (جیسے) نور سے بنی مورت ہو کوئی۔ بڑی بڑی لکھی تھی۔ ہمیش (ہمیشہ) سپاہی گل کرتی تھی۔ تیرے در کی چوڑی (بکواس) نہیں تھی۔ ہن چپ کر کے سو جا۔ گلاں کرے گا تو

ہو پندارتے گا۔“

وہ دیکھ رہی تھی کہ بخار کی شدت سے مسلسل آنکھیں کھلی رکھنا بھی عمر کے لیے باعث تکلیف تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کے گوشوں سے پانی کی لکیریں کنپٹیوں کی جانب رنگ رہی تھیں۔ بولتے ہوئے اس کا گلابا بار سوکھتا تھا اور ہر چند لمحوں بعد وہ پانی مانگنے لگتا لیکن موضوع ایسا تھا کہ چاہے ساری رات بات کی جاتی اور وہ جتنی بھی تکلیف میں ہوتا، ہرگز نہ آتا۔ اس کے بدن کی لکڑی بے لکڑی ہوئی تھی۔ حکیم بیگم کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طویل

حکیم بیگم نے آلے (چراغدان) میں دھڑے چراغ کے قندیل کو دا سلائی دکھائی اور چراغ اٹھا کر اندر چلی آئی۔ جہاں گھاٹ پہ عمر گھڑی ساہنا ہوا رہا تھا۔ وہ گزشتہ رات سے بخار میں جھنک رہا تھا اور حکیم بیگم نے تمام ٹونکے آزمائے تھے مگر بخار تھا کہ ٹونکے میں ہی نہ آتا تھا۔ حکیم اجمل کے مطب سے لائی ہوئی دوا سے بھی ذرا افادہ نہ ہوا تھا۔ مینجھلی والے ڈاکٹر تک جانا اس لیے ممکن نہ تھا کہ سالوں کی برساتوں نے نالہ نہیں کوانتا بھر دیا تھا کہ اس کا پانی کناروں سے چھلکنے لگا تھا۔ ان دنوں اسے ان بیرونیوں کی مدد سے بھی پار نہیں کیا جاسکتا تھا جو معمول کے ایام میں اسکول پڑھنے والے بچوں اور دیگر ضروریات کی خاطر مینجھلی یا اوڈھ نور کوٹ جانے والے لوگوں کو آمد و رفت کی سہولت مہیا کرتی تھیں۔ ہر سال برسات کے دنوں میں نالہ نہیں کے اس پار بارڈر کے نزدیک بسنے والے دیہات کی روزمرہ زندگی بے گھٹ کا شکار ہو جاتی تھی اور اسکول پڑھنے والے بچے غیر معیہ مدت کے لیے تعطیلات پر رہتے تھے۔

عمر کے سر ہانے بیٹھ کر وہ اس کا پر جدت سر پوئے (نرم) ہاتھوں سے دبانے لگی تھی۔ اس کا نالو بدن بخار میں لگی روٹی کی طرح سلگتا تھا۔

”بجی! اس نے خف آواز میں پکارا۔

”میری ماں اچھی عورت نہیں تھی؟ ماسی چھو ماں کہتی ہے وہ۔۔۔“

”چھو ماں کا جودل کرتا ہے آکھ (کہہ) دیتی ہے۔ تیری ماں ایسی سوہنی بیباں کی صفت کراں (کروں) جد پہل وار اس گھروچ آئی تے مجھے ویرہو میلا گئے لگا۔ سمجھ نہ آئے اس نوں کتے (کدھر) ہٹاؤں نہ موڑھا

ملنے چوکی۔ میں تو کملی ہو گئی۔“

”وہ جتنی تھی میرے جیسی۔“

اس کے بخار سے تپیدہ چہرے پر اشتیاق پھیل گیا۔

”ہاں تو اس ورگا (جیسا) ہے۔ اسی واسطے تو لوک ماننے نہیں تو میرا پتر ہے۔ میں جے ہوئے ہاں درگی تے تو چنا دودھ (دودھ) میری آمنہ وی میری طرح شاہ

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

رات باقی تھی اور اس حالت میں۔۔۔ صبح تک جانے کیا ہو جائے وہ پریشان سے بو بھل وجود لیے اٹھی اور پاؤں گھسیٹتی صحن میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس عمر کے پاس آئی تو انوکھا سکون اس کے انگ انگ سے پھوٹا تھا۔

”اٹھ کا ڈیو پالی۔“

عمر نے بڑی وقت سے کروٹ لی اور اس کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

”بے جی! یہ کدھر سے لائی ہو؟“

اس نے کوزے میں تیرتے بے رنگ سیال کو دیکھ کر پوچھا۔

”یہ دو ایسے ڈاکٹری ہے جو دنیا دے سب ڈاکٹروں سے سارے حکیموں سے زیادہ علم والا ہے۔ اس دی واد میں اٹھ دھاتی ہے۔ شفا نہ ہو یہ تے ہو ہی نہیں سکتا۔ بس اس ڈاکٹری ایک شرط ہے۔ وہ مانی پڑے گی تجھے۔“

”وہ کیا ہے جی۔“

”وہ کہتا ہے میرے علم وچ میری حکمت وچ کوئی شک نہ کرے۔ جے جے شرط قبول ہے تو لی جائیو۔“

فیروکھنا بخار کا نام نشان وی باقی نہ رہے گا۔

عمر نے سر کو آستین سے جنبش دی اور ہاتھ برصا کر کوزہ اس سے لے لیا۔

”زیادہ کڑوی (کڑوی) تو نہیں ہے نا۔“

”بس تھوڑی جنی (ذرا سی)“ حکیم بیگم نے تسلی دی۔

”چل میرا پتر شاباش پہلے اٹھاں میٹ کر بسم اللہ پڑھ تے دل وچ سب توں وڈے ڈاکٹر تے پکا یقین کر۔“

جے تو نے کڑی دی تنگ جتا (چپو نی کی ٹانگ جتا) وی شک کیا تے وادے اثر نہیں کرتا۔

اس نے پہلا گھونٹ لے کر راسا منہ بنایا تھا۔

”یہ تو پالی ہے۔ ساہ پانی، کوئی ذائقہ ہی نہیں ہے۔“

”جو دی ہے تو لی جا چپ چپے (خاموشی سے) رو لاندہ پا۔“ (شور نہ بجا)

خالی پیالہ لے کر حکیم بیگم نے اسے نرمی سے لٹا دیا تھا۔

”اس ڈاکٹر کا نام تو بتا دے بے جی۔ وہ کدھر دوکان کرتا ہے۔“

”میں آکھیا ناں (کہا ناں) چپ کر جا۔“

وہ اسے سلانے کے لیے پھٹکنے لگی تھی۔

جب سورج کی اولین کرنوں کے ساتھ وہ بیدار ہوا تو بخار رخصت ہو چکا تھا۔ وہ چار پانی سے اتر اور حکیم بیگم کو آوازیں دیتا صحن میں آگیا۔ وہ بکا کن کے درخت تلے جھڑپے ہوئے پروانہ رو پھولوں کو بھاٹو سے سمیٹ رہی تھی۔

”بے جی! بخار اتر گیا۔ وہ دو اتو بڑی زبردست تھی۔ کس ڈاکٹر سے لے کر آئی تھی تو۔ اس کا نام تو بتایا ہی نہیں تو نے۔“

حکیم بیگم جھاٹو ایک طرف رکھ کر خاصی دیر تک اسے دیکھتی رہی اور زیر لب مسکراتی رہی۔ ”تو جانتا ہے اس نول سب جانتے ہیں۔ اس کا نام ہے اللہ۔“

☆ ☆ ☆

کبودی سیال سے چھلکا ایک جام سفال تھا جس کے کنارے دوب سے ڈھکے تھے۔ آسمان کی نیلا ہٹ پر تصنع کا گمان ہوتا تھا۔ ہوا میں مجیرے بجنے کی آواز تھی۔

جھیل کی سطح پر ایک راج ہنس تیرتا تھا۔ اجلا سفید جیسے ہاتھی دانت سے بنا ہو۔ اس کا عکس شفاف پانی میں تھا۔

”جانے اس کے پروں کی ملائمت کیسی ہوگی؟ اس کے سفید بدن کی نما ہٹ کیسے انگلیوں کو گد گدائی ہوگی؟“

وہ اسے چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی وہ قدم بڑھا کر جھیل کے سرو پانی میں اتر گئی۔ آسمان کا نیلگوں رنگ تیزی سے سیاہی میں بدلنے لگا تھا۔ اس کی پیشانی نے کس سرو شے کے لمس کو محسوس کیا۔ وہ گھبرائی تھی۔

اب کی بار اس کی گردن کو کوئی چیز چھو کر گزری تھی۔ شاید بارش شروع ہو گئی تھی لیکن وہ بوندیں نہیں

تھیں شاید خشک تھے یا گھاس کے تنکے کسی عجیب سے احساس سے اس کا دل پیٹھ گیا۔

اب وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ قتلہاں تھیں جو آسمان سے اتر رہی تھیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں یا شاید لاکھوں لیکن ایک عجیب بات تھی کہ وہ تمام قتلہاں مردہ تھیں۔

اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر اس کے پاؤں مغلوج تھے وہ اپنی جگہ سے اٹل نہیں پاتی تھی۔ یکبارگی دو بڑے بڑے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ قاتل کا چہرہ اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ صرف ان ہاتھوں کو دیکھ سکتی تھی جو اس کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ اس کا دم اکھڑنے لگا۔

وہ بیدار ہو گئی۔ اس کی سانسیں ناہموار تھیں اور قیص سینے سے بھگ کر بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے نکل کر کھڑکی کے سامنے جا پہنچی، کھڑکی کے پتہ واکے اور چند گہری گہری سانسیں بھر کر خشک ہوا کو سینے میں اتارا۔

”کیا بھانکنا خواب تھا۔“

☆ ☆ ☆

اس کی رگوں میں اب تک کھپاوت برقرار تھی۔ ہتھیلی سے گردن ملتے ہوئے اسے ایک خیال آیا تو وہ لائٹ جلا کر آئینے میں اپنی گردن کا جائزہ لینے لگی۔

اسے یقین تھا کہ انگلیوں کے ثبت شدہ نشانات وہ دیکھ پائے گی۔

☆ ☆ ☆

گردے سے اٹی گرے ہاونڈ بس وائن اسٹریٹ پر رکی تو اترنے والوں میں سب سے پہلا ایک خوش شکل وراز قامت نوجوان تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی قیص پہن رکھی تھی جس کے کار شانوں سے نیچے تک لنگ رہے تھے۔ سبزی بائیل بھوری پتلون رانوں سے تنگ اور پانچوں سے کھلی تھی۔ اس کی چھاتی فراخ، شانے مضبوط اور کمر سڈول تھی۔ لباس کی تراش نے اس کے متناسب خدو خال کو خصوصیت سے نمایاں کر دیا تھا۔

قرب سے سے گزرتی سنہرے بالوں

تھیں شاید خشک تھے یا گھاس کے تنکے کسی عجیب سے احساس سے اس کا دل پیٹھ گیا۔

اب وہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ قتلہاں تھیں جو آسمان سے اتر رہی تھیں۔ سینکڑوں کی تعداد میں یا شاید لاکھوں لیکن ایک عجیب بات تھی کہ وہ تمام قتلہاں مردہ تھیں۔

اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا مگر اس کے پاؤں مغلوج تھے وہ اپنی جگہ سے اٹل نہیں پاتی تھی۔ یکبارگی دو بڑے بڑے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ قاتل کا چہرہ اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ صرف ان ہاتھوں کو دیکھ سکتی تھی جو اس کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ اس کا دم اکھڑنے لگا۔

وہ بیدار ہو گئی۔ اس کی سانسیں ناہموار تھیں اور قیص سینے سے بھگ کر بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بستر سے نکل کر کھڑکی کے سامنے جا پہنچی، کھڑکی کے پتہ واکے اور چند گہری گہری سانسیں بھر کر خشک ہوا کو سینے میں اتارا۔

”کیا بھانکنا خواب تھا۔“

☆ ☆ ☆

اس کی رگوں میں اب تک کھپاوت برقرار تھی۔ ہتھیلی سے گردن ملتے ہوئے اسے ایک خیال آیا تو وہ لائٹ جلا کر آئینے میں اپنی گردن کا جائزہ لینے لگی۔

اسے یقین تھا کہ انگلیوں کے ثبت شدہ نشانات وہ دیکھ پائے گی۔

☆ ☆ ☆

گردے سے اٹی گرے ہاونڈ بس وائن اسٹریٹ پر رکی تو اترنے والوں میں سب سے پہلا ایک خوش شکل وراز قامت نوجوان تھا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی قیص پہن رکھی تھی جس کے کار شانوں سے نیچے تک لنگ رہے تھے۔ سبزی بائیل بھوری پتلون رانوں سے تنگ اور پانچوں سے کھلی تھی۔ اس کی چھاتی فراخ، شانے مضبوط اور کمر سڈول تھی۔ لباس کی تراش نے اس کے متناسب خدو خال کو خصوصیت سے نمایاں کر دیا تھا۔

قرب سے سے گزرتی سنہرے بالوں

تھیں شاید خشک تھے یا گھاس کے تنکے کسی عجیب سے احساس سے اس کا دل پیٹھ گیا۔

والی لڑکی نے اسے دیکھ کر ایک شہنشاہ اشارہ کیا تھا، جس پر وہ کھل کر مسکرایا تھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھجک گیا تھا۔ جو اب ”وہ لڑکی اوپے سروں میں ہنسی ہوئی چلی گئی تھی۔“

اس نے سفری بیگ کو کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور بائیں پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی۔

”میں پہنچ گیا ہوں۔“

گردو پیش کو خواب ناک آنکھوں سے تکتے ہوئے اس نے خود کو یقین دلایا تھا۔

”ہالی بوڈ۔“

اس کی برادر ہاٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ چند راہگروں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے مگر اسے مطلق پروا نہ تھی۔

”ہالی بوڈ۔“

اس نے بلند آواز میں دوہرایا تھا۔

”میں ہالی وڈ میں آگیا ہوں۔ ہاں ہاں میں پہنچ گیا ہوں۔“

وہ آسمان کی جانب چہرہ اٹھا کر حلق کی پوری قوت سے چلایا کوئی اسے پاگل سمجھ رہا تھا تو سمجھا کر۔ اگر یہ لوگ جانتے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے اسے کتنی کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا تو کبھی اسے حیرت سے نہ تکتے۔

”اسپرنگ فیلڈ“ سے لاس اینجلس۔ تک کا سفر چاہے بہت طویل نہیں تھا لیکن اسے یہاں تک آنے میں کئی برس لگ گئے تھے۔

وہ چودہ سال کا تھا جب پہلی بار اس نے خود کو خواب میں اس الگہ نگری میں دیکھا تھا اور اس رات کے بعد ہر رات اس خواب کو دوہرا نا رہا تھا، کبھی سوئے سے پہلے اور کبھی نیند میں۔ آج جب اس نے اپنے خوابوں کے دنیوں میں حقیقت کا پہلا قدم رکھا تھا تو وہ بائیس سال کا ہو چکا تھا۔

سنے اور حقیقت کے بیچ اٹھ طویل سالوں کی جھجکن گزیدہ مسافت حائل تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں مگن ہالی وڈ ہیرو کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کی سماعت سے ایک شہنشاہ گیت نکلا۔ وہ

رہا تھا کہ اس کی سماعت سے ایک شہنشاہ گیت نکلا۔ وہ

رہا تھا کہ اس کی سماعت سے ایک شہنشاہ گیت نکلا۔ وہ

فرانسیسی بھی اپنا ہیٹ فٹ ہاتھ پر رکھے گنار بجار ہاتھ اور اس کے گرد چند تماشائی جمع تھے۔ وہ خوش گلو نہیں تھا اور اس کا انگریزی تلفظ بھی بہت برا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ مسکے ہوئے پر آگندہ لباس والا بھی تھا اور اس کا بے سرائیت بھی۔ چند لمحوں بعد وہ گیت کی دھن پر ناچ رہا تھا۔ فرانسیسی اور بھی جوش سے گانے لگا۔ محفل میں ولولے کی ایک لہر ابھی اور سب کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ سب لوگ تالیاں بجانے اور ایک آہنگ ہو کر گانے لگے۔ تب پہلی بار اس نے گیت کے یوں پڑھیاں دیا اور اس کے رقصاں پیر پیر ہم گئے۔

میں جانتا ہوں۔

ہاں میں جانتا ہوں۔

وہ راز کی بات۔

جو تم چھپاتے ہو۔

ہاں میں جانتا ہوں۔

بھی لک لک کر گائے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سایہ سا لہرا رہا اور دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔ اس نے جیب سے سکہ نکال کر ہیٹ میں اچھالا اور اپنا بیگ اٹھا کر وہاں سے چل دیا۔ ایک دم اس کا دل اچلت ہو گیا تھا۔

میں جانتا ہوں۔

وہ راز کی بات۔

فرانسیسی بھی کی بھدی آواز اس کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔

ابراہیم چالیس کی دہائی میں برصغیر سے امریکہ کی ریاست میساچیوس میں اپنے تایا اور ہونے والے سر کے بلاوے پر آیا تھا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں گیا تاہم جب تقسیم ہند عمل میں آئی تو اس نے خود کو پاکستانی کے طور پر شناخت کرنا شروع کر دیا، کیونکہ وہ لائلپور میں پیدا ہوا تھا اور تقسیم کے نتیجے میں لائلپور پاکستان کا حصہ بن گیا تھا۔ امریکہ آنے کے تیسرے

سال اس کی شادی اپنی تایا زاد ماریہ سے ہو گئی اور ان تین سالوں میں وہ اپنے سر کے کاروبار کو نہ صرف اچھی طرح سمجھ گیا تھا بلکہ انتظامی امور بڑی حد تک اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔

ابراہیم کا سر اسپرنگ فیلڈ میں ایک فرنیچر شوروم کا مالک تھا۔ شوروم کی باگ دہرا ابراہیم کے ہاتھوں میں سونپ کر اس نے دھیرے دھیرے کاروبار سے کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی۔ ماریہ اس کی واحد اولاد تھی اور اس نے اپنا سب کچھ اسی کے نام لگا دیا تھا۔ اس ”سب کچھ“ میں ایک تین بیڈروم کا کونورین طرز کا گھر، جدید ماڈل کی کار اور بینک اکاؤنٹ میں معقول رقم شامل تھی۔

ابراہیم نے اپنا لڑکپن یتیمی میں بنیادی ضرورتوں کے لیے ترستے ہوئے گزارا تھا اور یہ پُر آسائش زندگی اس کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی مانند تھی۔ اسے ماریہ سے محبت تھی مگر نہ بھی ہوتی تو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ ان تمام تعیشات کے سامنے محبت کی حیثیت یوں بھی بچ تھی۔

اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز نہایت خوش اسلوبی سے کیا اور پہلے ہی سال ماریہ کی رضامندی سے شوروم کا نام ”انداد فرنیچرز“ سے بدل کر ”ابراہام فرنیچرنگ ہاؤس“ رکھ دیا۔ شادی کے بعد ہر سال اس کی زندگی ایک نئے تغیر سے آشنا ہوتی رہی۔

دوسرے سال ماریہ کا بایبل چھ کرنے گیا اور جہاز کے پیچھے سعودی عرب کی سرزمین کو پھونے ہی والے تھے کہ اسے ہارٹ ایک ہوا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

تیسرے سال کے آغاز میں ابراہیم نے شوروم سے ملحق ایک پلاٹ خرید لیا اور شوروم کو توسیع دیتے ہوئے نئے فرنیچر کے ساتھ ساتھ پرانے استعمال شدہ فرنیچر کی فروخت شروع کر دی۔

چوتھے سال احمد پیدا ہوا اور اس سال ابراہیم کی زندگی نے ایسا پینٹر لدا کہ اس کی کلیا لپٹ کر رہ گئی۔ اس روز ماریہ کو کلینک میں داخل کروانے کے بعد وہ شوروم جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک حادثہ پیش آ

گیا۔ ایک سیڈنٹ سنگین نوعیت کا نہیں تھا۔ گاڑی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا مگر اسے یہ حادثہ بد شگونی معلوم ہوا۔ ایک ایسے دن جب اس کی پہلی اولاد کی آمد متوقع تھی، اس کا خالی سڑک پر جاتے ہوئے گاڑی کو سڑک سے اتار کر ایک ٹھنٹھ سے ٹکرا دینا جبکہ اس نے زندگی میں کبھی نشہ نہیں کیا تھا اور گزشتہ رات کو پوری نیند کے کراخ معمول کے مطابق بیدار ہوا تھا۔ وہ اسے بد شگونی نہ سمجھتا تو اور کیا کہتا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وابستے آ رہے تھے۔ گاڑی درکشاپ میں کھڑی کر کے بس کے ذریعے جب وہ شوروم پہنچا تو مائیک اسٹون کی ”روٹزر انس شوروم کے سامنے موجود تھی۔ وہ مائیک اسٹون کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دو مقامی بنگلوں، چند شراب خانوں اور ایک شاندار ہوٹل کے علاوہ ”ہارٹ فورٹ“ میں ایک مشہور جوا خانے کا مالک تھا۔ وہ آج سے پہلے بھی چند بار فرنیچر خریدنے کے لیے آچکا تھا اور ابراہیم کو اس کی آمد سے بیش خوشی ہوتی تھی کیونکہ اگر ایک بار کوئی چیز مائیک اسٹون کو پسند آجاتی تو وہ منہ مانگے دام اور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ ابھی وہ اسٹون کو دفتر میں بٹھا کر اس کا حال احوال ہی دریافت کر رہا تھا کہ کلینک سے فون آ گیا۔ ماریہ کی حالت کس درجہ خراب تھی، اس کا اندازہ اسے نہیں ہو سکا مگر ٹیلی فون کرنے والی نرس کی آواز میں بدحواسی بھانپ کر اس کا دل بیٹھ گیا تھا۔ فون رکھ کر وہ بوکھلاہٹ زدہ انداز میں کرسی سے اٹھا اور اسٹون سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے ابراہیم کی بات سننے کے بعد اسے تسلی دی اور بولا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم اپنے ملازم سے کہہ دو۔ میں اس کی رہنمائی میں اپنا کام نمٹا ہوں اور تم اپنا کام نمٹاؤ۔“ وہ بھاگتا ہوا دفتر سے باہر نکلا۔ وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”سنو“ اسٹون کے پکارنے پر وہ پلٹا۔ ”تم نے ابھی ذکر کیا تھا کہ تمہاری کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میری گاڑی لے جاؤ۔ میں

بعد میں شو فر کو بھیج دوں گا۔“
”اور آپ؟“ وہ بھلایا۔
”میری فکر مت کرو۔ میں فون پر دوسری گاڑی منگو لیتا ہوں۔“
”شکریہ بہت شکریہ۔“

اس سے چابی لیتے وقت وہ رو دینے کے قریب تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ مسلسل سگریٹ پیتا رہا اور اسٹیرنگ وہیل کو زور سے تھام کر اپنے ہاتھوں کی کیکپا ہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ دنیا کی مہنگی ترین گاڑی میں بیٹھا تھا مگر اسے ان لمحات سے لطف اندوز ہونے کی توفیق نہیں تھی۔ اس کے پیروں کے پاس پنجرز سیٹ تلے شراب کی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس کے دل میں کئی بار آیا کہ شراب کے چند گھونٹ حلق سے اتار کر اپنے اعصاب کو پرسکون کر دے اور اس ارادے سے اس نے بوتل کا کارک بھی ہٹا دیا تھا مگر پھر کسی نہ کسی طرح اس پر عمل کرنے سے باز رہا۔ وہ ایسے نازک وقت میں اللہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کلینک پہنچنے تک اس پر اتنی بدحواسی طاری ہو چکی تھی کہ گاڑی سے اترتے ہوئے اس کی ٹھوکر لگنے سے شراب کی بوتل جس کا ڈھکن لگانا اسے یاد نہیں رہا تھا اوندھی ہو گئی اور ریت سیال گاڑی میں پھیل گیا۔ اسے تشویش تو ضرور ہوئی مگر وہ مائیک اسٹون کو گاڑی بھجوانے سے پہلے اس کی صفائی کروا سکتا تھا۔

ڈاکٹر کے چہرے پر اسے جو کچھ نظر آیا تھا، اس کے بعد اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی ماریہ اسے ایک بیٹا دے کر شکریہ کا ایک بھی لفظ وصول کیے بنا، اسے خدا حافظ کے بغیر رخصت ہو چکی تھی اس لمحے ابراہیم کو لگا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سامنے سے دوچار ہوا ہے مگر وہ غلط تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا جو الیہ چند منٹ بعد اسے پیش آنے والا تھا اس کے مقابلے میں یہ نقصان بہت معمول تھا۔

وہ کلینک سے باہر آیا تو شعلوں میں لپٹی روٹزر انس کو شناخت کرنے میں اسے اتنی دقت پیش نہیں آئی

تھی جتنی اس منظر یقین کرنے میں ہوتی تھی۔

یقیناً "جہاں ہوا سگریٹ کا ٹوٹا ہوا گاڑی میں پھینک آیا تھا اور انکو حل نے آگ پکڑ لی تھی۔ چند لوگ گاڑی سے خاصے فاصلے پر جمع اسے جلتا ہوا دیکھ رہے تھے مگر فیول ٹینک پھٹ جانے کے خوف سے کوئی بھی نزدیک نہیں جا رہا تھا۔ وہ 1922ء میں تیار کردہ رولز راس کا خصوصی ماڈل تھا جو "سلور گھوسٹ" کہلاتا تھا۔ اس کی صحیح قیمت ابراہیم کو معلوم نہیں تھی مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ دنیا کی چند مہنگی ترین گاڑیوں میں سلور گھوسٹ سر فرسٹ تھی۔

اور ڈرائروں کا وہ ڈھیر اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے بھر بھر جل رہا تھا۔ پھر اس کے ماؤف ہوتے دماغ میں امید کی موبہوم سی کرن جاگی۔ گاڑی یقیناً انشورنس شدہ ہوگی۔ یعنی وہ اتنی بڑی مشکل میں نہیں تھا لیکن وہ اس تکلیف کا دوا کسے کرے گا جو "سلور گھوسٹ" کے کھو جانے سے مائیک اسٹون کو ہوتی۔ رولز راس کا وہ مخصوص ماڈل 1926ء میں بننا بند ہو گیا تھا اور اس صورت حال میں سلور گھوسٹ کا ریس انمول نوادر سے کم نہیں تھیں۔ وہ اسی ایڈیشن میں تھا کہ نرس نے اسے اسٹون کے ٹیلی فون کی اطلاع دی۔ ریسور کر لڑتے ہاتھوں میں تمام کر اس نے بے ربط جملوں میں معافی مانگنا شروع کی۔ اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا۔" مائیک کی آواز سنائی دی۔

"گاڑی کو لاک کیے بغیر مت چھوڑنا پچھلی سیٹ کے نیچے ایک بریف کیس رکھا ہے۔ اس میں کچھ رقم ہے۔"

ابراہیم کا سر جکرانے لگا۔

"تکلیف؟"

"زیادہ نہیں۔۔۔ صرف دو ملین ڈالر۔" تب اس نے خواہش کی تھی کہ وہ سلور گھوسٹ کے ساتھ جلی جی کر رکھ ہو گیا ہو۔ ایک ہفتے بعد جب وہ شوروم بند کر کے گھر پہنچا تو

دروازے کی اطراف میں کھڑے دو قوی بیکل ٹیکو آگے بڑھے اور اس کا راستہ روک لیا۔ ان میں سے ایک نے اسے بازوؤں سے جکڑ کر بے بس کر دیا اور اس کے ساتھی نے ابراہیم کا بالیاں ہاتھ پکڑ کر اس کے کچھ سمجھنے سے قبل جیب سے پلاس نما آلہ نکالا اور اس کی چھنگلی کی ایک پورکٹ کر اس کے پیچھے کے لیے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دی اور پھیلنے سے اس کا منہ بند کر کے نہایت پرسکون آواز میں کہا۔

"مائیک اسٹون نے ہر بار تمہاری ایک انگلی کاٹنے کا حکم دیا ہے اور انگلیاں ختم ہونے پر یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ کاٹنے کے لیے تمہارے اور بہت سے اعضاء ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔"

اگلی صبح طلوع ہوتے ہی اس نے اثاثہ جات بیچنے کے لیے تنگ دو شروع کر دی۔ جب تک فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس کے ہاتھ آئی وہ مزید دو انگلیوں سے محروم ہو چکا تھا۔ مائیک کے پیروں میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ گزر کر ان کے بعد جب اس کا حلق سوکھ گیا اور آواز نکلی بند ہو گئی تو اسٹون نے ایک بھوک اس کے ماتھے پر ماری اور بولا۔

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" ابراہیم نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی خواہش پوری کر دی تھی۔ جو رقم اس نے مائیک اسٹون کو دی تھی وہ اس کے اصل نقصان کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی لیکن شاید اس نے ابراہیم کی انگلیوں کی قیمت کو بھی وصول ہونے والی رقم کے ساتھ شمار کیا تھا۔ اگرچہ ابراہیم کے خیال میں اس کی انگلیاں اتنی مہنگی ہرگز نہیں ہو سکتی تھیں۔ صورت چلے کچھ بھی ہو "اس نے گھر گاڑی شوروم اور بامیں ہاتھ کی تین انگلیوں کے عوض اپنی جان بچالی تھی اور یہ سودا اگھالے کا نہیں تھا۔

وہ سات سال پہلے جہاں سے چلا تھا ایک بار پھر اس مقام پر آ پہنچا تھا۔ اسے زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا تھا اور اس پر ایک نو مولود کی ذمہ داری تھی جو اسے بیگار سے کم نہیں لگتی تھی۔ وہ ہر وقت روتا

رہتا، اکثر بغیر کسی وجہ کے ابراہیم کو اس کے رونے کی وجہ سمجھ میں نہ آتی۔ اسے بار بار بھوک لگتی۔ وہ ہر دم گھبراہٹا رہتا۔

اس نے کئی بار سنجیدگی سے غور کیا کہ اسے کسی یتیم خانے کو دے دے لیکن ہر بار اس فیصلے سے باز رہا۔ اس لیے نہیں کہ اسے اپنے وجود کے حصے کو خود سے جدا کرنے میں مشکل درپیش تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اللہ سے ڈرتا تھا۔ اپنی زندگی کی کاپی لٹ کے بارے میں وہ جتنا بھی سوچتا اسے ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی۔ اللہ اس سے ناراض تھا اور وہ اس ناراضی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

نڈھال کرنے والی تلاش بسیار کے بعد اس نے ایک سستے علاقے میں کرائے پر اپارٹمنٹ حاصل کیا۔ اس راکھ جیسی رنگت والی کتبہ عمارت کو پہلی بار دیکھنے پر اسے خیال آیا تھا کہ وہ اب تک گری کیوں نہیں تھی۔ عمارت کے ماتھے پر جو حروف رقم تھے وہ خصوصی توجہ دینے پر پڑھے جاسکتے تھے۔ کوڑی اپارٹمنٹس۔ وہ اپارٹمنٹ صرف نام کا آرام دہ تھا۔ اس میں مکینوں کو تکلیف پہنچانے کے تمام اسباب مہم تھے۔ کوئی کھڑکیاں کھڑے ہوئے دروازے دیواروں اور چھتوں سے لگا تار جھڑتا ہوا چٹا چوبے اور لال بیگ پانی کے تل کھولنے سے ایسی آواز تو ہمیشہ سنائی دیتی جس سے گمان گزرتا کہ پانی ہے مگر خود پانی کبھی بکھار ہی برآمد ہوتا۔ زندگی ایک مسلسل بھانک خواب تھی۔ وہ احمد کو تنہا چھوڑ کر نہیں باہر بھی نہیں جاسکتا تھا اور باہر نہ جاتا تو وہ دونوں سردی اور بھوک سے سسک کر مر جاتے۔ اس مسئلہ کا اس نے یہ حل نکالا کہ بلڈنگ میں رہائش پذیر تمام شادی شدہ کمپنوں کی فرسٹ تیار کی اور پھر خواتین کے مزاج اور ان کے بچوں کی تعداد کو مد نظر رکھ کر فرسٹ کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ ہر نام کے سامنے اپارٹمنٹ نمبر، دن اور تاریخ کا اندراج کر کے اس نے وہ فرسٹ اپنے نیکے تلے رکھی۔

اگلی صبح وہ باہر جانے کے لیے تیار ہوا اور احمد کو صاف کرنے اور دودھ پلانے کے بعد فرسٹ میں سب

صاف کرنے اور دودھ پلانے کے بعد فرسٹ میں سب

سے اوپر لکھے ہوئے نام اور اپارٹمنٹ نمبر کو ذہن نشین کر لیا۔ دستک دینے پر مہمان چہرے والی وحشی عمر کی عورت نے دروازہ اکلیا سے دیکھ کر ابراہیم نے کہا۔

"مسز جوزف! میں آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتا لیکن مجبور ہوں۔ میں دیر تک لوٹ آؤں گا۔" اس نے کھلبلاتے ہوئے احمد کو خاتون کی طرف بڑھایا لیکن اس کے بازو ساکت رہے۔ وہ کچھ دیر عجیب سی نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ اپنی ملازمہ اس بہانے تم مجھ سے راہ و رسم نہیں بڑھاسکتے، مجھے اور میں مسز جوزف بھی نہیں ہوں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ شرابی کیس کے۔"

وہ دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ تک گیا اور فرسٹ کا زمر نو جائزہ لیا۔ اگلا نام منتخب کرنے میں اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ ابھی اس کی معلومات ناکافی تھیں اور مشاہدہ کمزور لہذا اس نے فی الحال ترتیب کو نظر انداز کر دیا تھا۔

اس نے بہت سی ملازمتیں اختیار کیں۔ باکر، انشورنس ایجنٹ، ٹیکسی ڈرائیور، ہوٹل کا دربان، بیرا، سیلز ایجنٹ۔

وہ جب بھی کسی نوکری سے نکالا گیا تو احمد کی وجہ سے، آئے روز اسے طرح طرح کی بیماریاں لگ جاتیں۔ کبھی پیٹ خراب ہوتا تو کبھی بخار ہو جاتا۔ یا کسی دن کوئی بھی خاتون اسے اپنے پاس رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی تو ابراہیم کو اس کی دیکھ بھال کے لیے اپارٹمنٹ میں ٹھہرنا پڑتا۔ ہر بار ملازمت سے فارغ کیے جانے پر جب وہ لوٹتا تو اس کے ذہن کے پردے پر ایک جیسے مناظر مرقم ہوتے لگتے۔

میکس میکن پیوہ سامنتھا روتے ہوئے کہتی "میں اسے کبھی اوڑھنا بھول گئی۔ کھڑکی جانے کیسے کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے دیکھا تو یہ نیلا بچکا تھا۔ خداوند مجھے معاف کرے میں نے اسے مار ڈالا۔" وہ ماتھا پیٹنے لگتی

داوی عادت سے لگا ہوا ہے شہزادہ

داوی جان نے گھر کا تو فائدہ نہ دم سادہ لیا۔ مگر جتنے آنسو اس کے دل پہ گرے ہوں گے یہ میں ہی جانتی تھی۔

”میں کہے کو داوی جان! یہ روئے جا ہے نا! اسے برا شوق ہے نئے نئے لوگوں سے ملنے کا۔“

زرمینہ نے فوراً اپنی جان بچائی۔
”کوئی نہیں۔ مجھے تو ساری پرانی چیزیں ہی پسند ہیں پرانے لوگ پرانی چیزیں۔“ میں مگر کہی۔
”ہاں۔۔۔ رگیلا، سلطان راہی اس کے فیورٹ ہیں۔“ فائدہ نہ دانت پیسے۔

”روئے جا۔“ داوی جان نے مجھے تینہی انداز میں پکارا اور میں نے مینا کو۔

”مینا! اشرم کرو، کب سے داوی جان ایک چھوٹا سا کام کہہ رہی ہیں اور تم کانوں میں روٹی ٹھونسنے بیٹھی

کوئے والی کوٹھی میں نئے لوگ شفٹ ہوئے تو حسب عادت داوی جان کا جذبہ ہمسائیگی جوش کھانے لگا۔

”آج بریانی پکی ہے، جاؤ ایک پلیٹ بھر کے ان کے ہاں بھی دے آؤ۔ نئے نئے آئے ہیں، کیا جانے کچھ پکایا بھی ہو گیا نہیں۔“

”نوٹی۔۔۔ یہ اچھی رہی۔“ فائدہ نہ منہ بسورا۔

داوی جان کا اشارہ اسی پلیٹ کی طرف تھا جو وہ ابھی ابھی بچن سے لے کر نکلی تھی۔ اوپر چاولوں کا انبار اور اندر چھپی بوٹیاں، کس محنت سے اس نے بوٹیوں کے اوپر چاولوں کا پہاڑ کھڑا کیا تھا یہ وہی جانتی تھی یا پھر میں جو اس کی عادت سے اچھی طرح واقف تھی۔

”خبردار، ہمسایہ ماں جایا ہوتا ہے۔ فوراً پلیٹ کو ڈھانپو اور مینا کے ساتھ جا کے انہیں پکڑا کے آؤ۔“

انواع و اقسام کی نوکریوں سے بھی اس کی جان چھوٹ گئی تھی اور اس نے معمول کی بدولت وہ اپنی عبادت کو مناسب وقت دے سکتا تھا۔ بہر حال اللہ کا قہر اس سے ٹل رہا تھا۔

احمد صفحہ اسٹینڈرڈ میں ہوا تو ابراہیم نے اسے قرآن پاک پڑھانا شروع کیا۔ وہ اسے نماز کے لیے بھی ساتھ لے جانے لگا لیکن شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اسے کامیابی ہو۔ جب قرآن پڑھنے کا وقت ہوتا تو وہ مسجد جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا تو احمد چپکے سے باہر کھسک جاتا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طور کھینچ کھانچ کر اسے مسجد لے بھی جاتا تو پہلی رکعت کے دوران ہی وہ اٹنے قدموں لوٹ جاتا۔ پہلے پہل ابراہیم نے اسے نرمی سے سمجھانے کی بہتری کو شش کی مگر جب اسے احساس ہو گیا کہ وہ فطرتاً بہت دھرم تھا تو اس نے بھی اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا شروع کر دی۔

ایک بار وہ نماز جمعہ کے لیے احمد کو گھنٹہ بھر تلاش کرتا رہا اور جب نماز کا وقت نکلنے کو تھا تو اسے اپنے بیڈ کے نیچے جھپٹے کے بڑے ڈبے میں پھپھ کر بیٹھا ہوا مل گیا۔ اگر کچھ دیر اور اسے محفل کے سبب کھانسی نہ آتی تو ابراہیم نماز کے لیے جا چکا ہوتا، اس نے گھسیٹ کر احمد کو ڈبے سے نکالا اور اس کے بال بائیں ہاتھ کی مٹھی میں جکڑ کر زوردار طمانچہ اس کے گلہ پر مارا۔

”کتے کے پلے۔ تمہیں اللہ سے اتنی دشمنی کیوں ہے۔ تم کسی یہودی کے گھر کیوں نہیں پیدا ہو گئے۔ چلو جا کر اپنا حلیہ درست کرو، ہم مشکل سے جماعت کے ساتھ شامل ہو پائیں گے۔“

وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورتا رہا۔

خوف سے سہمی ہوئی اندر سے عذرا ایک خون آلود گٹھری اسے تھماتی ”میرے گتے نے اسے بھینچوڑ ڈالا۔ میں نہیں جانتی تھی وہ معصوم سا چلا اتنا خوشخوار ہو سکتا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔“

اس کے خیال نے کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ وہ سخت تشویش زدہ چہرہ بنائے بڑی امید سے پوچھتا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے۔“

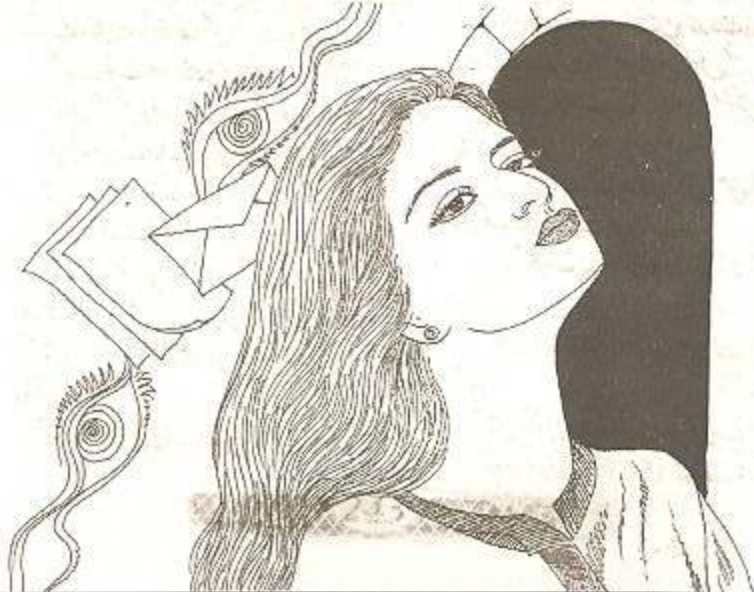
اور اس کی امید دم توڑ جاتی جب فوراً ہی چیخ چلاتا احمد اسے سونہ دیا جاتا۔

دن بھر کی خواری کے بعد رات کو بھی وہ چین سے سوئے نہ پاتا تو احمد کا گلا دبانے کو اس کا دل شدت سے محفلے لگتا۔ ابراہیم کو یقین تھا کہ اللہ اسے کسی ایسے گناہ کی سزا دے رہا تھا جو نادانستگی میں اس سے سرزد ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا اور مہلت ملتی تو مسجد بھی چلا جاتا اور وہاں کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر روتے ہوئے اپنے ناکورہ گناہوں کی معافی طلب کرتا۔ اس نے ویک اینڈ پر کال گرلز کو لپار ٹمنٹ میں لانے کا مشغل بھی ترک کر دیا۔

شراب وہ پہلے بھی کبھی کبھار پیتا تھا۔ اب مستقل چھوڑ دی۔ جب اس کے مالی حالات کچھ معمول پر آئے تو اس نے ایک پختہ عمر کی مطلقہ عرب عورت سے نکاح کر لیا۔ ان کی نگہ نہ سکی اور چھ سال بعد ہی ان کے درمیان طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد ابراہیم کی زندگی میں کسی عورت کا زور نہیں ہوا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی اور بہت مذہبی ہو گیا تھا۔ پھر قسمت نے اسے ایک موقع فراہم کیا۔ ایک چھوٹی سی بک شاپ جس کی گرتی ہوئی ساکھ کو حادثاتی آگ نے مزید گرا دیا تھا اور اس کا مالک اس سے جان چھڑانے کے لیے بے چین تھا۔

اسے خریدنے کا کھوتا خواہشمند ابراہیم تھا اور یہ سودا خوش اسلوبی سے طے پا گیا تھا۔ بھلے اس دوکان سے حاصل ہونے والی آمدنی نہایت قلیل تھی اور اس کی تجدید نو کے لیے کثیر سرمایہ درکار تھا مگر اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ وہ کم از کم اس کی ملکیت تو تھی اور

باقی اسٹینڈرڈ میں



ہو۔

”میں تو سو گئی ہوں۔“

وہ دواوی جان کے پلنگ پہ ڈھیر ہوئی۔
”کون سا ہمیشہ کے لیے سو گئی ہو۔“

میں نے اسے گھورا، مگر اس نے مزے سے آنکھیں بند کر لیں۔ غیثت کبوتری۔

”رو بھا! شرم کرو۔“ تھکی ہوئی ہوگی، اسی لیے پڑی ہے نا۔ جاؤ فائقہ کے ساتھ۔ اور ذرا ادب لحاظ سے بات کرنا چاہئے۔ بلکہ عقل سے۔“

میں اب دواوی جان کو کیا کہتی۔ ورنہ جو منہ بھر بھر کے گالیاں آ رہی تھیں وہ زرمینہ کو دیتی تو کیا ہی وہ گولیوں کے برست سے چھلٹی ہوئی۔ ”سورتنوں“ کی طرح گھر گھر جا کے شیرینی پانتا مجھے قلعہ ”پسند نہیں تھا۔ اور یہ بات سب ہی جانتے تھے۔

دواوی جان تو آؤروے کے شیع کے دانے رو لیتی اوٹھنے لگیں اور میں تن فن کرتی چپلوں میں پیروانے لگی۔

”جاری ہوں میں۔ اب نمٹتی پھرنا اپنے بھائی سے۔ جب ان کے جوان خوب صورت بیٹے نے مجھے پسند کر لیا تو۔“

وانت پیٹے ہوئے میں نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا تو پیٹ سے زرمینہ کی آنکھیں تو کھلی ہی تھیں بونٹیوں کے لیے ہلکان ہوتی فائقہ بھی الرٹ ہو گئی۔

”کیا یہ خوب صورت بیٹا! کہاں کس کا؟“
”وہی“ کوٹھی والوں کا اب خود سوچو بیٹا! میں منگنی شدہ کیا غیر مرد کے سامنے جاتی اچھی لگوں گی۔“

میں نے آواز دبا کے کہتے ہوئے منہ بھی پٹایا۔
”میں صدقے“ میں قربان، میری غیرتوں والی بھابھی! کوئی ضرورت نہیں تمہیں گھر سے پیر یا ہر نکالنے کی۔ یہ کروا گھونٹ میں ہی بھر لیتی ہوں۔“ وہ اتنی پھرتی سے اٹھی کہ میرا ایک چمٹا لگانے کو جی چاہ رہا تھا۔

”اور وہ تمہاری نیند ہے“ میں معصوم بنی۔

”ارے تم جیسی شرم و حیا والی بھابھی پر سو نیندیں قربان۔“ وہ شاد ہو رہی تھی۔
”وفوہ کہاں تم تکلف کرو گی میں خود ہی جا کے پکڑا آتی ہوں۔“ یہ فائقہ صاحبہ تھیں۔ نت نئے لوگوں سے ملنے سے الرجک۔

”ارے نہیں۔ زمانہ خراب ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ فائقہ نے زرمینہ کی بات پر منہ بنایا تھا۔

ان دونوں بھد شوق جانے کے بعد میں آرام سے ہنستی ہوئی دواوی جان کے پاس لیٹ گئی۔

بے چاری کنواریاں۔ میرا ڈالا ہوا چارہ کام کر گیا تھا۔ اب ہر ایک کی قسمت میرے جیسی تیز تھوڑی ہوتی ہے جو اتنی جلدی اتنا ہندسہ منگیتل جائے جس کے پاس اپنی منگیتل کو ڈالنے کے لیے چاہے گھاس نہ ہو۔

مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ ان کی قسمت بھی بدلنے والی ہے۔ اور میرا چلایا ہوا تیر جا کے سیوہا نشا نے پہنچ گئے گا۔

اگلے دن پتا چلا، دوپہر کو زرمینہ کو نے والی آنٹی شائستہ کے ہاں مٹن کڑا ہی دینے گئی ہیں اور اس سے اگلے دن فائقہ صاحبہ اچھے موسم کا فائدہ اٹھا کر کڑھی پکوڑے لے کر پہنچ گئیں، میں حیران۔

”یہ گھر کا بجٹ درہم برہم کر رہی ہیں۔“ ماہین چڑھی۔

اس کے حصے کے پکوڑے یقیناً ”شائستہ آنٹی کے ہاں کھائے جارہے تھے۔“

”کیا تکلیف ہے تم دونوں کو شائستہ آنٹی پہ مرٹی ہو؟“

”نا۔ ان کا جوان خوب صورت بیٹا۔“ فائقہ شرمائی۔

”میں تو بکواس کر رہی تھی۔“ میں نے تہقہ لگایا۔
”وہ تو تم واقعی کر رہی تھیں۔ مگر ان کا واقعہ

ایک ہندسہ سا بیٹا ہے۔ ان کے برنس کا اکھوتا وارث۔“ فائقہ اتر آئی تو مجھے جھٹکا لگا۔

”اف۔ کتنی تعریفیں کرتی ہیں آنٹی اس کی۔“

شیرازہ یہ شیرازہ وہ۔“ فائقہ نے دل پہ ہاتھ رکھا۔
”آنٹی کو کالی لڑکیاں نہیں پسند اور بیٹے عموماً“ ماؤں

کی پسندی کو ترجیح دیتے ہیں۔“

زرمینہ نے فائقہ کی ٹھہری تھری گندی رنگت کو نشانہ بناتے ہوئے اپنی راہ صاف کی تو وہ تڑپ اٹھی۔

”تمہارے منہ میں خاک میدے کی پوری۔ ابھی صبح میں انہیں اپنی چمکتی اسکن کی ٹپس دے کے آئی ہوں۔ خدا ہیں وہ مجھ پر۔“

”ہائ۔ خدا۔“ زرمینہ مقابلے پہ اترتی۔ ”مرتی ہیں میرے ہاتھ کے کھانوں پہ۔ وہ کمرہ رہی تھیں مٹن کڑا ہی شیرازہ کو بست پسند آئی اور اس نے کہا کہ جی چاہتا ہے اسی جان آپ کے ہاتھ چوم لوں۔“

وہ لچاسی گئی اور میں ششدر۔
”تم۔ اسی جان!“

”وفوہ۔“ بھائی تو میں نے تھی نا۔ اس نے مجھا آنٹی شائستہ نے بھائی سے۔ ان ڈائریکٹ تعریف تو

میری ہی تھی نا! زرمینہ شرمائی۔
”اللہ خیر دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔“

ماہین نے ان دونوں کو سمجھانا چاہا۔
”چل نی! بڑی آئی پڑھا کو۔“ زرمینہ نے مکھی اڑائی۔

”تھیک کہہ رہی ہے ماہی! میں نے بھی پڑھا ہے کہ کسی سے ہاتھ ملانے میں جلدی نہ کرو۔“

نوبین نے بھی نصیحت کے اس کاہر خیر میں حصہ ڈالا تو میں نے اس کی بات کالی۔

”ہو سکتا ہے کہ اس نے واش روم سے آکر ابھی ہاتھ نہ دھوئے ہوں۔“

”شٹ آپ۔“ فائقہ اور زرمینہ کورس میں بولیں تو میں دیک کر رہ گئی۔

میں بھی شائستہ آنٹی سے ملنے گئی تو واقعی وہ شیرازہ ہی کی تعریفوں میں مصروف رہیں۔

شیرازہ یہ شیرازہ وہ شیرازہ یہاں شیرازہ وہاں۔
”اللہ نے شادی کے پانچ سال کے بعد اولاد دی مجھے۔ دو بیٹیاں، پھر یہ۔ اس کی دواوی نے شیرازہ نام رکھا اور پھر شیرازہوں ہی کی طرح بالادس بیٹوں پر بھاری ہے وہ۔ لوگوں کے لڑکوں کی خواہش اور خواب ہوتا ہے وہ مقام جہاں ہمارے برنس کو شیرازہ نے پہنچایا ہے ہمارے تو جان ہے اس میں۔“

لو جی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دل چاہا از میرٹ کی انگوٹھی اتار کے شیرازہ کی ڈائمنڈ رنگ پین لوں۔

مگر یہ کہیں نہاں۔ میری ادھ بکی دال کہاں گھٹنے دیں گی۔

میں نے گہری سانس بھر کے فائقہ اور زرمینہ کو دیکھا جو بڑے شوق سے اپنے خوابوں کے شیرازے کے قصے سن رہی تھیں۔

”میں نے شیرازہ کو تم لوگوں کے بارے میں بتایا ہوا ہے۔“ اُسے بھی بہت شوق ہے فائقہ اور زرمینہ سے ملنے کا۔ بس برنس میں مصروف ہے تو ناگہم ہی نہیں ملتا۔ کل بھی وہ اور اس کے پاپا رات گئے واپس لوٹے تھے۔“

باقی کسر آنٹی جی نے نکال دی۔ ان دونوں پر تو مری ہوئی شادی طاری ہو گئی۔ او فوہ وہی شادی مرگ۔

چھپلے ایک ہفتے سے ذیل ماریاں دور بین لگا لگا کے شیرازہ کو اپنے ٹیرس سے دیکھنے کی کوشش میں مر رہی تھیں۔ تھوڑی سی بھی مدد ویت ہلال کیٹی والوں کی کر دیتیں تو گیارہ بجے سے پہلے ہی چاند نظر آجاتا۔

فائقہ نے فیروز کی مگر پنا شیرازہ کو پسند ہے۔

زرمینہ نے بالوں کو تیل لگا کر چٹا گوندھی شیرازہ کو لیے بال اچھے لگتے ہیں۔

دونوں کا زیادہ وقت بچن میں گزرتا۔ نت نئی ڈشیں، گھر والوں کے تو مزے ہوئے ہی تھے۔ آنٹی شائستہ لوگوں کی بھی موجیں ہو گئی تھیں۔

”تم کیا بھاگ بھاگ کے وہاں جاتی ہو۔ تمہاری

وال نہیں گلے والی۔ شہزادہ کو مجھ جیسی لڑکی پسند ہے،
 نازک کا منی سی۔ ”زرمینہ نے فائقہ کا پتا کانٹا چاہا۔
 ”کانسی کی۔ کمبھنی کی نہیں۔“ وہ اطمینان سے
 بولی تو ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔
 ”اف۔ کیا سلیں تھا“ آج صبح دوسرے میں شائستہ
 آنی کے بل، اگل ہوئی دوسرے شہزادہ ہر آیا۔
 فائقہ نے نقشہ کھینچا۔
 ”ان کے دو گیت ہیں کیا؟“ مایہ نے عینک درست
 کر کے جیرانی سے پوچھا۔
 ”تمہارے آنے کی خبر سن کر ہی بھاگا ہو گا وہ۔“
 زرمینہ نے منہ بنایا۔ مگر وہ مست تھی۔
 ”اف۔ کیا سلیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کے مسکرایا۔“
 ”خود ہماری ہنسی نکل جاتی ہے تمہیں دیکھ کے وہ تو
 غنیمت ہے فقط مسکرایا تھا۔“ میں نے آرام سے کہا۔
 ”بکومت۔۔۔ جل گزلی! تمہاری سڑی بسی زندگی
 میں اگر از میرٹ جیسے ماتھے مگنیترنے کوئی گل نہیں
 کھلائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب تو ہماری باری
 ہے۔“
 ”داویٰ عشق سے آیا ہے میرا شہزادہ۔“ وہ گنگنائی
 اور میں دانت کچا کچا کے رہ گئی۔
 اگلے روز زرمینہ کی باری تھی۔
 ”میرے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رُک گیا۔
 میری تو سانس ہی بند ہو گئی۔“
 ”یقیناً“ کوئی سستا پیٹ استعمال کرتا ہو گا۔“ چڑیا
 نے لقمہ دیا۔
 جواباً ”زرمینہ نے اسے کھا جانے والی نگاہوں سے
 گھورا اور ہاتھ میں تھا ماسخ گلاب لہرا کر پوچھا۔
 ”تو پھر کیا ہے؟“
 ”پھول۔“ سب نے کورس میں کہا، تو وہ
 مسکرائی۔
 ”اور یہ مجھے شہزادہ نے دیا ہے۔“
 ”اف۔“
 فائقہ دل پہ ہاتھ رکھ فلور کشن پہ ڈھیر ہوئی۔ خدا
 جھوٹ نہ بلوائے تو جتنی جلن مجھے اس کمبھنی نند سے

ہو رہی تھی کیا ہی کسی اور کو ہوتی، خود اس کا بھائی مجھے
 لے کے دوسروں کی دادوں کے فل اٹینڈ کرنا پھر رہا تھا
 اور یہ اتنی کامیابی سے لو سین انجوائے کرتی پھر رہی
 تھی۔ تف ہے اس مفتنی پر۔ میرا دل خون کے آنسو
 رویا۔
 یہ شہزادہ میری زندگی میں کیوں نہ آیا؟ مجھے کیوں نہ
 ملا؟
 ”اور تم۔“ اس نے تحکمانہ انداز میں فائقہ کو
 اشارہ کیا۔
 ”ہماری لواستوری سے گیٹ آؤٹ ہو جاؤ۔ کیونکہ
 شہزادہ نے جتنے عہد و پیمان کرتے تھے مجھ سے
 کر لیے۔“
 فائقہ بدکی۔ ”ہیں۔ کیا کر لیا ہے تم دونوں نے؟“
 ”نوصلس۔ حوصلہ۔ فقط وعدے ہی کیے ہیں۔“
 مایہ نے اس کا شانہ تھکا تو وہ کھا جانے والی نگاہوں
 سے زرمینہ کو دیکھ کے رہ گئی۔
 ”ایسی ہی ہوتی ہیں نندیں“ از میر نے ہمیں کبھی
 پھول تو کیا ایک پتا بلکہ گھاس تک نہیں ڈالی اور وہ۔
 مینا کی بی۔ اس ”نامحرم“ سے پھول پکڑ کے گھر آئی۔
 ایک پھپر لگا کے چار گالیاں سنائی تو پتا چلا اس شہزادے
 کو کہ شریف لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا
 ہے۔
 فائقہ کو دل کا بوجھ ہکا کرنے کو میرے ہی ”کان“
 ملے تھے۔
 ”جھاجی۔ کل تک تو تم بھی اسے نامحرم نہیں سمجھ
 رہی تھی۔“ میں نے اس کی باتوں سے متعلق ہونے
 کے باوجود اسے لڑاؤ۔
 ”وہ تو میں نے سوچا تھا کہ شاید وہ واقعی میرا شہزادہ بن
 جائے مگر اب تو وہ ہوتے ہوتے رہ جانے والا شوہر ہے
 نامحرم ہی ہوا نا!“
 اس نے صفائی پیش کی۔ جو بہت صاف نہیں
 تھی۔
 ”ویسے شہزادہ ہے کیا؟“ مجھے اشتیاق ہوا۔ ایک

بار بھی اس سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔
 ”بس انسان ہی کا پچھ ہے۔“
 فائقہ ٹال گئی اور فوراً ہی لوہر دوسرے مل بھی گئی۔
 میں بڑبڑا کے رہ گئی۔
 * * *
 ”یہ کیا تم بچن کے بجٹ کو ملکی لواؤں کی طرح
 اجاڑنے رہتی ہوئی ہو؟“
 پیلے کوٹنی ویر تک بچن سے خوشبو میں اٹھتی رہیں
 اور اب جبکہ بلیک فارسٹ ایک تیار ہو گیا تھا تو زرمینہ
 کو ٹرے اٹھائے آنی جی کی طرف جاتے میں نے
 پکڑ لیا۔
 ”دوبنائے ہیں، مروجہ جاکے کھاؤ۔“
 ”تمہیں نہیں جاگتیں۔“ میں نے رعب جھاڑا۔
 ”آج شہزادہ جیجے آ رہا ہے۔“ وہ مسرور تھی۔
 ”پھر تو تم بالکل بھی نہیں جاؤ گی۔“ میں نے مصمم
 ارادہ ظاہر کیا۔
 ”لب تمہارے میری زندگی میں کھلنے والے واحد
 پھول کو نوچ لیتا کوئی روٹی میں تمہاری نند۔۔۔ جو شخص
 کچھ دونوں کی مہمان ہے۔“ اس نے جذباتی ہو کر کہا تو
 میں چونکی۔
 ”اس دنیا میں؟“
 ”بکواس نہیں کرو اس گھر میں۔“ وہ بدکی۔
 ”کیوں کیا ہوا؟ ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے
 کیا؟“ مجھے ہمدردی ہوئی۔
 ”ڈویل، خبیث! پھر میری شادی ہو جائے گی۔ اس
 لیے کہہ رہی ہوں۔“ اس نے دانت پیسے۔
 ”میں تو پورے محلے میں شیرینی بانٹوں گی۔“ میں
 نے دونوں ہاتھ تشکر سے اٹھائے۔
 میں اس کے ساتھ چلی تو ساتھ فائقہ بھی ہوئی۔
 ”اب تو بس ایک بہن کی نظر سے دیکھوں گی
 اسے۔“ اس نے آہ بھر کے کہا تھا۔
 ”آئی شائستہ ہم تینوں کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔
 ”بڑے موقع سے آئیں۔ آج شہزادہ بھی گھر میں

ہے۔ اچھا ہے تم تینوں سے باضابطہ ملاقات ہو جائے
 گی۔“
 (بے چاری آنی! انہیں پتا ہی نہیں کہ ان کی ناک
 کے نیچے یہ کنٹیناں شہزادہ صاحب کے ساتھ پورا محل
 تعمیر کر چکی ہیں۔)
 مجھے افسوس ہوا۔
 ”بھئی۔ ہمیں بھی شہزادہ سے ملنے کا بہت شوق
 ہے۔ آپ سے ان کی اتنی تعریفیں سنی ہیں کہ بس۔۔۔“
 میں نے مسکرا کر کہا تو وہ اور خوش ہوئیں۔
 ”زرمینہ کے بنائے کھانوں نے تو اسے اپنا دوا نہ
 بنالیا ہے۔ اب میرے ہاتھ کا پکا یا تو اسے اچھا لگی نہیں
 لگتا۔“
 ”اف اللہ!“
 زرمینہ نے لجا کر دوپٹہ اٹھایا اور اس کا کنارہ دانتوں
 میں دبایا۔
 ”ڈویل، کیسی! چھوڑ، میں داوی جان کا دوپٹہ لے
 کے آئی ہوں۔“ فائقہ نے زوردار کہنی اس کی پٹی میں
 ٹھوکی تھی۔
 ”خبیث! میں نے سمجھا تھا میرا دوپٹہ ہے۔“ اس
 نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا اور پٹی سسلانے لگی۔
 ”شہزادہ کو کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ میں نے بات
 کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
 ”بھئی صاف بات ہے خود تو وہ بہت ماڈرن ہے۔
 بھی ظاہر ہے سارا بزنس سنبھالا ہوا ہے، بے حد
 سوشل لائف ہے اس کی، مگر خود اسے ساہ اور خوش
 مزاج سی لڑکیاں پسند ہیں۔ ہر ایرے غیرے سے اس
 کی دوستی نہیں۔ اس کے سرکل میں بہت شریف
 لڑکیاں ہیں۔“
 وہ تقاریر سے بولیں۔ اسی اثناء میں زرمینہ سر پہ
 دوپٹہ لپیٹے ساہ اور شریف نظر آنے کی کوشش میں
 ہلکان ہو رہی تھی۔
 ”لو کے تو لو کے ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے بھی
 شہزادہ کو آئیڈل بنا رکھا ہے۔ بھی بڑی دو بیٹیوں کو بیاہ
 کر، ہم تو بس اسی کے ہو رہے ہیں۔ لیکن اب اس کے



آئی بے حد پیار سے کہہ رہی تھیں، آنے والا
سراٹھنے آچکا تھا۔

”یہ شہزادہ! میں اچھی۔“

فائقہ گنگ تو زرمینہ کی دنگ۔

ذیل کمبھی جھوٹی منڈلی کا گند۔

”ان تینوں کو بھی تم سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔“

آئی اسے اپنے ساتھ لگائے ہم سے تعارف کروا

رہی تھیں۔

اونچا لباقتہ، سرخ و سفید رنگت اس پہ جھکے

نقوش اور خوب صورت آنکھیں۔

اس نے باری باری ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ مگر

زرمینہ کو جس طرح چکر آ رہے تھے وہ ہم دونوں ہی

جانتی تھیں۔

”خدا نے ہمیں بیٹا نہیں دیا، مگر شہزادہ جیسی بیٹی میں

کہتی ہوں وہ ہر کسی کو دے جو ماں باپ کے بھاپے کو

رہنے سے بچالے۔“ وہ پیار سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی

تھیں۔

”او فوہ! آپ بچہ ہی۔ ارے انہیں کیا ہوا؟“

شہزادہ نے ہنک کر کہتے کہتے ایک دم سے لہرا کر

صوفے پر گر گئی زرمینہ کو دیکھا۔

”کچھ نہیں، تھکاوٹ بڑی ہے نا، بے چاری نے

آج دو دو ایک بنائے ہیں۔“

فائقہ کی بیٹی اندر نہیں جا رہی تھی۔ شہزادہ نے

زرمینہ کے پاس بیٹھ کر اس کے رخسار چھلکے۔

اب کسی کی بے ہوشی پر ہنستا ہے تو بہت بری بات،

مگر قارئین کرام! ذرا سوچئے اگر شہزادہ ہونی کی بجائے

شہزادہ ہوتا تو کیا لوہین ہوتا اس وقت۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے، میں اس سڑے بے مہیتر کے

ساتھ ہی خوش ہوں۔“

میں نے پیاری سی شہزادہ کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل

میں لاجول پڑھی اور زرمینہ کی بیٹی کو اٹھائے لگی جو اس

مصنوعی بے ہوشی کے دوران یقیناً ہم سے منٹے کے

طریقے سوچ رہی تھی۔

پاپا کو اس کی شادی کی بھی بہت جلدی ہے، ابھی یہ اپنی

میتا مجھے بہت پسند ہے، شکل صورت مزاج اور ہاتھ کا

ڈانقہ تو اواہ شہزادہ کی اس سے خوب جیتی۔“

وہ بات کرتے کرتے جس طرح ایک دم سے بولیں،

لوچی رشتہ پکا سمجھو۔

زرمینہ کھل کے گلاب ہوئی اور فائقہ جل کر

کباب۔

”میں دیکھوں ذرا شہزادہ کو، کہا بھی تھا چینیج کر کے

فورا“ آجاؤ۔“ آئی اٹھ کر بیڑھیوں کی طرف

برہیں۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے، ان کنواروں کا سلیہ نہیں پڑا

مجھ پر اور اس روہی جاکر سڑی بھی منگنی جیسی کوئی منگنی

میرے لیے نہیں پڑ گئی۔“

زرمینہ نے ہاتھ اٹھائے۔

”اللہ کرے ٹھکانا، کالا کلونا، بھینگی آنکھوں، منجے سر

والا نکل۔“ فائقہ نے دل کے پھپھو لے پھوڑے۔

”تم نے نہیں دیکھا ابھی تک؟“ میں نے شکی

نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہوئی۔

”نہیں، میں تو ایسے ہی ہوں، وہ کبھی گھر میں ملائی

نہیں۔“

”تو پھر زرمینہ نے کب دیکھ لیا، گلاب بھی لے لیا،

یہ بھی جھوٹی لو اسٹوری بنا رہی ہوگی۔“ میں نے

زرمینہ کو گھورا تو وہ مسکرائی، کمرائی، پھر گنگنائی۔

”جلو، جل کلزوں، جل کے خاک ہو جاؤ، وادی

عشق سے میرا شہزادہ آچکا ہے۔“

”شہزادہ جان! اب آج بھی جاؤ، نیچے کوئی بے صبری

سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

آئی کابلہ ابھی کمال کا تھا، ہم تو عش عش کر اٹھے۔

اتنی آزاد خیال ساس۔

کسی کے بیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔

ہماری گردنیں میکانیکی انداز میں اوجھڑ گئیں۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں جان! زرمینہ“

فائقہ اور روہی آئی ہیں، تمہیں کتنا شوق تھا ان سے

ملنے کا۔“

یاد اشکوں میں بہادی ہم نے
آکھ ہر بات بھلا دی ہم نے

گلشنِ دل سے گزرنے کے لیے
غم کو رشتہ صبا دی ہم نے

اب اسی آگ میں جلتے ہیں جے
اپنے دامن سے ہوا دی ہم نے

رہگذر بھتی ہے پائل کی طرح
کس کی آہٹ کو صدا دی ہم نے

غم کی تشریح بہت مشکل تھی
اپنی تصویر دکھا دی ہم نے

غلام محمد قاسم

زود کن ہے فرصتِ عشق کا، زودہ دن ہیں کشفِ جمال کے
مگر اب بھی دل کو جواں رکھیں، وہی معجزے خدا وصال کے

یہ جو گردِ بادِ حیات ہے، کوئی اس کی زد سے بچا نہیں
مگر آج تک تری یاد کو میں رکھوں نہ حالِ نبھال کے

میں امین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبین پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں رسواں کے

مری حسرتوں کو ہر اکھے مری کشتِ جاں کو بھرا رکھے
یہ یقین کہ مجھ پہ کھلیں گے در کسی روزِ بادِ شمال کے

کوئی کوہ کن ہو کہ قیس ہو، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو
سبھی نام ایک ہی شخص کے، بھی پھول ایک ہی ڈال کے

احمد ندیم قاسمی

شگفتہ جاہ رسول کریم ﷺ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”یہ نہیں کھانا ہے جسے تمہارے والدین دن
کے بعد کھا رہے ہیں“
(طبرانی)

سہری باتیں

- ① جہاد کفار اصغر ہے اور جہاد نفس جہاد اکبر ہے۔
(حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- ② مقتدات کا فیصلہ جلد کرنا چاہیے تاکہ دعویٰ
کرنے والا دیر کے باعث کہیں اپنے دعوے سے
عبوداً دستبردار نہ ہو جائے۔
(حضرت عرفان قادری رضی اللہ عنہ)
- ③ تلوار کا زخم جسم پر ہوتا ہے اور بڑی گفتگو کا
روح پر۔
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)
- ④ تیرا نفس تجھ سے وہی کام کرے گا جس کے ساتھ
تو نے اسے مانوس بنایا ہے۔
(حضرت علی رضی اللہ عنہ)
- ⑤ آخرت کا بہترین ثواب تقویٰ اور برائی گاری
ہے۔
(حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ)
- ⑥ حرص سے آدمی مصائب میں پھنس جاتا ہے۔
(حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ)
- ⑦ ہر اچھا کام پہلے ناممکن ہوتا ہے۔
(حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ)

منہ، افسر، کراچی

قہر جہالت

حضرت امام غزالیؒ ایک بستی میں پہنچے جہاں
انہوں نے دو دن قیام فرمایا۔ تیسرے دن صبح سویرے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
عنقریب لوگوں پر دھوکے سے بھر پور سال آئیں
گے۔ ان میں جھوٹے کوست چٹا کھاجائے گا۔ بددیانت
کو امانت دار سمجھا جائے گا اور دیانت دار کو بددیانت
کہا جائے گا اور فیضہ باتیں کریں گے۔
کہا گیا ”رو فیضہ (کا مطلب) کیلے ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خیر آدمی عوام
کے معاملات میں رائے دے گا۔“
(ابن ماجہ 4036)

فوائد و مسائل :-
۱۔ معاشرے میں امن قائم رکھنے کے لیے ضروری
ہے کہ اچھی عادات کی حوصلہ افزائی اور بری
عادات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔
۲۔ جب نیک دیانت دار آدمی کو اس کا جائز مقام
نہ دیا جائے بلکہ جھوٹے بددیانت کی خوش نمائشوں
پر اعتماد کر لیا جائے تو معاشرے کا کوئی مثبت نقطہ
سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

زہد

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ۔
حضرت فاطمہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوکے روٹی
کا ایک ٹکڑا پیش کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا۔

”یہ کیا ہے؟“
حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا ”یہ نکیہ میں نے پکاٹی
تھی۔ مجھے یہ اجماع لگا کہ میں اسے اکیلے ہی کھا لوں تو اس
لیے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ ٹکڑا لے آئی۔“

مت آنکھیں بھر بھر تک بیٹی، تیسرا جانا ہے برحق بیٹی،

تیسرے پہلے ہوں گے ہاتھ کڑے، تیسری ہو گئی بچی بات کڑے
تیسرے من ہی من لڈو بھٹیوں، اور آنکھوں سے برسات کڑے

ہے ست اولاد، نک نفقہ تنکھا، قد کاٹھ بڑا، ہنس مکھ سوہنا
سب دیکھ بھال کر ڈھونڈا ہے، اب آگے تیری برات کڑے

اک منہ اور دو منٹ کھٹ دیوڑ، تینوں اسکول میں پڑھتے ہیں
تیرے سر اور ساس کے ناں تھاں کو ملنے سارا دیہات کڑے

بدلیں گے سب رشتے ناتے، انگ ستاکھ شریک گے ماٹے
کہلائیں گے سب آتے جلتے، جواب تک میں تیرے ساتھ کڑے

سب اپنا آپ بھلا رکھنا، سائیں سے خوب نمیا رکھنا
مردوں کے سرنانوں سے پکے، کڑیوں کی بچی ذات کڑے

ہر وقت قرآن نماز پڑھیں، کم کاج سبھی حج نال کریں
میٹھا بولیں ماں باپ کی ہے، اب لاج تمہارے بات کڑے

میں ماں ہوں پہلے دن سے ہی تجھے میں نے بہرایا دھن جانا
تیسرا باپ سمجھ بیٹھا تجھ کو، اپنے دل کی میقات کڑے

کہتے ہیں پیدا ہوتے ہی بیٹی پردیسن ہوتی ہے
ہو اک دیوار ادھر چاہے، یا پار سمندر سات کڑے

مت آنکھیں بھر بھر تک بیٹی، تیسرا جانا ہے برحق بیٹی
یہ حکم اس کا اور اس کی ذابت صفات ثبات کڑے

علی اکبر عباس

انہوں نے اپنے شاگرد سے کہا۔

”ایسا سامان خود باندھ لو“
شاگرد نے کہا ”یہاں آنے کے لیے آپ نے طویل سفر کی مشقت اٹھائی۔ اب آپ اتنی جلدی کیوں روانہ ہونا چاہتے ہیں؟“

امام غزالی نے فرمایا۔ ”میں اس بستی میں دو دن سے مقیم ہوں اور کوئی علم کا طالب میرے پاس نہیں آیا۔ جس بستی میں علم کا شوق نہ ہو، وہاں عذاب الہی نازل ہو کر رہتا ہے اس لیے جلدی کرو کہ ہم اس زمین سے دور نکل جائیں۔“

حسن

حسن دہلی کا باشندہ تھا، وہ ایک برہمن کا ملازم تھا۔ برہمن نے حسن کو ایک قطرہ آراضی اور بیسوں کی ایک جوڑی دی اور کہا کہ وہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے۔ ایک روز حسن زمین میں ہل چلا رہا تھا کہ اس کا ہل کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ حسن نے ماجر معلوم کیا تو بتا چلا کہ ہل ایک زنجیر سے ٹکرایا ہے جو تانبے کے ایک برتن سے بندھی ہوئی ہے۔ حسن نے برتن کو زمین سے کھود کر نکالا تو دیکھا کہ اس میں طائی سستے بھرے ہوئے ہیں۔ حسن نے خزانہ اپنے برہمن آقا کے پاس لے گیا۔ اس برہمن کو شہزادہ محمد تغلق کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ برہمن نے شہزادہ محمد تغلق کے حضور بابر ساری سرگزشت سنائی اور اپنے مسلہ لازم کی دیانت داری اور اس کے خزانہ لینے کا حال بیان کیا۔ شہزادہ محمد تغلق نے یہ ماجر اپنے باپ کے گوش گزار کیا، جسے شہنشاہ نے حسن کو دیباہ میں طلب کیا اور سو واریوں کی کمان اسے سونپ دی۔ بعد ازاں اسے ایک اطلاع دے برما مو گیا۔ جہاں اس نے اتنی ترقی کی کہ آخر کار اسے اقلیم دکن کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔
”منور، افسر۔ کراچی“

دروغ بے فروغ

ایک کسان کا گھوڑا چوری ہو گیا۔ دوسرے دن بازار لنگ رہا تھا۔ وہ ایک نیا گھوڑا خریدنے کے لیے بازار پہنچا۔ وہاں ایک اصفیل میں دوسرے گھوڑوں کے ساتھ اپنا گھوڑا بھی بندھا ہوا دیکھا۔ اصفیل کے

مالک نے اس سے کہا۔

”یہ تو میرا گھوڑا ہے، جو کل رات کو چوری ہو گیا تھا۔“

اصطیل کے مالک نے جواب دیا۔ ”بالکل غلط۔ یہ تو مال بھرے میسرے پاس ہے۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے میرے بھائی۔“

کسان نے گھوڑے کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا۔ ”خدا کی قسم! آج سچ کہنا، بتاؤ یہ کس آنکھ سے اندھا ہے؟“

اصطیل کے مالک نے کہا۔ ”دائیں آنکھ سے۔“

کسان بولا۔ ”جھوٹ۔“

اصطیل کے مالک نے کہا۔ ”ہاں مجھ سے غلطی ہوئی بائیں آنکھ سے یہ نہیں دیکھت۔“

کسان نے کہا۔ ”یہ بھی جھوٹ، گھوڑے کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں، یہ دیکھو۔“

پھر کسان نے کہا۔ ”ظاہر ہو گیا کہ تو پرلے دیجے گا جو نا، مگر اور خود ہے۔“

اب تو اصطیل کا مالک لالچواب ہو گیا۔ اس کی گنگھی بندھ گئی اور اس سے کوئی جواب نہ نکل سکا۔ وہ چپ چاپ خاموش خستہ رہا۔ کسان نے کہا۔

”اب میں جا رہا ہوں اور گھوڑے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔“

یہ کہہ کسان نے گھوڑے کو باہر نکالا، اس پر بیٹھ کر اسے لٹکائی اور ہوا ہو گیا۔ اصطیل کا مالک

نکمر نکر اسے دیکھتا رہ گیا۔

عاش، تحریم۔ گوجرہ

خزانہ تحسین

ایک تقریب میں ایک معروف مصنف کا تعارف ایک خاتون سے کرایا گیا تو خاتون بولیں۔

”مجھے آپ کی سب کتابیں پسند ہیں۔ خاص طور پر وہ کتاب بہت اچھی تھی۔ کیا نام تھا اس کا۔“

یاد نہیں آ رہا۔ کہانی بھی یاد نہیں آ رہی۔ اسے بھی وہی جس کے ٹائٹل پر ایک ایسی رنگی کی تصویر تھی، جس کی شکل پر عیسے بہت ملتی تھی۔

منزلت مغل۔ آنا داکٹر

رائیگال

شہر اور بیوی کے درمیان شدید جھگڑے کے بعد شہر نے خودکشی کی تھان لی۔ چنانچہ وہ بازار گیا اور زہر خرید لیا۔ پھر بیوی کو دکھاتے ہوئے کھا لیا۔

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ مرا نہیں۔ پس طبیعت ذرا سست ہو گئی۔ بیوی نے سر بیٹ کر کہا۔

”سو بار کہلے کہ چیزیں دیکھ بھال کر خرید کر دو۔“

اتنے سے بھی بے کار گئے اور جس کام کے لیے لائے۔ وہ کام بھی نہیں ہوا۔

مدد، ندا۔ کراچی

موت کا سبب

بوعلی سینا کا بچہ مر چکا تھا۔ دوست احباب۔

عزیز و اقارب تعزیت کے لیے آئے اور طبیب سے طرح طرح کے سوالات کرتے۔ اس دوران میں کسی نے ان سے سوال کیا کہ آخر بچے کی موت کا سبب کیل ہے؟

طبیب نے جواب دیا۔

”مجھے اس کی زندگی کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔“

اس کی موت کا سبب کس طرح بتاؤں؟

افطی۔ کراچی

رمضان مبارک

ڈیوڈ اور مائیکل صحابی کھ گئے۔ جب وہ پیاس سے مرنے کے قریب ہو گئے تو وہ ایک نخلستان میں پہنچے۔ وہاں پر ایک عمارت تھی جو درختوں میں مسجد

لگ رہی تھی۔ ڈیوڈ نے مائیکل سے کہا۔

”دیکھو، ہم یہ ظاہر کر س گے کہ ہم مسلمان ہیں، تو ہمیں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ میں اپنے آپ کو عبداللہ ظاہر کر دوں گا۔“

مائیکل نے اپنا نام بدلنے سے انکار کر دیا۔

مسجد کے پیش امام دونوں کے ساتھ پڑتاک انداز میں پیش آئے۔ ڈیوڈ نے کہا۔

مست، ندا۔ کراچی

”میرا نام عبداللہ ہے۔“

مائیکل نے کہا۔ ”اور میرا نام ہے مائیکل۔“

پیش امام صاحب اپنے مددگار کی جانب مڑے اور کہا۔

”مہربانی فرما کر مائیکل کے لیے کھانے پینے کو کچھ لاؤ۔ پھر وہ ڈیوڈ کی طرف مڑے ہوئے بولے۔“

”بھائی عبداللہ! رمضان مبارک ہو۔“

زیب یوسف۔ آفیسر ذرہ سوسائٹی

لہریں

سب سے پہلے فضا غورث نے اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ کائنات کی ہر شے سے لہریں نکل رہی ہیں۔ یہ لہریں کہیں شور کی شکل اختیار کرتی ہیں اور کہیں شک، خوف اور نفرت کی۔ محبوب کی حقیقت سے ایسی لہریں خارج ہوتی ہیں کہ عاشق کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ سانپ اور شیر کو دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے۔ بچے اور چھیکل سے کہیں آتی ہے۔ کائنات میں ایسے لاتعداد اشخاص و مناظر موجود ہیں جنہیں دیکھ کر عین لذت و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

رضیہ طاہر۔ گوجرانوالہ

عقل مندی

ایک انگریز نے پٹرول پیپ بر سوڈا اور مشین لگی دیکھی۔ اس بر سوڈا وائٹری قیمت دو ڈالر درج تھی۔ یہ قیمت غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ اس نے پٹرول پیپ کے مالک سے وجہ دریافت کی۔

مالک نے جواب دیا۔

”مشین کام نہیں کر رہی۔ پہلے میں نے اس پر لکھ کر لگایا کہ مشین خراب ہے لیکن پھر بھی لوگ اس میں سکے ڈال دیتے۔ جب ان کا سکہ ضائع ہوتا تو شکارت کرتے۔ اب میں نے یہ لکھ کر لگایا ہے تو کسی کی رقم ضائع نہیں ہوتی۔“

حزق فریدی۔ ملتان

خوف

ضروریات جسمانی کے لیے ہماری مجنونانہ تگ و دو کی وجہ خوف ہے۔ مستقبل کا خوف، اولاد کے قلائش ہو جانے کا خوف، حالات کے اچانک بگڑ جانے کا خوف اور آلام و امراض کا خوف۔ اس کا واحد علاج اللہ کی پناہ میں آنا ہے۔
نازش رحمان۔ کراچی

داؤ پیچ

چار ہفتوں ایک دیہی رستوران میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو پہلوان تھا، ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ لوگ فارغ ہوئے تو انہوں نے کھر کی ناہ لی۔ کھیتوں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا ایک سانڈ سے ہو گیا۔ پلاؤں نے آگے بڑھ کر سانڈ کے دونوں سینک پکڑ لیے اور اپنے داؤ پیچ آزمائے لگا۔ پانچ دس منٹ میں سانڈ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔
پہلوان اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا: تم لوگ مضحک ہی کہتے تھے کہ میں کچھ زیادہ ہی پی گیا ہوں اس سانڈ کی سوار بدعاش کو نیچے گھسیٹ کر اس کی بڈی پسلی ایک کر دیتا۔
نمل، زینب۔ علی زئی

غالب کے بچے

اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کے سات بچے ہوئے، لیکن کوئی زندہ نہ رہا۔ اپنی بیوی کے بچلے تین العابدین خاں عارف کو اپنی فرزندگی میں لیا تو وہ بھی نوجوانی میں فوت ہو گیا۔ اس پر انہوں نے ایک دردناک مریضہ کہا۔
سے لازم تھا کہ دیکھو مراد سے کوئی دن اود تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اود اس کے بعد عارف کے دو کمین بیٹوں کی پرورش کرتے رہے۔ غالب بہت فرائخ دل اور ہمدرد آدمی تھے۔ ہر خط کا جواب لکھنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ کوئی نادانف بھی اصل کار کے لیے کلام بھیجتا

تو اصلاح کیے بغیر واپس نہ کرتے۔ اگر کوئی جوانب کے لیے ٹکٹ بھیجتا تو ناراض ہوتے۔ اپنے شاگردوں کو بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے۔

کہیں قاتل نہیں ملتے

ہے آدم سے کوئی نسبت نہ ہے بندے خد کے ہیں جو کھلیں خون کی ہوئی وہ رب کے سب دندہ ہیں کسی کی لاش نہ کول برا بھی ملتی ہے پوری میں کہیں قاتل نہیں ملتے سب ہی آزاد پھرتے ہیں

تکبر

جارج برنارڈشا کی ظرافت اور شوخی طبع مشہور ہے اس عظیم درامانگار نے برطانیہ کے امراء کو بھی دو خور اعتنا نہ سمجھا کہ ان کی نوازی سے مغرب ہوتا۔ ادھر یہ امراء اس کی خاطر جھکنے کو تیار نہ تھے۔ ایک بار ایک بد مزاج اور متکبر لارڈ نے جو ادب دوست بھی تھا۔ گراہنی آنکے سبب اس ادیب کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھا۔ ایک خط برنارڈشا کو لکھا۔
"لارڈ جارج پٹر آف سالبری جو عورت کو شام چھ بجے سے سات بجے تک گھر پر رہیں گے"
برنارڈشا کو اس متکبرانہ دعوت پر براغضب آیا۔ اس نے خط پر جملہ کچھ کر واپس بھیج دیا۔
"جارج برنارڈشا بھی اس وقت گھر پر ہوں گے"

ڈسپلن

میسر والد نے مجھے سکھا یا کہ سیلف ڈسپلن کے ذریعے ہی تم آزادی حاصل کر سکتے ہو۔ گلاس میں پانی ڈالو۔ پھر تم اسے پی سکتے ہو۔ گلاس کے بغیر پانی چھلکے گا۔ گلاس ڈسپلن ہے۔ (اڈاکا ڈوماسٹک ہان)
فاکھ فردوس۔ بہاول پور



خالہ جیلانی



رضوانہ شکیل راؤ لودھراں

کوئی بھی ملت نہیں ہے لوٹ جاہت کا این کوئی پتھروں کے دیس میں جذبے آکاؤں کس طرح تیرے بس میں تھا کہ تجھے تو نے تنہا کر دیا میں تجھے آخر بھلاؤں تو بھلاؤں کس طرح

شازیہ رانا دیپال پور

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہوتا ہے کہ اشک و گنا تم سے محال ہوتا ہے ملیں گی ہم کو کبھی اپنے نصیب کی خوشحال بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے

دخشاں بی پونال

لوگوں کی بے حسی کے مناظر ہیں چارو فرصت ملے تو جہنم ندامت اٹھائے ساڑھ سنکریال یہ دکھ نہیں کہ اندھروں سے کی طرح ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

اسما رحمان کراچی

اجھا تمہارے شہر کا دستور ہو گیا جس کو گھلے لگا لیا وہ دود ہو گیا وادی سے کہنا اس کی کہانی سنائے جو بادشاہ عشق میں مزدود ہو گیا

خبیبہ شمشاد یزمان

اکتاب عشق روایت میں مختلف ہو کر حوالے ایک سے ہیں، سارے باب ایک سے ہیں ربیع نظامانی نندو محمد خان

قص میں خیر سے موسم ہمیشہ کم بدلتے ہیں قص کے پار بھی دیکھا، ابھی موسم نہیں بدلا فضا میں جال بھیلے ہیں، نہیں جالے اماں امجد کہ ہے صیاد کا پہرا، ابھی موسم نہیں بدلا

رونا اختر نارتھ کراچی

دو ہی لفظوں کا تھا وہ اضافہ جو سنا کر خاموش ہو بیٹھے ابتدا یہ کہ تم کو چاہا تھا انتہا یہ کہ تم کو کھو بیٹھے

شادہ شبیر رانا رحمان گڑھ

نہیں ہے میری قرار گاہ نہ نکسے منزل جذب و دل بڑی دیر ہے سفر میرا، تیری یاد سے تیری بلونک صبا سلیم نندو محمد

نہ بوجھ کیے گزرتی ہے زندگی ناظر بس ایک جبر ہے یہ اختیار ہے بھی

عالیہ کراچی

ایک نگاہ برضی، اک بول پتھر سا آدمی نہیں مرا صرف خون بہنے سے منزل ملے نہ مل سکے، اب اس کا غم نہیں جنگل ہر پہرے دور تلک راستہ تو ہے آنکھیں کہیں ہیں، دل ہے ہیں دھیان ہے نہیں آن دیکھئے راہیوں کا کوئی سلسلہ تو ہے

فرح انور لاہور

اک فضلے بیٹھے ہیں ہوں رقص ہے، سر سے، گیت ہے میں ہوں اور جنت بھلا کہاں ہو گی شام ہے، تم ہو، بریت ہے، میں ہوں

صبا اعجاز پٹنہ بھیناں

وقت کی جو قہم گئی رفتار تو زندگی میں ہو گیا کم پیار تو آئینہ آجلا ہے آجلا عکس بھی اور دھندلا ہو گیا اک بار تو

ناز گل بخاری کوئٹہ
یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گاہن
صبا سلیم منڈو جان محمد
دیکھ آئے آج یادوں کا نگر
ہر طرف پر چھائیاں پر چھائیاں
بینا خان کھنڈ (جواب)
وہ کھیل تھا مذاق تھا یا خوف تھا کوئی
اک چال چل کے اُس نے مہرہ بدل دیا
کرتار دیا اسیری کے احساس کو شدید
زنجیر کھول دی کبھی پہرہ بدل دیا
سمیع لیاقت علی سندھو اڈہ وڈانہ تصور
کھولیں مٹی کہ اک بگنو نہ نکلے ہاتھ سے
آنکھ کو ایسے چمک کہ کوئی ادھل نہ ہو
پہلی سیرھی پر قدم رکھ آخری سیرھی پہ آنکھ
منزلوں کی جستجو میں، رائیگاں کوئی بل نہ ہو
روزی ہنیم میر پور خاص
آدی کرنے لگا ہے جب سے من مانی بہت
اس نے خود ہی پال رکھی ہے پریشانی بہت
پیادوں میں، نرم لہجہ، حوصلہ بلند رکھو
اے مٹی ہو جانے لگی بیٹے میں آسانی بہت
یہی ستار مہراں یوسف پوری
کوئی تو اس ہوا سے پوچھتا ہے محنت
ملا کیا ہے اُسے کیوں تجوئے مگر کے
سارہ مبشر انک
اُبھرتے دوبتے سورج سے تو دلوں رشتہ
میں شام اور صبح کے سوجاؤں اور محو نہ کروں
اب اس سے بڑھ کے بھلا کیا ہوا قتل و قافا
میں تیرے شہر سے گردوں کے تھے خبر نہ کروں
عرشہ صدف کراچی
جس کی آواز میں سلوٹ ہو لگا ہوں میں شکر
ایسی تصویر کے ٹکڑے نہیں جوڑا کہتے
لگس کے ساحل سے جو بہتا ہے اسے بہتے دو
ایسے دریا کا کبھی رخ نہیں مورا کرتے
ربیع نظامانی منڈو محمد خان
بغیر اذن کے آیا ہوں تیرے دفتر میں
تو چونک تھوڑا سا، گھٹی بجی، بگڑا تو مٹی

سونیا ربانی تاضیاں عکس بالاً
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناولک دوغنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرہ ملامت
اس عشق نہ اُس عشق پر نادم ہے مگر
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت
نسبت گیلانی کبر و پیکار
نشر چھپے ہوئے تھے دگ جال کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے دُراسی کا تھا
سیدہ نسبت ذہرہ کبر و پیکار
ہر اک راہ پہ انگلی پکڑ کر چلتا رہا
پھر گیا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات سے وہ
زبان کی زد میں دہے ذائقہ جدائی کا
اسی لیے ہے گریزاں مذاکرات سے وہ
گردا شاہ کبر و پیکار
نہ لگے دہے نہ گماں دہے نہ گزراشیں میں نہ شکو
وہ نشاط و عہد وصل کیا ہمیں اعتبار بھی اب نہیں
سید زائدہ کوئٹہ
جو کچھ دیکھا جو سوچا ہے وہی تحریر کرنا میں
جو اپنے خستہ کاہے وہ کاغذ تو کھجائیں
نیشے میں نیند کے تارے بھی اک دو بے رنگتے ہیں
تھکن دستوں کی کہی ہے پلو اب اپنے کمر جائیں
مست حسن سعودی عرب
جو درد کے صحرائیں اکسلا بھی بہت ہے
اس کے لیے دیوار کا سایہ بھی بہت ہے
دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے بھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ دیا بھی بہت ہے
اسلمہ رحمان کراچی
اک تقریب میں کوئی ملا تھا یاد رہا
آنکھ چمکتا بھول گئی تھی سانس رکھا تھا یاد رہا



آیت الصبیحہ

خاتونِ داڑی

میدہ نسبت زہرہ کے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر علامہ اقبال کی یہ غزل تمام
قاری بہنوں کی نذر
انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نزلے ہیں
یہ عاشق کون سی لبتی کے یارب رہتے والے ہیں
علاج درد میں بھی، درد کی لذت پر مہربانوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں

بھلا بھولا رہے یارب جن میری امیدوں کا
بگڑ خون دے دے کر یہ لوٹے میں نے پالے ہیں
رلائی ہے رات مجھ کو خاموشی تاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نزلے میرے نلے ہیں

نہ پوچھ مجھ سے لذتِ خانماں برادری کی
نشین سینکڑوں میں نے بنا کر بھونک ڈالیں
میرے اشعار اے اقبال کیوں نہ ہوں مجھ کو عزیز
میرے غوٹے ہوئے دل کے یہ درد انکیتر نالیں

سمیر خان کے ڈاڑی سے

"نسخہ ہائے دفا سے" نہایت خوبصورت اور حبیب
حال غزل بھی پڑھنے والوں کے نام۔
پھر لوٹا ہے خورشید جہاں تابِ سفر سے
پھر نورِ سحرِ دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے، ہر دیدہ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کھڑ کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک رہگزر سے

وہ رنگ سے اسالِ گلستاں کی فضا کا
اوچھل ہوئی دیوانہ قرضِ قدرِ نظر سے

پاپوش کی کیا فکر ہے دستارِ سنہا لو
ہا یا اب ہے جو مون گزرجانے کی سر سے

نورین بھٹل کے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر سلیم کوثر کی یہ نظم آپ
سب قارئین بہنوں کے نام۔
پرندے بادلوں میں چنب چنب کر کیسے لگناتے ہیں
زمین کے کھدے تاروں کو جلتے ہیں
ہوا سرگوشیوں کے جال بنتی ہے
میری آواز سنتی ہے
تمہیں فرصت ملے تو دیکھنا
لہروں میں اک کشتی ہے
اور کشتی میں اک تنہا مسافر ہے
مسافر کے لبوں پر واپسی کے گیت
لہروں کی سبک گامی میں دھلے
داستان کہتے
جزیروں میں کہیں بے
پرانے ساحلوں پہ گونجتے رہتے

کس مابھی کے نعروں سے مجھے مل کر پلٹے ہیں
ابھی کچھ سایہ باقی ہے، تہا امیر اساتذہ باقی ہے
آندھیوں میں چھٹا اک روشنی کا ہاتھ باقی ہے

آتم سعد کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر جمال احسانی کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ سب قارئین بہنوں کو بھی مزہ پسند آئے گی۔ کیونکہ یہ جمال احسانی کے قلم کا ایک شام کا ہے۔

سردوب ناروا کا اس لیے شکوہ نہیں کرتا
کہ میں بھی تو کسی بات کی بردہ نہیں کرتا
بہت ہوشیار ہوں اپنی لڑائی آپ لڑا ہوں
میں دل کی بات مگر دیوار پر لکھا نہیں کرتا

اگر بڑے عادت آپ اپنے ساتھ رہنے کی
یہ ساتھ ایسا ہے کہ انسان کو تنہا نہیں کرتا

زہیں، بیروں سے کتنی بادل میں نکلتی ہے
میں ایسے حادثوں پر دل مگر چھوٹا نہیں کرتا

ترا اصرار سر آنکھوں پر تھوڑے کھول جانے کی
میں کوشش کر کے دیکھوں گا مگر وعدہ نہیں کرتا

را بد بخاری کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل آپ بھی پڑھیے۔ ان کی شاعری ہمیشہ دل کو چھو لیتی ہے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔

در نقش سے بے جب صبا گزرتی ہے
کے خنجر کہ امیروں پہ کیا گزرتی ہے

تعلقات کبھی اس قدر نہ ٹوٹے تھے
کہ تیری یاد بھی دل سے خفا گزرتی ہے

وہ اب ملے بھی تو ملتا ہے اس طرح سے
نچے چراغوں کو چھو کر ہوا گزرتی ہے

یہ اہل ہجر کی بستی ہے احتیاط سے چل
میں بتوں کی یہاں آتہا گزرتی ہے
نہ پوچھ اپنی انا کی بغاوتیں حسن
دہر قبول سے نکال کر دعا گزرتی ہے

مینا بلبل و داغ کے ڈائری سے

منور جمیل نے دلوں کے جذبات، خدشات اور

خوش فہمیاں سارے ہی دکھوں کو نارسائی میں سویا
ہے۔ میری ڈائری میں تحریر یہ نظم "نارسانی" آپ
سب بہنوں کے لیے۔

غیب رشتہ ہے یہ ترک مطلب کا
کہ جواب تک روئیں کی ٹھہرتی
برف کی جادو میں امانت چھپائے
اپنے ہونے کی لڑائی لڑ رہا ہے

اور ایسے بے درود دیوارِ زنداں میں مقید ہے
جہاں معصوم روئیں فکرِ ذرا سے پر اماں ہیں
جہاں خواب کی دیکیں فضا میں ہیں نہیں سکتیں
جہاں سچائیاں بھی اپنے بچے جن نہیں سکتیں

جہاں پردہ دہشت کے وارثے آزار ہوتے ہیں
جہاں پر زندگی کے حوصلے سہا ہوتے ہیں
جہاں پر حرفِ تسلی بھی یونہی بے کار لگتے ہے
جہاں زورِ عزم و تکیہ بجز سے دامن چھڑاتے ہیں

دعاؤں کے پرندے راستوں سے ٹوٹ جاتے ہیں
جہاں پر تکیوں کے پر بھی رنگوں سے مکر جاتے ہیں
جہاں پر گیت سارے فاختاؤں کے بکھر جاتے ہیں
یہی وہ عالمِ حیرت ہے ہوشِ بد گمانی ہے

جہاں دل کی حوصلی میں وفا پر باد رہتی ہے
یقین کے باب میں ساری فضا ناٹا رہتی ہے
یہاں ذہنوں پہ کوئی خوش خیالی چھان نہیں سکتی
محنت بن کے اس دہ پر سواری آ نہیں سکتی



عزیزتیق الرحمن لاہور

اپنے عزیز رسالے کی خدمت میں دوبارہ حاضری دے
رہی ہوں۔ پہلی مرتبہ خط لکھا تھا؟ یہ بتانے کے لیے
بہت پیچھے جانا پڑے گا غالباً "میں بائیس برس پیچھے اس
وقت خواتین میں رفعت سراج کانول شاہکار قسط وار شائع
ہو رہا تھا اور میں نے اس پر تبصرہ کیا تھا۔ اس وقت میں
ایف اے کی طالبہ تھی۔" خواتین سے رشتہ 1984ء
میں استوار ہوا تھا جو کہ آج تک قائم و دائم ہے۔ اگرچہ
حکام دنیا نے رشتہ توڑنے کی بہت کوششیں کیں۔ لیکن
میری مستقل مزاجی (ڈھٹائی) کی داد دیجیے کہ خواتین کا
دامن نہ چھوڑا (حکام دنیا میں میاں جانی اور کیوٹ کیوٹ
سے چھپے میرے اپنے ذاتی بھی شامل ہیں۔
خواتین اور شعاع میرے لیے کیا ہیں؟ اس سوال کا
جواب بہت مفصل ہے اتنا طویل کہ اگر آپ شائع کریں تو
صرف میرا خط ہی شامل ہو جائے۔

میں نے نفسیات میں ایم اے کیا ہے لیکن جتنا شعور اور
آگہی عرفان ذات (جیسے ہے کی پہچان خود اعتمادی مجھے
ان رسالوں نے دی میری تعلیم نہ دے سکی۔ ان کو مشکل راہ
کہوں یا مینار نور، سبکی کی طرح ہمارا زہد و کسوں یا ماں
بہنوں کی طرح محبتیں بانٹنے والے اور صحیح رستہ دکھانے
والے فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ تو ضرور کہوں گی کہ اگر
آج سے چھپیں سال پہلے جب میں بارہ برس کی بچی عمر اور
سچی عقل کی لڑکی تھی خواتین سے تعلق نہ بناتا تو آج میں وہ
نہ ہوتی جو ہوں۔

نادرہ کھاتون
پہنچا کرے

خط بھجوانے کے لیے بتا

خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

اس رسالے نے بہت جگہ میری رہنمائی کی اور کبھی
سیدھے راستے سے بھٹکنے کا خیال تک دل میں نہ آئے دیا۔
بہت شکریہ خواتین ڈائجسٹ۔

اب تازہ رسالے پر تبصرہ، سرورق حسب معمول خوب
تھا۔ لیکن اگر جاندار تصاویر سے پاک سرورق ہو تو کیا یہی
بات ہو۔ کیونکہ تصاویر کی وجہ سے اس کو چھپا کر رکھنا پڑتا
ہے (بکہ ملائکہ رحمت ہمارے گھر میں آئیں) سب سے
پہلے عمر احمد کے ناول کے متعلق بہت زبردست ناول تھا۔
لیکن ناول کے اختتام نے ابامید اکر دیا۔

اس دفعہ کے افسانے سب کمزور تھے۔ بالکل پسند نہیں
آئے۔ ناول بس سوسو تھے۔ (بہت کوشش کرتی ہوں کہ
انکس کے لفظ استعمال نہ کروں لیکن پھر بھی سوسو قلم سے
نکل ہی گیا۔

"چراغِ آخر شب" خوب جا رہا ہے۔ اس ناول سے
پہلے رفعت ناہید سجاد کی دو تحریریں خواتین میں شائع ہوئی
تھیں جو مجھے یاد ہیں۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ یہ مصنفہ
اب کیوں نہیں لکھتیں بہر حال خواہش پوری ہوئی۔ بہت
مزہ آتا ہے پڑھ کر۔

ہمارا کوکب بخاری اور رفعت سراج بہت یاد آتی ہیں۔
ان کی تحریریں آج بھی جاننے میں محفوظ ہیں مہربانی فرما کر
ان دونوں کی کوئی پرانی سی تحریر شائع کریں۔

"محبت خواب سفر میں حالات اس جگہ پر جا رہے ہیں کہ
گلتا ہے کہ لائبہ کا بھائی تھڑیل ہے ہمارا ہمارا کوکب بخاری کا
ناول ماد آتا ہے جس میں ہیروئن اپنے سنگے بیٹے کو نام کی

معاشرت کی وجہ سے اس شخص کا بیٹا سمجھتی ہے جس نے اس کو برباد کیا تھا اور اس کو اپنی نفرت کا نشانہ بنائی ہے لیکن آخر میں یہ چلتا ہے کہ وہ اس کا بیٹا بناتا تھا جس کو پیدا ہونے ہی ہیروئن کی ماں نے بدنامی کے خوف سے یتیم خانے کے باہر رکھ دیا تھا۔ یہ کہانی بھی دوبارہ شائع کرنے کی فرمائش ہے۔

ج : غزنی ایک طویل مدت بعد آپ نے خط لکھا، دلی مسرت ہوئی۔ زندگی کے سفر میں آپ آگے بڑھتی رہیں۔ تعلیم مکمل کی نشاۃ ہوئی۔ بچوں کی پیدائش، ان کی پرورش اور تربیت کا سلسلہ ان سب مصروفیات کے دوران آپ نے خواتین ڈائجسٹ سے تعلق برقرار رکھا۔ یہ ہمارے لیے اعزاز ہے۔

پرائی کمانیوں کے متعلق آپ کی شکایت نوٹ کر لی ہے، آئندہ احتیاط رکھیں گے۔ ہمارے گھبراہٹ کی کہانی کا نام بتادیں تو آپ کی فرمائش پوری کر دیتے۔ قارئین میں سے کسی کو یاد ہو تو ہمیں خط لکھ کر فون کر کے بتادیں۔

رفعت ناہید سجاد ہماری بھی بے حد پسندیدہ مصنفہ ہیں ایک طویل واقعہ کے بعد ہمارے بے حد اصرار پر انہوں نے یہ ناول لکھا ہے۔

فرزین صدیق نے یہ ایک میل ہمیں لاہور سے بھیجی ہے، لکھتی ہیں۔

آئی ایم سی اے کی طالبہ ہوں۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں میرے امتحان ہیں آپ میرے لیے دعا کیجئے گا۔ سارا دن آفس میں گزر جاتا ہے۔ کیونکہ انٹرن شپ چل رہی ہے۔ شام کو کالج جاتی ہوں تو رات دس بجے واپس آتی ہوں، اتنے نف روٹین میں بھی میں پرچار پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتی ہوں۔ پلیز اس بار سب سے پہلے نمبر کے ناول کی آخری قسط پڑھی۔ انہوں نے بہت اچھا لکھا۔ آخر تک سیسپنس برقرار تھا۔ لیکن مایا کی حقیقت بہت شاندار تھی۔ مجھے بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ اس کے حوالے سے ذہن میں جو خاکہ بنا ہوا تھا وہ سارا منح و گیا۔ لیکن بد رعنا زان پر بھی بہت غصہ آیا۔ انسان تو اپنے محبوب کی سو خطا میں معاف کر دیتا ہے اور کیا محبت صرف اچھائی سے ہی ہوتی ہے؟ حالانکہ اس نے بدر کو چھانی کے پسند سے بھی بچایا۔ مگر بدر نے احسان فراموشی کی لیکن مایا نے بھی اچھا انتقام لیا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی مایا نے

کہا تھا کہ محبت کرو تو دل میں ایک قبرستان بچو، ہناؤ جس میں محبوب کی سب خامیوں کو دفن کر دو۔ تو اگر بدر نے اس کو معاف نہ کیا تو اس نے بھی کیا کیا؟ یہ ان دونوں کی کسی محبت تھی؟ بہر حال ناول اچھا تھا۔ ول و ان نمرو! "محبت خواب سفر" بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تنزل لائبر کا بھائی ہے لیکن اب اس ناول کو جلدی ختم ہو جانا چاہیے۔ رفعت ناہید اچھا لکھ رہی ہیں۔ ان کے لکھنے کا مخصوص انداز ہے اگر ناول پر ان کا نام نہ بھی لکھا ہو تو ان کے انداز بیان دیکھ کر ہی یہ چل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے باقی ڈائجسٹ پسند نہیں آیا۔ البتہ مشتعل سلسلے اچھے تھے۔

ج : فرزین صدیق! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی دے، آپ نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر ہمیں یاد کیا۔ بہت شکریہ، متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچانی جا رہی ہے۔

مومنہ اقبال، صفدر آباد

یہ پہلا خط ہے گزشتہ آٹھ سالوں سے میں شعاع و خواتین کی قاری ہوں۔ وجہ: "نمرو احمد کا ناول" "پیلی راجپوتانہ کی ملکہ" بہت منفرد تحریر تھی بہت اچھا لکھا یہ ناول مایا نے واقعی کمال ادکاری کی۔ جاتے جاتے وہ بدر کو پھینٹاؤے کا عم دے گئی۔ کیا ایسا ہونا چاہیے تھا؟ اور "چراغِ آخر شب" سلسلے وار ناول اپنی طوالت کے باوجود بہت پسند ہے۔

ج : پیاری مومنہ! خط شائع نہ ہونے کے ڈر سے ہماری بہت سی قارئین ہمیں خط نہیں لکھتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ڈر بے معنی ہے کیونکہ خط لکھنے کا مقصد اپنی رائے ہم تک پہنچانا ہے نہ کہ شائع ہونا۔

آٹھ سال بعد آپ نے خط لکھا بہت خوش ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فوزیہ شمرٹ، طیبہ عمران بٹ، گجرات

نمرو احمد کا ناول "پیلی راجپوتانہ کی ملکہ" پڑھا میری اور بھائی (طیبہ عمران) کی بھی رائے تھی کہ بھوت یا تو بدر ہے یا پیر مایا اور اصل ڈرامہ مایا ہی ہے۔ شیکھر کو مایا نے ہی قتل کروایا ہو گا۔ مگر ہمارے سب آئندے فلاب ہو گئے

اور کہانی ایک ہیرو کے کی خاطر شروع ہوئی اور ہیرو ہے ہی ختم ہو گئی مگر مایا نے بدر کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا ایک تو اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ دوسرا اپنی محبت سے بدر کو آزاد بھی نہیں ہونے دیا۔ محبت خواب سفر یکسانیت کا شکار ہونا نظر آرہا ہے رخصانہ جی پلیز اس کو اب سمیٹ لیں۔ کہانی کا اینڈ تو سب کو نظر آرہا ہے کہ کیا اب ہونا ہے۔ ناول تینوں اچھے تھے۔ "صراطِ مستقیم" بہت اچھا لکھا تھا۔ مستقیم اگر بہت کرتا۔ تو شاید ناول کی زندگی میں بھی ہمارا آجانی۔ کشمکش ایک اچھی تحریر تھی۔ کلیوں کا نوہ۔ کینز نبوی کی اچھی تحریر تھی۔ کینز نبوی کی اسندہ سے بی لاٹنگ کر لی ہیں۔ کیونکہ ان کی خبروں میں ہمیشہ عورت کی مظلومیت نظر آتی ہے۔ خواتین کے سب سلسلے مجھے بہت پسند ہیں۔ خاص کر "کرن کرن روشنی" یہ سلسلہ تو میرا فیورٹ ہے۔ یہ سلسلہ اب ہمیں ایک درس کی طرح لگتا ہے جو براہِ خواتین ڈائجسٹ سے ہمیں ملتا ہے۔

ج : فوزیہ اور مگر مایا نے بدر کی محبت کو نہیں ٹھکرایا، بدر نے خود انکار کیا تھا اسی لیے اس نے بدر کو انقضا "اپنی محبت سے آزاد نہیں ہونے دیا۔ کینز نبوی کا تعلق سندھ سے ہے لیکن صرف سندھ کی ہی عورت مظلوم نہیں ہے بلکہ بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں بھی عورت کو وہ حقوق نہیں دیے جاتے جو ہمارے۔ سب میں دیے گئے ہیں۔ آپ نے خط لکھا۔ بہت اچھا لکھا۔ خواتین کے ہر سلسلے میں آپ شرکت کر سکتی ہیں۔

مینا خان، کٹھ خوشاب

خواتین شعاع اور کرن سے چوتھی جماعت سے تعلق جڑا ہوا ہے۔ آپ ہی کے کیا کسی بھی رسالے میں ہمارا پہلا خط ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سے خط لکھوایا ہے نمبر 1 "محبت خواب سفر" نے یقین کریں اتنی چنگلی اور بے ساختہ بن اک تسلسل کے ساتھ دیکھنے کو بہت کم ملتا ہے۔ آپ کی اور مصنفین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

ہاں یہ ہے کہ بہتری کی فحاش تو بہر حال شاہکاروں میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے آپ کی تمام مصنفات ہماری فیورٹ ہیں۔

ج : پیاری مینا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ امید ہے آئندہ بھی شرکت کر کے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کر رہیں گی۔

حفصہ نے یہ ای میل ہمیں فیصل آباد سے بھیجی ہے، لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے تو آپ کو مبارک باد کہ آپ لوگ ادب

کی اتنے طویل عرصے سے خدمت کر رہے ہیں۔ نیچر فیم خان کا "عشق سبز نہیں جھوٹا" عجیب و غریب تحریر تھی۔ جس میں مصنفہ کو انتقام کی زیادہ ہی جلدی تھی جو وہ کسی بھی کردار سے انصاف نہ کر سکیں۔ عالیہ بخاری کی حساب نہ مانگو، بہت اچھی کاوش تھی۔ نمرو احمد کی "پیلی راجپوتانہ" ایک انتہائی پکاکہ کہانی ثابت ہوئی۔ جس کا تاریخ تو کیا حقیقت سے بھی واسطہ نظر نہیں آتا۔ اصل میں آپ کے رہنے نے ہمیں اتنا حقیقت پسند بنادیا ہے کہ اس قدر کشمکش، غم نہیں ہوتا۔ ثروت نذیر کی "صراطِ مستقیم" بہترین کہانی تھی۔ کینز نبوی کا "کلیوں کا نوہ" بھی قابلِ غور کہانی تھی۔ آسیہ رزاقی کا ناول بہت پرانے ٹاپک پر تھا۔ سعدی حیدر جو دھری کا افسانہ بس ٹھیک تھا۔ کاشفہ، حسین کا "شہناش" پڑھ کر دل سے دعا لگی کہ اللہ سب کو ایسی ہی ہووے اور ہمیں ایسی ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ "چراغِ آخر شب" سلو پوائزن کی طرح روح تک پہنچ رہی ہے۔ آخر میں میری مونس فیورٹ راکشہ رخصانہ جی! ان کے ناول کی ایک بھی قسط پور نہیں گئی۔ میں تو فہرست میں ان کا نام دیکھ کر ہی سمجھ جاتی ہوں کہ تحریر معیاری ہوگی۔ ویل و ان رخصانہ جی!

ج : حفصہ! یاد آوری کا شکریہ۔ نمرو کی کہانی تاریخی نہیں تھی اس کا پس منظر تاریخ کا ایک حصہ تھا۔ جہاں تک حقیقت سے دور ہونے کا تعلق ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ تاریخ کے صفحات کھولیں تو ایسی کئی کہانیاں بکھری نظر آتی ہیں۔ رفعت ناہید سجاد کے ناول کے لیے آپ نے سلو پوائزن کی اصطلاح استعمال کی کچھ عجیب لگی ہے اسے تعریف سمجھیں یا نہ؟

خانیہ ثانی، سویت پاکستان

"پیلی راجپوتانہ کی ملکہ" "پیلی واقعات کی طرح تیسری اور آخری قسط بھی خوب رہی گرائیڈ تو قعات کے برعکس۔ ناول میں سے یہ اقتباس میری ڈائری کی زینت بن گیا۔ "جن سے محبت کی جاتی ہے من کے لیے دل میں ایک قبرستان بھی بنادیا جاتا ہے جس میں اپنے محبوب کی ساری خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور ان پر کتبے بھی نہیں لگائے

جاتے۔

”محبت خواب سفر“ پڑھا۔ قسط اچھی تھی مگر اس کا جلدی اینڈ ہو جانا چاہیے۔ عزم کو دائم سے ملائیں اور قارئین سے دعا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگی میں شریعت نذیر کا قہر طاعت متعظیم اور آسہ رزاقی کا پھٹتا دلوں کے سوا ہمیشہ کی طرح خوب رہے۔ نیز فہم کی کاوش اور مستقل سلسلے بھی بہترین تھے اور فرحت اشتیاق جی! اپنی اہمیت جتانے کے لیے کسی سے دور ہونا تو ضروری ٹھہرتا ہے مگر اس قدر بھی نہیں کہ وہ آپ کے بغیر جینا سیکھ لے۔ فقط یہی کہنا چاہوں گی کہ ہم سب شکر ہیں۔

اور عمید احمد جی!

لگتا ہے بیوی کی کشش کے سامنے ہماری محبتیں نامراد ٹھہرس۔ شاید ہم آپ کے دل کے دروازے وا نہ کر سکے۔ راحت فتح علی خان کے انٹرویو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: پیاری ثانیہ! راحت فتح علی خان کے انٹرویو کی فرمائش ٹوٹ کر لی گئی ہے۔ آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کے پیغام پہنچا رہے ہیں۔

شملہ ربانی۔۔۔ سایہ وال

”پیلی راجپوتان کی ملکہ“ یار نمبر اتنا سگوار اینڈ؟ مایانے محبت میں بہت خود غرضی دکھائی پھلا کوئی ایسے بھی کوئی کرتا ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس کے لیے تو ہر قربانی دی جاتی ہے۔ اب بد ساری زندگی مایا کو اچھا سمجھتا رہے گا۔ نہ بد کو محبت ملے گی اور نہ چاری زہر کو۔ کتنا دھوکا دیا ہے مایانے سب کو ویسے اسٹوری بہت اچھی تھی۔ کمائی شروع سے آخر تک گرفت میں رکھا۔

فرحت اشتیاق آپ کہاں غائب ہیں؟ کوئی زبردست سانول دیکھ کر انٹری دیں۔ لیکن ایٹھ اینڈ والا یہ نہ ہو کوئی ہیرو صاحب عالی کی طرح مرجائیں یا سعد کی طرح پلیس ہی نہ۔ نایاب جیلانی اچھی رائٹرز ہیں۔ مجھے ان کی تمام تحریریں پسند ہیں خاص کر صبح کی شہری۔

ج: پیاری شملہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ صرف ایک کمائی پر تبصرہ پڑھ کر مزنہ نہیں آیا۔ آئندہ تفصیلی تبصروں کیجئے گا۔ فرحت اشتیاق تک آپ کی فرمائش پہنچانی جاری ہے۔

یہ ای میل ہمیں عظمیٰ ارم نے لکھی ہے جو اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں۔

”محبت خواب سفر“ میں جس خوب صورتی سے کمائی کو پھیلا یا گیا ہے اتنی ہی کامیابی سے سمیٹا بھی جا رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی جو عمر میں بے شک چھوٹی ہے مگر لفظوں سے یوں لکھاتی ہے کہ لگتا ہے کہ اس کا اور لفظوں کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں نمبر کی اس قدر مضبوط گرفت نہ صرف لفظوں پر بلکہ کمائی پر بھی۔ مگر اس کے اختتام نے دلایا۔ ٹھکرائے جانے والی عورت کا انتقام بد جان یو اہو تا ہے۔ یہ ہمارا تجزیہ ہے۔

اب آتے ہیں اس ناول کی طرف جو سنہرے حرفوں سے لکھنے کے لائق ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ اس کی تعریف کا حق ادا کر سکوں۔ کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ؟ صرف کچھ پیارے سے ذہنوں میں اور سیاسی حالات کی جس انداز میں منظر کشی کی گئی ہے اس نے تو روٹے کھڑے کر دیے۔ پاکستان کے ساتھ برا کرنے والوں کو جب ان کے استعمال کرنے والے فٹو پیس کی طرح استعمال کر کے پھینک دینے کا تب شاید انہیں عقل آئے یا تب ہی وہ شاید دقتدار کے کی طرح دم بلاتے ان کے ٹکڑے ہی جانتے رہیں۔ اس قسط میں جب خور کی دوست اس سے ملتی ہے وہ منظر کشی اور جب چند جملوں کی نصیحت اس کے پلو سے باندھتی ہے! بیچ بیچ لہروں کو فوج کر لیتا ہے سو رفعت صاحب! ہمارے دل بھی آپ نے اسیر کر لیے ہیں۔ کاشفہ حسین کی ”مکملش“ بھی اچھی تحریر تھی۔ ان کی کمائیاں اکثر ہماری اصلاح کرتی رہتی ہیں۔ آسیہ جی! بہت اعلا۔ ایک حقیقت کو بہت خوب صورتی سے آپ نے بے نقاب کیا بہت مزہ آیا پڑھ کر۔

ج: پیاری ارم! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ رفعت ناہید سجاد اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچانی جاری ہے۔

گل پری مرزا لاہور

تمام کمائیاں ہی اچھی تھیں۔ رخسانہ نگار عدنان جی! میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ مجھے آپ کی ہر تحریر بے تحاشا اچھی لگتی ہے۔ کثیر نبوی کا ”کلیوں کا نوحہ“ مجھے

رونے پر مجبور کر گیا۔ اتنا ظلم، اسلام میں کہاں ہے ایسا نقل ویسے پشیمانوں میں کہیں، کہیں ایسا ہی ہوتا ہے۔ شکر ہے ہمارا گھرانہ بہت اچھا ہے۔ میرا بھائی بہت باشعور اور پڑھا لکھا ہے۔ اس بار اس نے ایم اے فائنل ماس کمیونیکیشن کے بیچہ دیے ہیں۔ وہ دن اخبار میں کالم بھی لکھتا ہے۔ اس کا نام محمد طارق خان ہے۔ اب تو اس نے ہر وقت رٹ لگائی ہوتی ہے کہ میں نے اس کے ملک سے لی ایچ ڈی کرنی ہے۔ بس اللہ وہ کرے جو اس کے حق میں بہتر ہو (آمین)

ج: پیاری گل! ظلم کسی ایک علاقہ تک محدود نہیں جہاں بھی قانون اور انصاف کمزور ہو گا۔ وہاں ظلم یقینی ہو گا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ کا گھرانہ پڑھا لکھا باشعور ہے۔ آپ کے بھائی بھی تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں معاشرے میں خرابی کا ایک بڑا سبب ہماری آبادی کی بڑی تعداد کا غیر تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ناز گل بخاری، ممبئی

کئی عرصہ پہلے جرات کر کے ایک خط لکھا تھا۔ جانے کیوں شرف قبولیت نہ پاسکا۔ شاید خط میں عقیدہ زیادہ تھی۔ ایک بات آپ کو بتا دیں کہ خواتین ڈائجسٹ اور ہمارا ساتھ بچپن کا ہے۔ بلاشبہ ڈائجسٹ میں معیاری اور سبق آموز کمائیاں ہوتی ہیں۔ جس میں ہماری نوجوان سسل کے لیے راہنمائی اور اصلاح کا پیغام ہوتا ہے۔ اس میں سارے سلسلے بہترین ہیں۔

شمارے میں ایک سلسلے کا اور اضافہ کر دیں۔ ”ہنر زندگی“ کے نام سے یہ ان لڑکے لڑکیوں کے لیے ہو۔ جو کاندھ کی بے جان ڈگریاں لے کر نوکری کی تلاش میں سرگرواں و پریشان بھٹک رہے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا ہنر ایسا کام سکھایا جائے جو ان کے لیے مددگار ثابت ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کام کو بطور روزگار اپنا کر اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں۔ اس میں آپ قاری بہنوں کو بھی دعوت دے سکتی ہیں۔ جنہیں کوئی ایسا کام آتا ہے۔ وہ آپ کی مدد کر سکتی ہیں۔

ہمارے ماضی کے وہ مشہور فنکار جو آج کل مکمل گوشہ نشینی اور انتہائی کمپری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا انٹرویو شائع کریں۔ ”محبت خواب سفر“ بلاشبہ ایک اچھا

ناول ہے۔ اب تک یہ ناول پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ عرض یہ کرتا تھا کہ ہماری 80% عوام غربت کی لکیر سے بھی نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ مہنگائی کے اس دور میں وال روٹی تو کیا پاز روٹی بھی پوری کرنا بہت مشکل ہے اور خواتین ڈائجسٹ ہر طبقے کی خواتین اور لڑکیوں میں بہت مقبول ہے۔ کمائی کو دس بارہ اقساط میں ختم کر دیا کریں۔ قصبے اور گاؤں میں بھی یقیناً ”یہ ڈائجسٹ پڑھا جاتا ہو گا۔ ان میں بعض ایسے بھی قارئین ہوں گے جو ناول کی دلچسپی اور اپنے تجسس کو برقرار رکھنے کے لیے باقاعدگی سے ڈائجسٹ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتی ہوں۔

ج: نازنین! سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کر لیں کہ تنقید کی وجہ سے آپ کا خط شامل نہیں ہوا کچھ بہنوں کے خط شامل نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ خط ہمیں لیٹ موصول ہوتے ہیں۔ آپ کا خط بھی لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے پچھلے ماہ شامل نہ ہو سکا تھا۔ اب شامل کیا جا رہا ہے۔

آپ کی تجاویز اچھی ہیں۔ پرانے فنکاروں کے انٹرویو تو ہم اکثر شامل کرتے رہتے ہیں۔ ہنر صرف لکھ کر نہیں سکھایا جاسکتا۔ اس کے لیے باقاعدہ کلاسز ضروری ہیں۔

آمنہ مہدی، ریتالہ خور

یہ آپ سب کی گراں قدر کوششوں اور خلوص کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم جیسے قارئین بھی گھر بیٹھے ہی دنیا برت رہے ہیں۔ اسے بارے میں کہنا چاہوں گی۔ مصروفیت نے کچھ نہیں کرنے دیا کچھ نہ کچھ تو ہم بھی کرنا چاہتے تھے

ریتالہ خور، ضلع اوکاڑہ کی تحصیل بھی ہے۔ کوئی ریتالہ کو جانے یا نہ جانے مگر ”مجلز“ کو تو تبھی جانتے ہوں گے۔ جی ہاں یہ مشہور فوٹو فیکٹری اور میں، دونوں fellow City ہیں۔ شعاع اور خواتین سے میرا رشتہ پرانا ہے۔ کیونکہ میری امی ”پاپا کانی“ پوری پانچ عدد پھوپھیاں چاچی اور اپنے زمانے میں دادا ابو بھی مطالعے کے کافی رسیا رہے ہیں۔ اس لیے یہ عادت تو مجھ میں موروثی ہے۔

ان پریچوں میں شائع ہونے والی تحریریں ایسی خوب صورت اور پاکیزہ ہیں کہ جو پڑھنے والوں کو اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہیں۔ انہیں خوابناک اور باندھ دینے میں سے کچھ ”پیر کمال“ رقص جنوں جو چلے تو جال سے گزر

گئے 'طاہر لاہوتی' زرد موسم اور ہم سفر وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ کثیر نویں کاسندھ سے عشق ہوا انیسہ۔ سلیم کی حب الوطنی اور معاشرے کے ناسوروں پر فخر چلاتے لفظ سب ہی سلیے اپنی مثال آپ ہیں۔ درحقیقت خواتین و شعاع کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ج : آئندہ آپ نے خواتین کی محفل میں شرکت کی 'دلی مسرت' ہوئی لیکن اتنا مختصر اور سرسری تبصرہ پڑھ کر مایوسی ہوئی آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ تشریف لائے گا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکریہ۔ اپنے اہل خاندان کو ہمارا سلام کہیے گا۔

سارہ عبید : باجرہ افتخار 'نویسہ ریاض' ڈنگہ شہر ٹائٹل دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ لیکن فرصت دیکھ کر مزہ آگیا۔ ذہن و مکتب میں بھی نہیں تھا کہ مایوسی پر ہنمکت شہزادی اصل میں شہزادی نہیں بلکہ بیوت بھی۔ ساری کمائی پڑھ کر حیرت کا جھٹکا لگا اور مزہ بھی بہت آیا۔ پلیز 'محبت خواب سفر' کو اب اور طویل نہ کریں۔ باقی تمام شمارہ بہت اچھا تھا۔ فرحت اشتیاق بھی غائب ہیں۔ تمام شماروں کے لیے دھیروں دعاؤں۔

ج : سارہ : باجرہ اور نویسہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں فرحت کے ناول کا ہمیں بھی انتظار ہے! انہوں نے بتایا ہے کہ وہ لکھ رہی ہیں۔

زہرہ ظفر پنڈی بھٹیاں

ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی پہلے سروق کو اپنی نظروں سے نوازا اور جگت میں سر لہا بھی پھر جلدی جلدی اپنے مطلوبہ صفحے تک پہنچے۔ واہ نموجی! ہم سے مزہ آگیا۔ بہت انوکھا اور چونکا دینے والا اختتام۔

افسانے سب ہی بہت اچھے لکھے تھے۔ مختصر الفاظ میں زندگی کی کوئی بہت بڑی اور حقیقت بیان کرنا قیادت بہت مشکل ہے۔ مگر ہماری رائے ہمیں اس فن سے خوب آشنا ہیں۔ اگلے ماہ حسن عباسی کی غزل ضرور شائع کیجیے گا پلیز وہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔

ج : زہرہ بی! آپ نے خط لکھا 'بہت اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہے گا حسن عباسی کی غزل کی فرمائش ضرور پوری کریں گے، خود ڈائجسٹ لکھیں۔ اپنی شاعری جھجھکادیں۔ قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شائستہ اکبر : ڈگری کا کالج گدو

یہ کالج 'بیلی کی راجپوتانہ کی ملکہ' کو دل میں خاص مقام دیا۔ وہ کیا نکلی! ایک ٹھیکری اداکارہ۔ یہ پڑھ کر دونا آ رہا تھا۔ مجھے مایا فرینڈس بہت اچھی لگتی تھی سفید ساڑھی پہنے سالوں میں کتنی سفید موتیوں کی لڑی اور اصل میں بلی راجپوتانہ کی ملکہ نکلی تو ماہ ملکہ اور بدر غازان ہائے اسے قسمت ابیش کے لیے پیچھا دوں کی نذر ہو گیا۔ یہ ناول بیش یاد رہنے والا ناول ہے۔

آسیہ رزاق کا مکمل ناول 'پیچھا دوں کے سوا' میں بھائیوں کا آپس میں پیار اور ساس بھوکا یہ ملا بہت اچھا لگا۔ 'صراط مستقیم' ثروت نذیر کا واقعی بہت اچھا ناول لگا۔ ثروت نذیر کو کہیں کہ میں عبدالقادر ہوں 'جیسا کوئی ناول لکھیں اور ہاں بازی تو نیرہیم خان کا ناول 'عشق ہنز' نہیں' لے گیا۔ کزن کی کمائیاں مجھے کیا سب کو انٹریکٹ کرتی ہیں اور افسانوی 'کلیوں کا نوہ' 'رُلا گیا۔ کثیر نویں نے جب جب لکھا سچائی رکھا اور ج کتنا کڑا ہوتا ہے۔ پوچھنا ہے کہ کیا فرحت اشتیاق، اشتیاق احمد صاحب کی بھی ہیں کیونکہ میں نے ایک دفعہ اشتیاق احمد کا انٹرویو دیا تھا انہوں نے کہا کہ ان کی ایک بیٹی کمائیاں لکھتی ہے تو پیچھے ضرور بتائے گا۔

ج : شائستہ جی! فرحت اشتیاق کے والد صاحب رائٹر نہیں ہیں۔ وہ پی آئی اے میں جاب کرتے تھے۔ فرحت لائن کے کامران شاید کے انٹرویو کی ہماری دیگر ہمنوں نے بھی مائیدی آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

شائستہ نعیم : میر پور خاص

خواتین ڈائجسٹ میں ابتدائی سے درانٹی رہی ہے۔ ہر موضوع پر افسانے ناول، چکن، اسلامی معلومات، انٹرویو، پوئی بکس، بلی راجپوتانہ کی ملکہ، نموا احمد کمال فن کو پیچ چکی ہیں آخری پیرا گراف تک سسپنس پر قرار رکھا، انجام نہایت چونکا دینے والا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کوئی تاریخی حقیقت ہے یا محض افسانہ ہے لیکن دل کو چھو گیا ہے۔

اس کے بعد ثروت نذیر کے 'صراط مستقیم' پر لکھنا ضروری ہے۔ مو بھی ایسا کردار ہوتے ہیں جو بے جا رویوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صرف عورت ہی مظلوم

نہیں ہوتی ہے ہماری نظروں میں اپنے ارد گرد ایسے مرد موجود ہیں۔

کثیر نویں کو شادی کی مبارک باد ہو! کلیوں کا نوہ ہمارے صوبہ سندھ کے معاشرے کا ایسا المیہ ہے جو ختم نہیں ہو سکتا۔ آپ چاہے کتنا بھی قانون پاس کریں جاگیردار کو ذریعے کر میں ایسا ہونے ہی نہ دیں گے۔

باقی ناول 'افسانے ٹھیک ہی لگے ہیں۔' 'محبت خواب سفر' یا ر بہت لمبا ہو گیا ہے پلیز سمیٹ دو، یا قوت کو تو ایسا عذاب بنا دیا ہے جس نے نسلوں کو ڈس لیا ہے۔ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے لیکن اس میں تو ایسی چویش ہو جاتی ہے کہ دل کانپنے لگتا ہے۔ یارب کسی کو بدلہ لینے والا نہ بنا! معاف کرنے والا بنا۔ (آمین)

ج : شائستہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرنی رہیے گا۔

زاہدہ منصور لاہور

غالباً تیرہ چودہ سال پرانی قاری ہوں یا شاید اس سے بھی پرانی مگر کبھی رابطہ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ آج جس تحریر نے مجھے اپنی خاموشی توڑنے پر مجبور کیا ہے وہ ہے 'بلی راجپوتانہ کی ملکہ' اور رخسانہ جی کی تو کیا یہ بات ہے۔

'محبت خواب سفر' بہت زبردست جا رہا ہے۔ ان کی ہر تحریر ہی کمال ہوتی ہے خواتین کے باقی سلسلے بھی بہت زبردست ہیں۔

ج : زاہدہ! اپنی خاموشی توڑنے میں آپ نے چودہ سال لگا دیئے اتنی طویل مدت بعد خط لکھا۔ اور اتنا مختصر خواتین ڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

جویریہ عاصم لاہور

اس ماہ کا خواتین 9 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ 'بلی راجپوتانہ کی ملکہ' بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر زہرہ اور بدر غازان کو ملا کر انہوں نے بہت ہی اچھا کیا۔ چونکہ پوش مایا فرینڈس ہوگی، سوچا مجھے نہیں تھا اس لیے بہ حد حیرت

ہوئی، میر جاں ناول بیسٹ رہا۔ اب آتے ہیں۔ 'محبت خواب سفر' کی طرف تو رخسانہ نگار عدنان سے گزارش ہے کہ لائبر کا کردار مجھے بے حد پسند ہے۔ اس لیے پلیز لائبر کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ اور اسمبلی شلی لائبر کا اینڈرست بیسی کریں۔ جاگیر ہدائی کا انجام تو اتنا برا دکھائیں کہ دل خوش ہو جائے۔

ج : پیاری جویریہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید اور دعاؤں۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا 'یہ جان کر خوشی ہوئی۔

مصباح مسکان امینہ مسکان، جلم
اکتوبر کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ ہم خواتین کے بہت پرانے قاری ہیں مگر کبھی خط لکھنے کی ہمت ہی نہ جمع کر سکے۔ تو جناب! ہم خواتین رسالے کو بہت شوق اور لگن سے پڑھتے ہیں سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ 'چراغ آخر شب' اور 'محبت خواب سفر' بہت اچھا جا رہا ہے۔ نموا احمد نے تو 'بلی راجپوتانہ کی ملکہ' ناول لکھ کر دل خوش کر دیا۔ پڑھ کر ہم تو خاموشی میں بیچ گئے۔

باقی سب ناول اور افسانے بھی اچھے تھے۔ یلم میر کا انٹرویو اچھا لگا۔ 'رنگ رنگ پھول' میں بھی تمام چیزیں اچھی اور عمدہ تھیں۔ اقوال زریں بہت صحت آمیز اور عمدہ ہیں۔ 'خاتون کی ڈائری' اور 'میری بیاضی سے' ان دونوں سلسلوں میں بہت عمدہ شاعری تھی۔ کچھ اشعار تو ایسے تھے جو دل میں اتر گئے۔

ج : مصباح اور امینہ! آپ نے ڈرتے ڈرتے خط لکھا۔ آپ کا ڈر ہمیں اچھا نہیں لگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ خط شائع نہ ہوتا لیکن ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جاتے اب آپ نے خط لکھ کر اپنی پسندیدہ رائے زریں پسندیدہ تحریروں کے بارے میں بتایا ہے جبکہ ان کو شائع ہونے کی سال گزر چکے ہیں۔

ناول 'افسانہ مجھواؤں' پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھی تحریروں کا تو ہم انتظار کرتے ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رجسٹر ماہنامہ شائع کرنا میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقس بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرواد ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذیلی حصے پر دہا ڈرامائی تکلیف اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ کوئی کا حق رکھتا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رو جاتا ہے، اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو، اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کر پاتی جو شخص ایک شعر کر دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ”ارے یہی تو میرے دل میں تھا۔“

زندگی کی طویل و صوب چھاؤں میں بہت سی یادیں، بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بہ کر کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی ان یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجئے مگر صرف منظوم پیرایے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے، نظم بھی اور غزل بھی۔ اس مادے سے ہم آپ کے لیے ایک یا سلسلہ شروع کر رہے ہیں ”روشن حرف و ہمارے“۔

سوالات یہ ہیں۔

- (1) وہ شعر جو اکثر جو آپ کے لبوں پر رہتا ہے؟
- (2) وہ شعر نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
- (3) کسی نے آپ کو کچھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
- (4) وہ غزل جو آپ نے وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟
- (5) کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سگاہے

سنا جہ دہ رومی

جالتے ہیں تو انسان بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔
 رنج کتنا بھی کریں ان کا نہانے والے
 جانے والے تو ہمیں لوٹ کے آنے والے
 کتنی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
 کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے
 (2) ساحلہ صابونی ایک ایسے شاعر ہیں کہ جن کا نام تو
 میں نے سنا تھا لیکن ان کی شاعری پڑھنے کا اتفاق بالکل نہ
 ہوا تھا۔ ان کی ایک نظم ”فرار“ میری دوست نے مجھے
 ایس ایم ایس کی اور اس کے بعد ”دراکشی“ میں جب میری
 نظر ”کلیات ساحر“ پر پڑی تو میں لیے بنارہ نہ سکی لہذا میں
 کہہ سکتی ہوں کہ ان کی یہ نظم ان سے تعارف کی اصل
 بنیادی۔

فرار

اپنے ماضی کے تصور سے ہراساں ہوں میں
 اپنے گزرتے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
 اپنی بے کار تمنائوں پہ خرمندہ ہوں
 اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے
 میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہے دو
 میرا ماضی میری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

میرا نام ساجدہ رومی ہے میرا تعلق لاہور سے ہے
 ”روشن حرف و ہمارے“ ایسا دلکش عنوان ہے کہ اس میں
 شرکت کیے بغیر میں رہ نہیں سکی۔ خوب صورت الفاظ
 خوب صورت خیالات سے جنم لیتے ہیں یہ خوب صورت
 الفاظ شاعری میں دھل کے دلوں کو روشن کر دیتے ہیں۔
 (1) بہت سے اشعار ذہن کے نماں خانوں میں کم رہتے
 ہیں اور کبھی ذہن کی سرحدیں یاد کرتے ہوئے ورد زبان بھی
 ہو جاتے ہیں۔ جیسے آج کل ایک شعر کچھ زیادہ ہی مرکز توجہ
 بنا ہوا ہے۔

غم زندگی نے لا کر ہمیں اس جگہ یہ مارا
 جہاں اس طرف کنارہ نہ اس طرف کنارہ
 یہاں کس کو اتنی فرصت جو ہمارا حال پوچھے
 یہ مزاج ہے بھی کا نہیں ذکر ہل ہمارا
 جب کچھ بہت پیارے رشتے شاہراہ زندگی میں تنہا چھوڑ

میری امیدوں کا حاصل، مری کاوش کا صلہ
 ایک بے نام لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
 کتنی بے کار امیدوں کا سہارا لے کر

میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
 کتنی بے ربط تمنائوں کے مبہم خاکے
 اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر
 مجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کو
 مجھ کو کسے دکھ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
 اور وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
 میں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں
 مجھ کو کسے دکھ میں آج بھی جی سکتا ہوں
 عشق باکام سہی زندگی ناکام نہیں!

ان کو اپنانے کی خواہش انہیں پانے کی طلب
 شوق بے کار سہی مسعی غم انجام نہیں
 وہی کیسو وہی نظریں وہی عارض وہی جسم
 میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
 وہ کنول جن کو کبھی میرے لیے کھانا تھا

(3) میری نظروں سے بہت دور بھی کھل سکتے ہیں
 کسی نے نہیں دیکھ کر شعر رچا ہوا تو اس کے لیے
 ضروری ہے کہ ”کسی“ کو کوئی شعر آج بھی ہو سکیں ہمارے
 ارد گرد کوئی ایسا گھر آباد نہیں ہے ہاں البتہ ایسا ہوتا تھا کہ
 کبھی سخت غصہ آیا ہو اور بولنے میں ادب و لحاظ کی تمام
 حدود پھلانگ چکے ہوں اور اسی وقت ممانوں کی آمد ہو
 جانے پر لب و لہجہ ایسا شیریں ہو جاتا کہ ہماری بہن آسیہ
 بے اختیار کہہ اٹھتی۔

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
 دیتے ہیں دھوکہ یہ باز نہ کھلا
 لیکن ہم بھی کہہ دیتے کہ ممانوں سے بدتمیزی تو ہم
 نہیں کر سکتے۔

میرا آنا جانا بہت کم ہے، لہذا جب کبھی کہیں چلی جاؤں
 تو ایک گھنٹا شعر میرا استقبال کرتا ہے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت
 کبھی ہم انہیں کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
 (4) مجھے ممدی حسن صاحب کی گلی ہوئی تمام غزلیں
 بے حد پسند ہیں۔ لیکن بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل تو انہوں
 نے کمال رکھا ہے۔

بات کرتی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
 جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
 بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی
 تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
 کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکس رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
 تاب تجھ میں مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہمار
 خوشی حور شام کبھی ایسی تو نہ تھی
 (5) کلاسیکل شاعر تو بہت ہیں اور ان کا کلام ایسا ہے کہ
 آپ بار بار پڑھے بنارہ نہیں سکتے، لیکن مرزا اسد اللہ خاں
 غالب مجھے بے حد پسند ہیں دل تو چاہتا ہے کہ ان کا دیوان
 ہی لکھ دیا جائے لیکن آپ صرف یہ غزل پڑھیں اور داد
 دیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
 کون بیٹا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
 وام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام رنگ
 دیکھیں کیا گزرتے ہے قطرے پر گہر ہونے تک

عاشقی مبر طلب اور تنہا بے تاب
 دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

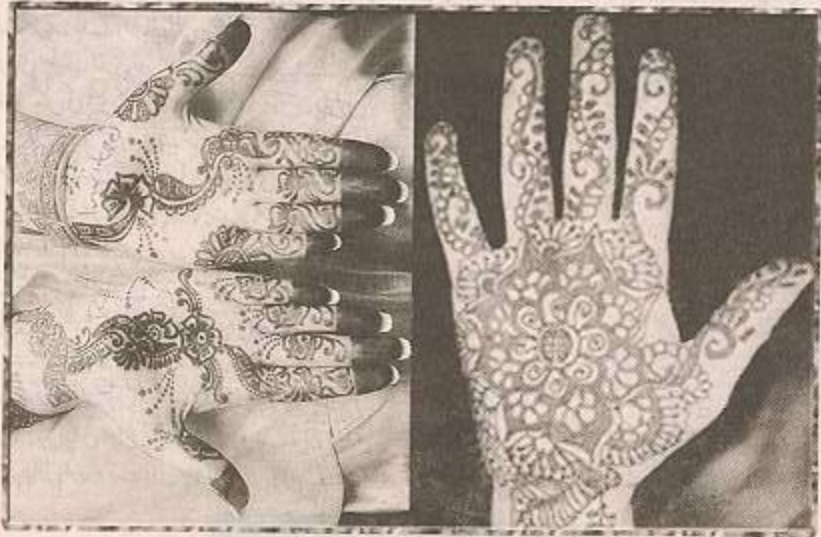
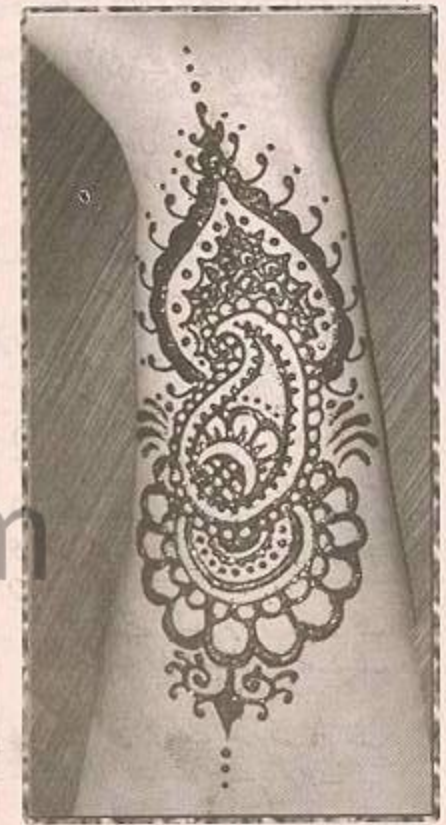
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
 خاک ہو جائیں گے ہم تجھ کو خبر ہونے تک

پر تو خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
 میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
 رخ ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ



www.pkdigest.com

آپ کا اورچی خانہ

سناوہ گھٹن

1 - ایک ہاؤس وائف پر جہاں اور بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے ان میں بچن کی ذمہ داری سب سے اہم ہوتی ہے مطلب سب گھر والوں کی پسند ناپسند، غذا، نیت، ناکم پر کھانا تیار رکھنا اور سب کو کھانا بہ احسن طریقے سے دینا۔

میری بچن کی ذمہ داری تو صبح سویرے ہی شروع ہو جاتی ہے اور رات گیارہ بجے آف ہوتی ہے۔

میں کھانا پکاتے وقت سب سے زیادہ صفائی اور پھر غذا نیت کا خیال رکھتی ہوں، کوشش کرتی ہوں کہ آکل کم سے کم استعمال کروں۔ کھانا بہت ہلکی آج پر پکاتی ہوں اور زیادہ دیر سے گلنے والی اشیاء درمیانی آج پر کیونکہ تیز آج پر پکانے سے اکثر کھانوں کی غذا نیت ضائع ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ ہر چیز کو چاہے وہ بھری ہو یا فروٹ چاول، دال، لیکن ہو یا گوشت، بہت اچھی طرح بار بار دھوئی ہوں، گوشت کے اور چکن کو تھوڑے گرم پانی سے دھوتی ہوں، دھونے کے بعد ان چیزوں کو چھلنی میں ڈال کر جالی کے کپڑے سے دھواں کر چھلنی کے نیچے کوئی برتن وغیرہ رکھ دیتی ہوں، تاکہ فالتو بہ جانے والا پانی اس برتن میں جمع ہو جائے اور چکن کی سلیب گندی اور گیلی ہونے سے بچ جائے۔ دودھ بیشہ اسٹیل کی پتلی میں دھیتی آج پر پکاتی ہوں۔ چاولوں کو بھی بیشہ دم پر رکھتی ہوں یہ تمام باتیں غذا کی غذا نیت کو قائم رکھتی ہیں سب کی صحت کی بحالی کی بھی ضامن ہیں۔

کھانا پکاتے ہوئے میں پسند ناپسند پر بھروسہ کرنے کے بجائے موسم اور گھر میں موجود بھری اور راشن پر نظر رکھتی ہوں، لیکن یہ مطلب بھی نہیں کہ میاں جی اور بچوں کی پسند کو بالکل ہی نظر انداز کر دوں، جو بھی پکاتی ہوں سب کو پسند آتا ہے۔ بریالی البتہ سب ہی کو ہے حد پسند ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ روزانہ تو بریالی نہیں پکاتی جاسکتی گھنٹہ بھر دس دن بعد بریالی پکاتی ہوں، کیونکہ یہ بات تو سب ہی کو معلوم ہے کہ چاول اور گوشت وزن بڑھاتے ہیں اس کے علاوہ

شدید گرمی میں رات کو کھانا کھانے کو کسی کاچی نہیں چاہتا تو کبھی آم یا کیلوں کا ملک شیک بنالیتی ہوں کہ یہ بھی فیل آف انرجی ہوتا ہے، البتہ اپنے لیے بیشہ بغیر شوگر کے ملک شیک بناتی ہوں کیونکہ ایک تو شوگر ہمارا خاندانی مرض ہے دوسرے شوگر وزن بھی بڑھاتا ہے اور میں وزن کے بارے میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔

اس کے علاوہ گرمیوں کے موسم میں رات کو زیادہ تر سب تیز کھانا پسند کرتے ہیں، فریج سے نکالا ہوا گھنٹا میٹھا تیز گرمی میں بہت راحت پہنچاتا ہے اور یہ آئرن حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے (اور آج کل تو جسے دیکھو آئرن کی کمی کا شکار ہے) اس کے علاوہ تیز پختہ بھرنے کا پاس بچھانے کا اور جگہ جگہ صفائی کا بہترین ذریعہ ہے۔

2 - اگر کبھی میرے گھر اچانک مہمان آجائیں تو مجھے بالکل بھی پریشانی نہیں ہوتی، کیونکہ ایک بڑا پکٹ شای کباب کی ٹکلیوں کا بیشہ فریج میں تیار رہتا ہے اس کے علاوہ امٹر اچاری قیمہ پکا کر فریز کر دیتی ہوں، چکن اور گوشت تو بیشہ ہی موجود رہتا ہے گھر کا دیگر راشن بھی چونکہ مہینے بھر کا کھانا ہوتا ہے۔ سو اسی لیے کسی بھی مہمان کی اچانک آمد میرے لیے کبھی باعث زحمت نہیں بنی۔

بھنا ہوا گوشت بھی اکثر فریز کر کے رکھ دیتی ہوں اور کسی مہمان کی اچانک آمد پر ڈشیں تو کافی بنالیتی ہوں۔ مگر ایک آسان ڈش کی ترکیب حاضر ہے۔

دہی چکن

ضروری اشیاء :

چکن

دہی

اکلو

اکلو

1 کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

سرخ منج
گرم سالسا (پسا ہوا)
اور کم، لسن (پسا ہوا)
حسب ذائقہ
حسب ذائقہ
1 کھانے کا چمچ
1 کھانے کا چمچ

تمام سالے کو دہی میں اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس سالے کو چکن میں اچھی طرح لگا کر کم از کم آدھا گھنٹہ فریج میں رکھ دیں۔ پھر پیچی میں تیل گرم کریں اور بوٹیاں سالے سے نکال کر تیل میں فراٹی کر لیں۔ چند منٹ بعد دہی والا سالسا بھی ڈال دیں پھر ڈھانپ کر پندرہ منٹ ہلکی آج پر پکائیں۔ تیل چھوڑے تو مزید اردی چکن تیار ہے۔ اس کے علاوہ میں رس ملائی بھی 10 منٹ میں بنالیتی ہوں جو کہ میرے ہاتھ کی سب ہی خاندان والوں کو بہت پسند ہے۔

3 - ایک عام کمات مشہور ہے کہ اگر کسی عورت کی سلیقہ مندی چاہی ہو تو اس کے گھر کا چکن اور ہاتھ روم دیکھو۔ سو میں ان چیزوں کا خاص خیال رکھتی ہوں، سردیوں میں تو دن میں دو بار چکن میں جھاڑو پونچھا کرتی ہوں اور گرمیوں میں باپ لگا کر دو مرتبہ ضرور دھوتی ہوں پھر چھوٹے تولیے سے (جو بچن کی صفائی کے لیے دھار رہا ہے) چکن کی الماریاں کیٹھ اور فریج پر جو دھونے سے چھینٹیں وغیرہ پڑ جاتی ہیں وہ خشک کرتی ہوں، تمام برتن ترتیب سے برتنوں کے اسٹینڈ میں لگاتی ہوں، میری عادت ہے کہ کھنگ کرنے کے ساتھ ساتھ چیزیں بھی سنہاتی جاتی ہوں۔ مثلاً "اگر ہانڈی پکا رہی ہوں تو سالے کے ڈبے جہاں سے اٹھاتی ہوں وہیں رکھتی جاتی ہوں، پھوٹے موٹے برتن ساتھ ساتھ سنک میں دھوتی رہتی ہوں، میں اکثر ایک ساتھ تین چار کام کرتی رہتی ہوں (اس معاملے میں کافی پھرتی ہوں) مثلاً "ادھر گھر پر گوشت ڈال کر چولھے پر چڑھا رہی ہوں ساتھ ہی دوسرے چولھے پر دودھ ابلانے کے لیے رکھ دیتی ہوں، آٹا پرات میں بھگو کر رکھ دیتی ہوں (کیونکہ بجھنے کے بعد آٹا گوندھنے سے بہت اچھا اور ملائم گوندھتا ہے) (اور جی ہے تو تھانہ بھی بھول گئی کہ مجھے گھر کی سجاوٹ اور بچن کی سجاوٹ کا بھی بہت شوق ہے۔ آؤٹ ڈور اور اندر پائس بھی بچن کی کھڑکی اور کارنر کی دیوار پر سجاے ہیں، بہت خوب صورت وال کلاک، چڑیا کے کالج کی شکل والا خوب صورت میوزک کے ساتھ ٹائم ٹائمر والا سامنے والی دیوار پر سجایا ہے اور خوب صورت وال ٹیگر

کی ہر جیب میں ضرورت کی چیزیں مثلاً "بال پوائنٹ سورا لکھنے کے لیے چھوٹی کالی۔ کیٹھ کی چابیاں مل وغیرہ ترتیب سے رکھے رہتے ہیں بقول میری بہن کے کہ "آلی! آپ کے گھر اگر 20 سال بعد بھی آؤ تو ہر چیز اپنی جگہ پر نظر آئے گی۔" رات کو اگر بھی بہت تھک بھی جاؤں تو بھی چکن صاف کے بغیر اور برتن دھوئے بغیر نہیں سوتی۔

4 - صبح کا بیشہ بیشہ سب چائے پرائھا اور چھوٹے کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ بچوں میں کسی کو نیم کسی کو شہد اور کسی کو انڈہ چاہیے ہوتا ہے مگر چھوٹے پرائھا ضروری ہیں۔

5 - آج کل بے شک باہر کھانا کھانا فیشن بننا چاہا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اچھا بھی لگتا ہے کہ کبھی کبھار روٹن میں تبدیلی بھی ہونا چاہیے تو جب کبھی میکے یا کسی دوسرے شہر جانا ہو تو بھی کبھی کسی اچھے سے رستوران میں کھانا ضرور کھاتے ہیں، اپنے ہینڈ اور بچوں کے ساتھ کبھی کبھی ایسی آؤٹنگ اچھی لگتی ہے۔

6 - کبھی کبھی جب موسم بہت اچھا اور خوشگوار محسوس ہو تو خود بخود دل کرتا ہے کہ کوئی اچھی سی ڈش بنائی جائے تو پھر موسم کی مناسبت سے میٹھا یا نمکین کچھ بھی ضرور بناتی ہوں۔

7 - اچھا کھانا پکانے کا ایک ٹپ بتاتی ہوں جو کہ میرا آزمودہ ہے۔

(1) اگر آپ کھانا پکاتے وقت ساتھ ساتھ ذکر اللہ کرتی رہیں تو شرطیکہ کھانا بہت لذیذ بنے گا، ذکر اللہ میں آپ کچھ بھی بڑھیں شرطیکہ میں تو سبحان اللہ و بحمد سبحان اللہ العظیم کا ورد کرتی رہتی ہوں کہ قیامت کے روز اس گلے کا ورد نیک اعمال کے ترازو کو بھاری کر دے گا۔

(2) دوسری ٹپ یہ ہے کہ آلیٹ کے لیے انڈا بھینٹتے ہوئے اگر آپ اس میں تھوڑا سا دودھ شامل کر دیں تو آلیٹ بہت پھولا ہوا بنے گا۔

3 - بیشہ رات کو چکن، اچھی طرح صاف کر کے نکلیں۔ اس سے چکن میں لال بیگ اور دیگر کوڑے پیدا نہیں ہوتے اور برتنوں پر لسم اللہ پڑھ کر کوئی جالی دار چیز وغیرہ ڈھک دیں۔ یہ سنت کا طریقہ ہے اس سے برتن زہریلے کپڑے گوندوں اور جنات و شیاطین کے استعمال سے بھی بچ رہتے ہیں۔

4 - پانی بیشہ بیشہ کر آرام سے پیئیں اس سے پیٹ نہیں بڑھتا۔

BAKE
PARLOR®

سب ہی کھاتے ہیں

آسان ڈاکٹر دار کھانا ایک شیف کو اور کیا چاہیے!

- ایک پارلر میں کس شیف سے کھانا بنانا سیکھیں؟
- کونسا اور کونسی شیف؟
- کونسا کھانا بنانا سیکھیں؟ (اور حیران کن جواب)



2 in 1
Pastry
Mixer & Sifter



9 ضروری ڈاکٹریٹ میں دستیاب

- کھانا بنانا • کھانا بنانا • کھانا بنانا • کھانا بنانا
- کھانا بنانا • کھانا بنانا • کھانا بنانا • کھانا بنانا



موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

حسب ضرورت

ترکیب :

نمائروں، سبز مرچ اور پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ پھر ان اشیاء کو آپس میں ملا لیں۔ اب بیسن، انڈوں کی زردی و سفیدی اور تمام مصالحوں کو قیمہ میں اچھی طرح ملا لیں۔ اس کے بعد کئی ہولی پیاز، نمائروں اور مرچ کو بھی اس آمیزے میں اچھی طرح شامل کر دیں۔ ایک فرانسنگ پین میں کمی گرم کریں اور قیمے کے چھپے چھپے کباب بنا کر تلتے جائیں۔ جب دونوں جانب سے سنہری مائل ہو جائیں تو اتار لیں۔ چٹ پٹے چلی کباب تیار ہیں۔ دی اور پورے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

تندوری ران

ضروری اجزا :

- لال مرچ پاؤڈر
- نمک
- گرم مصالحا پاؤڈر
- چائے کے دو چمچے
- حسب ذائقہ
- کھانے کا ایک چمچ

چلی کباب

ضروری اجزا :

- ایک کلو
- 125 گرام
- ایک عدد
- 6 عدد
- چائے کا ایک چمچ
- حسب ضرورت
- چند پتے
- چار عدد
- آدھا کلو
- چائے کے دو چمچے
- تین عدد
- حسب ضرورت
- چائے کے تین چمچے
- کھانے کے دو چمچے
- چائے کے دو چمچے
- قیمہ
- بیسن
- انڈہ
- سبز مرچیں
- دھنیا خشک
- دھنیا سبز
- پورینہ
- نمائروں
- پیاز
- اورنگ (کٹی ہوئی)
- لیملوں
- نمک
- پس ہوئی سرخ مرچ
- انار دانہ (پسا ہوا)
- گرم مصالحا

زرد رنگ
ہادی پاؤڈر
ران (بکرے کی)
دھنیا پاؤڈر
دہی
لیموں کارس
املی کا گودا
زیرہ (کٹا ہوا)
لہسن اور ک پیسٹ
سکری پاؤڈر یا پتہ پتہ پیسٹ
تیل
الاجچی
ترکیب :

چائے کا ایک چوتھائی چمچ
چائے کا آدھا چمچ
ایک عدد
چائے کا ایک چمچ
ایک پیالی
ایک چوتھائی پیالی
کھانے کے دو چمچے
کھانے کا ایک چمچ
کھانے کے دو چمچے
آدھی پیالی
حسب ضرورت
چار عدد

شملہ مرچ
ہری پیاز
تیل
ترکیب :

ایک عدد (کیوبز کاٹ لیں)
ایک عدد (چوب کر لیں)
حسب ضرورت
گوشت کو دھو کر کانٹے سے گودھ لیں۔ اب اس میں
لہسن اور ک پیسٹ، دہی، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، چائیز نمک
سویا سوس، سرکہ، ہلدی پاؤڈر اور کھن لگا کر تین سے چار
گھنٹے تک چھوڑ دیں۔ پھر تان اسٹیک سوس تین میں گوشت
جمع آمیزے کے ڈال کر ہلکی آچ پر ڈھکن ڈھانپ کر گل
جانے تک پکائیں۔ دوسرے تین میں ہری پیاز اور شملہ
مرچیں فرانی کریں۔ سرنگ ڈش میں انہیں نکالیں اور
اوپر سے ہنڈریف کے سلاکس رکھ کر سرو کریں۔

منٹن کرٹاہی

ضروری اجزاء :

بون لیس منٹن (چھوٹی بونی) ایک کلو
لہسن اور ک پیسٹ
اور ک باریک کٹی ہوئی
سفید زیرہ
ہری مرچ
پیاز
تیل
ثابت دھنیا
ہرا دھنیا (کٹا ہوا)
نماز
آدھی پیالی
تین عدد

ترکیب :

نماز پیاز، لہسن باریک کاٹ کر ابال لیں اور گر انڈر
میں پس لیں۔ ایک کرٹاہی میں تیل گرم کریں اور یہ سالہ
بھون لیں۔ منٹن کی بوٹیاں جو کہ پہلے سے نمک اور تھوڑی
سی ہلدی ڈال کر ابال لی گئی ہوں۔ اس میں ڈال کر بھون لیں
ساتھ ہی سرخ مرچ کٹی ہوئی بھی ملا دیں۔ ثابت دھنیے اور
زیرے کو توڑے پر بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں اور پر سے
چھڑک دیں۔ پیش کرنے سے پہلے کٹا ہرا دھنیا اور کٹی ہری
مرچ اور باریک کٹی ہوئی اور ک چھڑک دیں۔ یہ کرٹاہی نان
یا سادہ روٹی دونوں کے ساتھ مزہ کی۔



مزے دار ہنڈریف

ضروری اجزاء :

گوشت (ثابت کٹا)
لہسن اور ک پیسٹ
دہی
نمک
سیاہ مرچ پاؤڈر
چائیز نمک
سویا سوس
سرکہ
ہلدی پاؤڈر
کھن

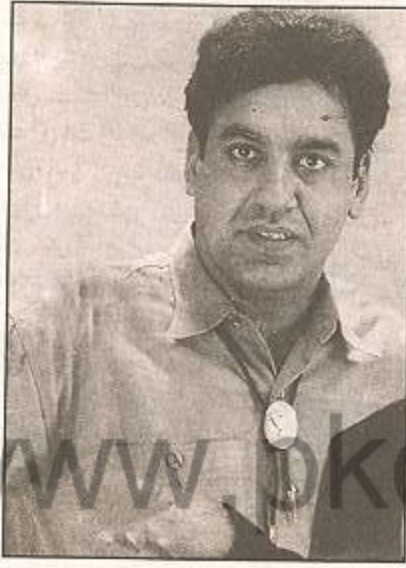
خوبی و سببی

غزل ٹوکان

راے صوفی تبسم کا تو قی بولتا تھا۔ وہ کام کے حوالے سے
ہماری تربیت کرتے تھے۔ کوئی بے ہودہ مکالمہ تو سوچنا بھی
محال تھا کہ ادا ہوگی۔ مزاح کا احترام کیا جاتا تھا۔ اسٹیج پر
کئی کئی بار سوچا اور کام کیا جاتا۔ موجودہ لاٹ کو گائیڈ کرنے
والا کوئی نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنکار ایسی گزری کی
مانند ہے جو قابل تر کھان کے ہاتھوں بہترین فریج بن جاتا
ہے۔ بصورت دیگر وہ گزری گئے کو مارنے کے کام آتی
ہے۔“
(کاش آج کے فنکار اس اہم نکتے کو سمجھ سکیں)

خود شناسی

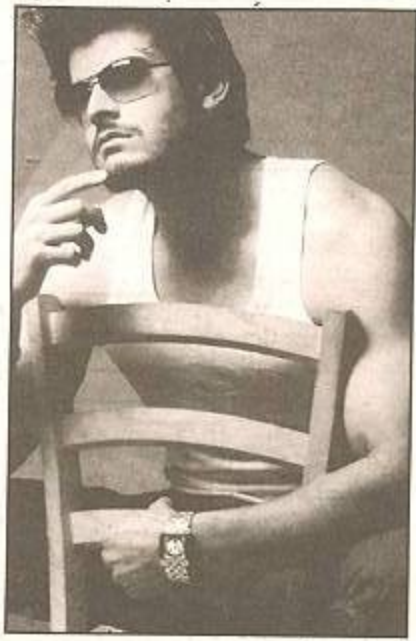
ہمارے بعض فنکار سادگی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اب
گلوکارہ نصیبو لال کو ہی لیں۔ جب بھی بولتی ہیں سانسے
والے کو در طہ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ پھر صفائیاں بھی



ناہنڈہ روزگار

بعض فنکاروں میں شوہر کی ہر صنف میں اپنا آپ
منوانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اداکار سہیل احمد کا شمار بھی
ایسے ہی جت اداکاروں میں ہوتا ہے جو بی وی، اسٹیج، فلم
میں بالخصوص مزاحیہ اداکاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔
اپنے تجربات کے حوالے سے وہ کہتے ہیں۔
”بی وی، فلم اور اسٹیج پر کام کرنے میں اتنا ہی فرق ہے
جتنا نقد کاروبار اور ادھار کے کاروبار میں ہوتا ہے۔ بی وی پر
کام ریکارڈ ہوتا ہے یعنی ادھار والا کام جبکہ اسٹیج پر نقد
کاروبار ہوتا ہے یعنی فوری نتیجہ۔ ہماری سرزمین ادب
بالخصوص مزاح کے لیے بے حد زرخیز ہے۔ ہماری کامیابی
کو دیکھ کر ہجارت نے مزاحیہ فلمیں بنانا شروع کیں جب
میں نے اسٹیج پر کام کرنا شروع کیا اس وقت منیر راج،
شعیب ہاشمی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، حنیف





پورے ملک کے لیے اعزاز ہے۔ میں بحیثیت پاکستانی اپنی ٹیم کا مداح ہوں لیکن میدان میں فیصلے غیر جانبدار ہو کر کرنا ہوں۔ شاید اسی لیے مسلسل دوسرے سال یہ اعزاز میرے حصے میں آیا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ٹاپ ٹین ٹیسٹ رینٹنگ میں اپنی شاندار کارکردگی کے باعث انٹرنیشنل کرکٹ کونسل پاکستانی بورلر محمد آصف کو تیسرے اور محمد عامر کو دسواں نمبر دینے پر مجبور ہیں۔ یہ دونوں کھلاڑی ان دونوں ایساٹ فلسفہ اسکینڈل کے باعث معطلی کا شکار ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ دونوں کھلاڑی بارسون بھارتی لابی سے کس طرح چپے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

غلطی

بعض شخصیات اپنے کارناموں کی بدولت اپنے رستاروں کے ذہنوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ ایسی ہی شہرہ انگیز شخصیت شہزادی ڈیانا کی بھی ہے جنہوں نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اگرچہ ان کے اسکینڈلز نے انہیں متنازع بنایا لیکن اس کے باوجود آج بھی ان کے چاہنے والوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔ اس کا مظاہرہ گزشتہ دنوں ہونے والے 19 ویں کامن ویلتھ گیمز کی افتتاحی تقریب میں دیکھنے کو ملا جب آرگنائزنگ کمیٹی کے چیئرمین سریش کھوسا نے ان الفاظ کے ساتھ لاکھوں ناظرین کو حیران کر دیا کہ ہم شہزادی ڈیانا کا کامن ویلتھ گیمز میں شرکت پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ”یہ الگ بات ہے کہ بعد میں انہوں نے اسے جیل کی تصحیح کر



ملک اور ان کی اہلیہ مشعال کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جنہوں نے نیک ہوتے ہوئے کسی بات کی پروا نہ کی۔ نہ درمیان میں حائل سرحد کی اور نہ عمر کے تفاوت کی۔ اس حوالے سے مشعال کتنی ہیں۔

”میری ملاقات یاسین ملک سے 2000ء میں ہوئی۔ ان کے انداز بیان اور شعری شاعری سے شغف نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ ایک واضح سوچ رکھنے والے حریت لیڈر ہیں۔ تقریب کے بعد ہمارا رابطہ استوار ہوا۔ سری نگر واپسی سے پہلے انہوں نے میری والدہ کو الوداعی فون کیا تو مجھ سے بھی بات کی۔ بعد میں انٹرنٹ کے طفیل ہمارا رابطہ بحال رہا۔ یاسین نے مجھے پُر پوز کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”میں اپنی جدوجہد میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں باضابطہ طور پر پروپوز کروں گا اور تمہیں شادی کے بعد سری نگر لے آؤں گا کیا تمہیں میرا ساتھ قبول ہے؟“ مجھے ان کا اعتماد اور عزم بے حد بھلایا۔ مجھے فوراً ”یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ اپنے قول میں کتنے پکے ہیں۔ تاہم یاسین سے شادی کا فیصلہ میں نے اپنے مرحوم والد کی خواہش پر کیا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ جب بھی کوئی مشکل فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ والد ضرور خواب میں آتے ہیں۔ اس دن بھی وہ میرے خواب میں آئے اور مجھے یقین دلایا کہ میں میرے لیے بہترین انتخاب ہیں۔“ (قدرت جنہیں ملانا چاہے تو وسیلہ بنا دیتی ہے۔ اس معاملے میں آپ دونوں خوش قسمت ہیں)

ایوارڈ

ان دنوں جبکہ ہر طرف پاکستانی کرکٹ پر اسکینڈلز اور مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے ہیں معروف پاکستانی اسپاڑر علیم ڈار کو مسلسل دوسرے سال آئی سی بی بیسٹ اسپاڑر ایوارڈ ملنا پوری قوم کے لیے بے حد خوش آمد آمد تھا۔ یہ قائد نامزدی تھی جو کسی پاکستانی کے حصے میں آتی تھی۔ بھارتی لابی کے زیر اثر یہ ایوارڈ علیم ڈار کے حصے میں آنا اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مشکل ترین صورت حال میں باصلاحیت لوگ اپنی جگہ بنا کر رہتے ہیں۔ ایوارڈ جیتنے پر بی سی بی کی جانب سے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اعزازی شیلڈ اور پانچ لاکھ روپے سے نوازا گیا۔ اس موقع پر علیم ڈار کا کہنا تھا کہ ”یہ ایوارڈ میرے لیے ہی نہیں

اسی انداز میں دیتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”گلوکاری ایک تنہید اور سچا کام ہے۔ جسے میں نے اپنے شوق کے تحت اپنایا ہے۔ پتہ نہیں میری تنہید بات پر بھی لوگ کیوں نہیں لگتے ہیں۔ میرا تعلق راجہستان سے ہے۔ میرا نام نصیبو اس لیے رکھا کہ میری پیدائش کے بعد دو بھائی پیدا ہوئے تھے (سادلی اسے کہتے ہیں) ہماری برادری میں گانا گانا پسند نہیں کیا جاتا۔ اس لیے میں نے کم عمری میں اس پتے کو اختیار نہیں کیا میں نے ایک فلم میں اداکاری کرنے کی غلطی بھی کی ہے (خوشنما سے کہتے ہیں) بلکہ میں اسے اپنی بے وقوفی کہوں گی (انامان!) فلم ”دیس دا راجہ“ میں شان کے مقابل اداکاری کی تھی (اس پر شان کو داد دینی چاہیے) بیرو تو وہ دوسروں کے لیے ہیں میرے تو وہ بھائی جان ہیں۔“ (اس بیان سے ہی فلم کے متوقع حشر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے)

ملاپ

عشق اور مشق چھپائے نہیں چھپتے اور اپنی موجودگی کا احساس کروا کر ہی رہتے ہیں۔ چاہے راستے میں کتنی ہی پاڑیں یا سرحدیں آئیں ایک ہی لے میں دھڑکتے دھڑکتے قریب آتی جاتے ہیں مقبوضہ کشمیر کے حریت لیڈر یاسین



باتیں کتابوں کی

ساتھ غلامی

کتاب _____ پس عشق
شاعر _____ خالد معین
زیر اہتمام _____ حرف زار
قیمت _____ 150 روپے

شہر نارسال میں خلش بے سبب لے سوئے جنوں
سر میں رکھے، غم عاشق کی تہذیب کرتے، خود سے مکالمہ
کرتے خالد معین کے شعری سفر میں اب تک تین پڑاؤ
آئے ہیں۔

بے موسم وحشت پسینے، شہر بے خواب میں قحط نگاری کا
رنگہ مند ہوتے، اپنے ہونے کو ڈھوٹے ہوئے عشق ہی ان
ہی کی شاعری کا مرکزی دائرہ قرار پایا ہے "ابتدا میں کچھ ان کا
کنا تھا۔"

اک اور سورے عشق کا قصہ چھڑا اور شام کچھ ڈھلنے لگی
گھر کا گھر پر چھائیوں سے بھر گیا اور شام کچھ ڈھلنے لگی
ساؤں شام اور عشق کے بیغ استعارے ان کے یہاں
مسلل شکار کر رہے تھے، "اور سورے عشق کی مکمل
کیفیات کی روداد ابھی تشنہ طلب تھی، ابھی بہت کچھ
دھندلکے اور پر چھائیوں کی اوٹ میں تھا کہ اظہاری
اسلوب اپنی دل کشی اور جاذبیت کی بدولت ان کی نازہ
خرامی کی تیرہ دینے لگا اور بھیڑ میں آوازوں کے بے ہنگم شور
میں ان کی بنچیدہ، متین اور گمبیر آواز جگہ بنانے لگی۔

بہت جلد منظر سے پس منظر تک پہنچی حیرانی نے ان کے
اندراجی جزیرے کی تلاش جگا دی۔ اس تلاش نے باطن
کی بازیافت پہ "اسکیا" داخل میں جو پوری کائنات سانس
لیتی ہے، اس مسافرت میں شعور کی راہداریوں میں فہم کے
چراغ کیا روشن ہوئے، مسافر کا اٹھنا مکمل سے ٹوٹ کر
سفر سے جڑ گیا۔ سفر کی نگارگی نے داخل اور باطن کے کئی
رموز کو کھولے، سفر جو تخلیق کا استعارہ ہے جو تھماتے جتو
کی علامت ہے۔ تھکے ماندے مسافر کو طمانیت حاصل
ہوئی۔

اس کو کس کی تلاش تھی ہم میں
اس میں ہم کس کو ڈھونڈنے لگے
اپنے ہونے کے سوال کے پس منظر میں، عشق کی
کار فرمائی نے شعور کو ایسا اجال دیا کہ کائناتی وحدت اور
زندگی کی وحدت ہم آہنگ ہوئی چلی گئی کہ میان زمین و
آسمان کے پیچیدہ معاملات و اسرار کھلنے لگے، فکری دائرے
کے پھیلاؤ میں وسعت پذیری نے حواس بانگشی کو ایسا
مرتب کیا کہ شاعر اداسیوں سے اطمینان کشید کرنے لگا،
عشق کی گمبیر کیفیات میں ملنے، پھرنے اور کھوجانے کے
تجربے بچ ہوئے چلے گئے، عشق کے فزوں خیر لونے درون
ذات میں کئی جھللاتے چراغ رکھ دیے۔

دم بجزاں بھی کھنچا آتا ہے لمس جانوں
عشق نے ایسا کوئی اسم سکھایا ہوا ہے
عشق کی شعلہ کشی نے "پس عشق" کے شاعر کو جلا کر
خاکستر نہیں کیا بلکہ فزوں تر ہو کر لے کو دھیمہ سچا اور سادہ
کر دیا کہ شہر آستانہ اور متانت ان کے شخصی وجود کا لازمہ
ہی نہیں، شعری اسلوب بن گیا اور ایسے شعر ہونے لگے۔
فروز حسن کی نخوت نے مار رکھا ہے
ہمیں تو عشق کی وحشت نے مار رکھا ہے
کار عشق اور کار دینہ خالد معین کو بھی درپیش رہے ہمیں
بھی مرطے پر شاعر کا مسئلہ نہیں بنے، توازن و ترتیب نے
جارحانہ پن اختیار نہیں کیا، ممانعت سے برعزہ، تھکی ہوئی
بے ترتیب انتشار زدہ دنیا کو اپنے تمام احساسات سے
سمجھنے اور رستے میں موہوئے کہ خیال کی شویہ لہر کب
اٹھی اور کس سولت سے شعر ہو گئی، ان کی شاعری اندر
اور باہر کا منظر نامہ پیش کرنے لگی، تجربے کو ذاتی آج ملنے
سے گداز بڑھ گیا۔

کمال کا سود زباں اور کمال کا کار جہاں
ضرورتوں کی مسافت نے مار رکھا ہے
یہ اک طلسم محبت نہیں تو کیا ہے پھر

جو خوش خیال و حیرت نے مار رکھا ہے
یہاں تک کہ "پس عشق" کی غریب شاعری میں جنوں
خیر عشق صرف اور صرف وصالیہ تجربہ بن کر شاداب کرنے
لگا۔ عشق کا جمالیاتی پیکر سانس لینے لگا کہ جگر کے سارے
غم بھولنے سے لگے۔ خالد معین کے تیسرے مجموعہ کلام
میں ایسے کئی اشعار ہیں۔

چار سو تو ہی منکشف ہے پھر
ہم کہیں اور دیکھتے کیوں ہیں
عشق ہے درمیان تو پھر جانوں
رائیگانی کے واسے کیوں ہیں
مجموعی طور پر خالد معین کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر
ڈالی جائے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آواز کی ایک
شاخص بنانے میں کامیاب ہیں اور ہم عصروں میں نمایاں
قامت رکھتے ہیں۔ خدا انہیں غم عشق میں شاداب کر
رکھے۔

کتاب _____ تمثال (ٹیلی ڈرامے)
مصنف _____ سید علی حسن
قیمت _____ 250 روپے

ہمارے یہاں عموماً "ڈرامے ٹیلی ویژن کے ناظرین کے
لیے تحریر کیے جاتے ہیں۔ جنہیں مخصوص اوقات میں
اسکرین پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کو کتابی شکل میں شائع
کرنے کی روایت کم تر رہی ہے۔

سید علی حسن جو معروف افسانہ نگار ہیں اور ان کے چار
مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ معروف ٹیلی پلے رائٹر
بھی ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے ٹیلی وی وی اور دیگر چینلز
سے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ 2007ء اور 2008ء میں
ٹیلی وی وی ایوارڈ کے لیے بھی ان کے ڈرامے نامزد ہو چکے
ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو کے علاوہ سرائیکی
اور پنجابی میں بھی ڈرامے تحریر کرتے ہیں۔ حال ہی میں ان
کے تحریر کردہ ٹیلی ڈراموں کا مجموعہ "تمثال" کے عنوان
سے شائع ہوا ہے۔ جن میں پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ ان
ڈراموں میں انہوں نے مختلف معاشرتی موضوعات پر قلم
اٹھایا ہے اور خوش سلیقگی سے مکالموں سے مربوط کر
کے کہانی کو ابھارا ہے۔ سادہ اسلوب میں نئی نئی کہانی ناظر
کی بھی توجہ کھینچتی ہے اور پڑھنے میں بھی دلچسپی کا عنصر
برقرار رکھتی ہے۔

متفرقات

ہمیں ہر ماہ شاعری کی کئی کتابیں موصول ہوتی ہیں۔ ہم
کوشش کرتے ہیں کہ علیحدہ علیحدہ تبصرہ کریں مگر صفحات
محدود ہونے کے باعث ان کتابوں کی باری دیر میں آتی
ہے۔ اس دفعہ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ کتابوں کے
بارے میں مختصر "تبصرہ" کریں۔

مجموعہ کلام _____ سپاہ را توں کے چاند میرے
شاعر _____ فاخرہ گل
طالع _____ طاہر سنزارد بازار لاہور
قیمت _____ 120 روپے

فاخرہ گل گجرات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب وہ سات
سندھ پار بس گئی ہیں۔ مگر انہوں نے اردو سے رشتہ
جوڑے رکھا ہے اور شعر و سخن سے وابستہ ہیں۔ ان کی
شاعری میں روان کی دھیمی دھیمی کیفیات ہیں۔ وہ اپنے
جذبوں کو بہت سادگی اور سچائی سے شعر گوئی ہیں۔ یہ نظم
دیکھئے جس کا عنوان ہے

TOO LATE

جاناں! تم نے دیر لگادی

وہ سب کتنے میں

جن میں بولوں کی خاطر

ہم نے اپنی عمر گواہی

اب آئے ہو۔

وقت نے جب ان آنکھوں پر

شام بٹھادی

جاناں! تم نے دیر لگادی

کتاب _____ حرفِ وفا

شاعر _____ ظہور نقی

طالع _____ کتاب ساز بھلی کیشتر

قیمت _____ 150 روپے

ظہور نقی غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا کلام مختلف رسائل
و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ غزل سے وابستگی ان کے
مزاج کا حصہ ہے۔ وہ اسی شعری سانچے میں، اپنے فکرو
خیال کی شمعیں روشن کرتے ہیں اور تنجیدگی سے کارہنر
میں منہمک ہیں۔

”بدلی اور شکستہ دلی کاراز یہ ہے کہ آپ اس سوچ میں لگے رہیں کہ میں خوش ہوں یا نہیں۔“

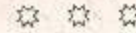
بہت سی ہمیشہ مجھے خط لکھتی ہیں ان میں اولین مسئلہ یہ ہی ہے۔ تعلیم مکمل ہو چکی ہے یا تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شادی کی عمر ہو چکی ہے شادی ہو نہیں سکی، ملحد افسردگی، مایوسی، بے چارے پن کا شکار ہو گئی ہیں۔ بہت سی شادی شدہ بہنوں کا یہی یہی مسئلہ ہے کہ شوہر کی عدم توجہی کم آمدنی یا ساس، منندوں کے جھگڑوں کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہو گئی ہیں۔

ان سب بہنوں کے مسئلے کا حل مصروفیت میں پوشیدہ ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا مصروفیت اختیار کی جائے۔ اس کے لیے اپنے اپنے حالات کے مطابق راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔

اگر آپ کچھ بڑھی لکھی ہیں تو اپنے ارد گرد نظر ڈالیں، کچھ نچے ایسے ضرور ہوں گے جو اسکول جانے اور کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے ہوں گے۔ اگر آپ انہیں چند ابتدائی کتابیں پڑھادیں تو وہ کم از کم اردو پڑھنے کے لائق ہو جائیں گے۔ ابتدائی حساب کتاب بھی کرنے لگیں گے، آپ کی یہ نیکی جہاں ان کی زندگی کی بہت سی مشکلات کو آسان کر دے گی وہاں آپ کے لیے یہ مصروفیت بہت سی پریشانیوں کا ازالہ بھی ثابت ہوگی۔

اگر آپ کم بڑھی لکھی ہیں یا بالکل بڑھی لکھی نہیں ہیں تو بھی قرآن پاک کی تعلیم دے سکتی ہیں اس سے وہ لوگ جو پیسے دے کر قرآن پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس مقدس قلم کو حاصل کر سکیں گے اور آپ کو بھی ثواب ملے گا۔

ذہنی پریشانیاں دور کرنے کا سب سے بہترین حل یہ ہے کہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ یہ گمراہی نہیں رکھیں کہ اللہ جو کچھ کرے گا بہتر کرے گا۔ اور جو کچھ آج تک ہوا ہے اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہوگی۔ یہ یقین آپ کی بہت سی پریشانیاں دور کر دے گا۔



کبھی کبھی انسان کو کچھ فیصلے اپنی مرضی کے خلاف بھی کرنے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کو اپنے آپ کو سمجھانا پڑتا ہے۔ کسی بات یا چیز کی خواہش رکھنا الگ بات ہے اور اسے حاصل کرنا یا کر کے رہنا الگ چیز ہے۔ خواہش رکھنا اچھی بات ہے لیکن ناکامی پر بد دل اور مایوس ہونا خرابی اور نقصان کی بات ہے۔ زندگی میں بہر حال سمجھوتہ تو کرنا ہی پڑتے ہیں۔ خوش دلی کے ساتھ سمجھو، ماکریں، کیونکہ بددلی اور مایوسی سے ذہنی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت پر بھی اثر پڑتا ہے۔

تمینہ، کراچی

آپ کے بہنوئی اگر دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں آپ کی بہن ہی روک سکتی ہیں، نرمی سے پیار سے، محبت کے ذریعے۔ دنیا میں واحد محبت ہے جس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ بڑے سے بڑا کام کرا سکتی ہے اگر ان کے کوئی بزرگ ہوں تو ان کے ذریعے بھی سمجھایا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی سنتے آئے ہیں کہ اولاد مرد کے نصیب سے ہوتی ہے۔ اگر ان کے نصیب میں بیٹا ہے تو آپ کی بہن کے ہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ آپ کی بہن نے زبان یا اپنے رویے سے انہیں یہ احساس تو نہیں دلایا کہ بہنوئی کی عمر زیادہ ہے؟ اگر ایسی صورت ہے تو اس صورت میں مرد وادجہ انا کا مسئلہ بنالیتا ہے کہ چلو ایک اور کر کے دکھا دیتے ہیں۔

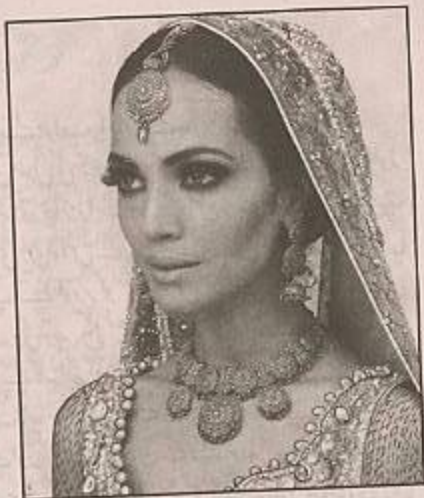
آپ نے لکھا ہے کہ میرا مسئلہ مذاق میں نہ ٹالنے گا اس لیے جواب دیا جا رہا ہے۔ اچھی بہن! ایک بات یاد رکھیں کہ غلط راستے کبھی کسی منزل کی نشان دہی نہیں کرتے۔ ہمیشہ بھٹکتا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی بھی جذبہ کے لیے خلوص نیت کے ساتھ ساتھ جائز راستہ اور صحیح عمل بہت ضروری ہے۔ آپ کی نیت سچی ہے، آپ صدق دل سے غریبوں کی مدد کرنا چاہتی ہیں تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ لاکھوں کروڑوں کی امداد کی جائے۔ جس حد تک آپ کے لیے ممکن ہو آپ اپنے طور پر کوشش کریں اللہ اس تھوڑے سے عمل میں برکت ڈالے گا۔ اگر آپ نے دوسروں کا پیسہ لوٹ کر مدد کی تو یہ صحیح نہیں ہے ناجائز طریقہ ہے اس لیے اس میں برکت نہیں ہوگی، اور اس سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو حدود متعین کی ہیں اگر ان حدود کے اندر رہ کر ہی کام کیا جائے تو کامیابی ممکن ہے۔ جو لوگ ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرتے ہیں اگر آپ غور کریں تو ان کی دولت ان کے اپنے کام بھی بہت کم آتی ہے اور آخرت میں ان کے لیے جو عذاب ہے وہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بتا دیا ہے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہیں اس پر توجہ دیں اور ان خیالات کو ذہن سے نکال دیں۔

ح۔ جنم

اچھی بہن! سب سے پہلے تو آپ ذہن سے یہ خیال نکال دیں کہ آپ کی ذہنی حالت درست نہیں ہے۔ اپنے ابو کا ساتھ دے کر آپ نے غلطی نہیں کی۔ وہ اکیلے اور بیمار تھے آپ کو ان کا خیال کرنا ہی چاہیے تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ دیگر بہن بھائی امی کے ساتھ تھے۔ یہ سلسلہ آپ کے ابو کی وفات تک جاری رہا۔ ابو کی وفات کے بعد آپ نے ہمسایوں کے کام کر کے اپنے اخراجات پورے کیے۔ جبکہ ان کے گھر جانا آپ کی امی کو پسند نہیں تھا۔ اسی بنا پر آپ کے بھائیوں نے بھی تشدد کیا۔ آپ اب بھی بیویوں کی مدد سے سلائی کڑھائی کا کام لے کر آتی ہیں، ایک وقت کا کھانا اپنے پیسوں سے کھاتی ہیں اور دوسرے وقت کا ہمسایوں سے لے کر کھاتی ہیں۔ اب آپ کا آپ کی امی سے جھگڑا بھی رہتا ہے۔ آپ ان سے بد زبانی کرتی ہیں۔

اچھی بہن! والد کا ساتھ دے کر تو آپ نے صحیح کیا۔ لیکن والد کی وفات کے بعد آپ نے جو کچھ کیا وہ صحیح نہیں تھا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اپنی والدہ سے معافی مانگ لیتیں اور حالات درست کرنے کے لیے کوشش کرتیں۔ ”آپ کی یہ ذہنی کیفیت گھر کے ماحول کی وجہ سے ہے۔ کوئی آپ سے بات نہیں کرتا۔ آپ کسی سے بات کرنے کے لیے ترستی ہیں۔ خود پر اعتماد نہیں، کسی سے بات نہیں کرتیں۔ اس کا حل یہ ہی ہے کہ گھر کا ماحول صحیح ہو۔ آپ اپنی امی سے معافی مانگ لیں، وہ اگر کچھ کہیں بھی تو پلیٹ کر جواب نہ دیں۔ گھر کے کاموں میں حصہ لینے کی کوشش کریں۔ چونکہ طویل عرصہ کا باگاڑ ایک دن میں ٹھیک نہیں ہو سکتا اس لیے شروع میں ہو سکتا ہے آپ کو کامیابی نہ ہو، لیکن آہستہ آہستہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ گھر کے حالات بہتر ہونے سے آپ کے ذہن پر خوش گوار اثرات مرتب ہوں گے۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے، آپ سمجھ دار اور باصلاحیت ہیں۔ جو خرابیاں آپ نے لکھی ہیں وہ کوئی بڑی باتیں نہیں ہیں، آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گی۔





زمت الصبور

س : میری جلد کھردری اور بے رونق ہے، رنگ صاف ہے لیکن چہرے میں کوئی کشش نہیں ہے۔ میری عمر 35 سال ہے لیکن چہرے سے 50 سال کی نظر آتی ہوں۔ کتنا ہی رٹزرگروگر منہ دھو لوں، چہرہ میلا میلا لگتا ہے۔

ج : جلد کو خوب صورت اور شفاف رکھنے کے لیے سب سے ضروری یہ ہے کہ آپ ایک صحت مند طرز زندگی اختیار کریں۔ تازہ پھل، سبزیاں اور دودھ دینی کا استعمال جلد کو صحت مند رکھتا ہے۔ شہد کھائیں یا چہرے پر لگائیں کیسا فائدہ مند ہے۔

موسم سرما کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس موسم میں کیونو آتے ہیں۔ کیونکو کے تازہ چھلکے لے کر انہیں پیس لیں۔ ان کو مانسک کی طرح چہرے پر لگائیں۔ اس کو چہرے پر لگانے دیں۔ میں منٹ بعد صاف پانی سے منہ دھوئیں۔ یہ قدرتی مونسچر انڈر آپ کے چہرے کو تروتازہ رکھے گا۔ کیونو میں دھامان سی پایا جاتا ہے جو جلد کے لیے بہتر ہے۔

